Siratun Noman
by
Shibli

سیرۃ النعمان

یعنی

امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ کی سوانح عمری حصہ اوّل و دوم

اِس کتاب کے پہلے حصّے مین امام ابو حنیفہ کا نام و نسب۔ ولادت و سن رشد تعلیم و تربیت شیوخ حدیث۔ درس و افتا بقیہ زندگی اور دربار کے تعلقات وفات عام اخلاق و عادات مجاہدات و فتاوے۔ ذہانت و طباعی۔ اِس قسم کے حالات نہایت تفصیل سے مذکور ہین

دوسرے حصّے مین امام صاحب کے اصول اور مسائل سے جو علم کلام اور فن حدیث سے متعلق ہین تفصیلی بحث ہی اور واقعات و اسانید کے ساتھ ثابت کیا گیا ہی کہ فن حدیث مین اُن کا کیا پایہ تھا۔ فن فقہ پر تفصیلی ریویو ہی جس مین تدوین فقہ کے تاریخی حالات کے ساتھ وہ تمام خصوصیتین تفصیلاً بیان کی گئی ہین جن کی وجہ سے فقہ حنفی کو اور ائمہ کے فقہوں پر ترجیح حاصل ہی خاتمہ مین امام صاحب کے نامور اور ممتاز شاگردون کے مختصر حالات ہین

مؤلفہ مولٰنا محمد شبلی نعمانی

حسب اجازت سید حسن شاہ صاحب مہتمم اتحاد لکھنؤ

سید ظہور الحسن مالک اخبار قومی و نیس دکار خانہ احسن التجارت شاہی کٹرہ نظام الملک نے

قومی پریس دہلی مین چھاپی

سنہ ۱۹۰۴ع

رجسٹری شدہ تعداد (۱۰۰۰) قیمت فی جلد عہ

مختصر فہرست کتب کارخانہ احسن التجارت دہلی

حمائل شریف مترجم - یہ حمائل شریف بہت خوشخط اور بہایت جانفشانی اور محنت سے تیار ہوئی ہے اور نیز اس کی صحت مین بہت ہی جانکاہی کی گئی ہے امید ہے کہ مسلمان اسے دیکھکر خوش ہونگے اس سے بہتر اور ستی حمائل دوسری جگہہ نہین ملے گی قیمت مع جلد نقرئی اعلیٰ درجہ کی فیجلد عہ ربع محصولڈاک فی جلد صہ

سفر نامہ روم و مصر و شام شمس العلماء مولانا شبلی کا سفرنامہ جسمین قسطنطنیہ بیت المقدس قاہرہ وغیرہ کے چشم دید حالات و واقعات ترکون اور عربون کے اخلاق و عادات صحیح ہین یہ کتاب قابل دید ہے عمدہ چکنے ولایتی کاغذ پر چھاپی گئی ہے قیمت فی جلد عہ

خیر الکلام فی احوال اہل عرب قبل الاسلام اس کتاب مین جغرافیہ ملک عرب رسوم حالات و کیفیت اقوام وغیرہ قبل اسلام و حالات مذاہب ہنود و بدھ جین و تناسخ و کنفیوشش یہود و نصاریٰ و زردشت وغیرہ درج ہین۔ یہ تاریخ دیکھنے کے لائق ہے مصنفہ جناب مولوی محمد عبد الحی صاحب وکیل قیمت عام فائدہ کی غرض سے صرف فیجلد - صہ

تاریخ بابل و نینوا - شہر بابل و نینوا کے حیرت ناک واقعات انکی تباہی و بربادی کے عبرتناک حالات درج ہین یہ قدیم تاریخ آجتک نہین چھپی تھی - مترجمہ مولوی محمد علیخان صاحب عرشی - قیمت فیجلد عہ

المامون - مصنفہ مولانا مولوی شبلی نعمانی اس کتاب کے دو حصے ہین پہلے مین تمہید و ترتیب خلافت مامون الرشید کی ولادت تعلیم و تربیت - ولیعہدی تخت نشینی خانہ جنگیان فتوحات ملکی وفات کے حالات - دوسرے حصے مین اُن مراتب کی تفصیل ہے جنسے اُس عہد کے ملکی حالات اور مامون الرشید کے تمام اخلاق و عادات کا اندازہ ہو سکتا ہے نیز اُن کارنامون کی تفصیل ہے جن کی وجہ سے مامون الرشید کا عہد عموماً شاہان اسلام کے عہد سے علمی حیثیت سے ممتاز تسلیم کیا گیا ہے مع رسالہ جزیہ

الہارون - یعنے سوانح عمری هارون الرشید اعظم مع نقشہ سلطنت عباسیہ و دار الخلافہ بغداد . . . عہ

مقدس نازنین - یا پوپ اگنس نہایت عجیب و غریب ہے ... شرر قیمت . . . . . .

ایام عرب یعنے جاہلیت معنی خیز حالات دلچسپ اور عبرت واقعات اس سادی سرگذشت جسپر بعد کو اسلام کی بنیاد ڈالی گئی بڑی دید ہے - قیمت فی جلد . . . ۱ عہ

فردوس بریں - نہایت ہی حیرت انگیز ناول ہے جیتے جی ملاء اعلیٰ کا سفر اور جنت الفردوس کی سیر اور لطف یہ کہ بالکل تاریخی مضامین فرقہ قرامطہ و باطنیہ کی تاریخ وغیرہ قیمت فی جلد - عہ

فلورا فلورنڈا - نہایت دلکش اور دلپذیر اثر کرنیوالا ناول - اسپین کے عیسائیون کا مجنونانہ تعصب اور اسلامی خلافت کی معدلت پروری قیمت . . . ۱

فہرست مضامین کتاب سیرۃ النعمان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمد وستایش کہ بعنوان خوشست ... نعت ہمانگو نہ ہمانسان خوشست
شیفتگان نیم وپیمبر پرست ... سجدہ اگر نیست زمین بوس ہست
تا بخودی پایہ نگہدار باش ... دم ز شریعت زن وہشیار باش
ہرچہ زبیش ہست وزکم۔ بازدان ... سجدہ و تعظیم۔ ز ہم بازدان
در رہ الفت۔ کہ بود پیچ پیچ ... پا چو نہی۔ بر تو نگیریم ہیچ

من کہ درین دائرہ از دیرباز ... پائے زخلوت نہ نہادم فراز
باز برانم۔ کہ درین داورے ... دل برم از خلق بافسونگرے
خواستہ ام طرح دگر ریختن ... شعبدۂ تازہ بر انگیختن
بزم دگر ہست و تماشا دگر ... بادہ دگر آرم و مینا دگر
زمزمۂ تازہ بساز افگنم ... غلغلہ در حلقۂ راز افگنم
بادہ فرستم بحریفان دگر ... از مئی دوشین قدرے تندتر
زخمہ کہ بر تار سخن میزنم ... ہان بنگر تا بچہ فن میزنم
قاعدۂ سحر طرازیست این ... نیک نگہ کن۔ کہ چہ بازیست این
پا چو درین معرکہ افشردہ ام ... پایۂ فن تا بکجا بردہ ام
حرمت این کار نگہداشتن ق ... نامہ بہ لعل و گہر انباشتن
کار من است این حد ہر خام نیست ... این بود آن مے کہ بہر جام نیست
دست اگر سوئے قدح بردہ ام ... جائے عنب لخت دل افشردہ ام
کان معانی ہمہ کاویدہ ام ... گین گہرے چند فراچیدہ ام
غارت بتخانۂ چین کردہ ام ... تا صنمے چند بہ آئین کردہ ام
خاک در میکدہ ہا بیختیم ... کین مے صافی بقدح ریختیم
وایہ اگر از دگران خواستیم ... چارہ نہ زہ بود از آن خواستیم
فن سیر گرچہ بود دلپذیر ... نیست درو خود ز روایت گریز
گرچہ متاع از دگر آوردہ ام ... قطرہ ربودم گہر آوردہ ام

گرچہ مرا شیوۂ فن این نبود   حرف بہ اُردو زدن آئین نبود
پیشتر از گرم طلب بودہ ام   بادیہ پیمائے عرب بودہ ام
بزم چو آن فرہ و آن ساز داشت   ساغر من بادۂ شیراز داشت
لیک چو آن مطرب و ساقی نماند   بوئے ازان میکدہ باقی نماند
بزم بطرز دگر آراستم   خوشتر ازان تیز کہ میخواستم
گرچہ سرو برگ سخن دیگر است   شمع ہمانست۔ لگن دیگر است
بادہ گوارا بہ عزیزان تمام   بادۂ گلگون بہ سفالینہ جام

"ناموران اسلام" جس کا ایک حصہ المامون چھپکر شائع ہو چکا ہے۔ اوّل اوّل جب مجھکو اُس کا خیال پیدا ہوا تو نہایت وسیع بنیاد پر ہوا۔ جس طرح میں نے خلافت و سلطنت کے مختلف خاندانوں سے ہیروز انتخاب کئے۔ ارادہ تھا کہ اسی طرح علوم و فنون کے جدا جدا خاندان قائم کئے جائیں۔ اور جو لوگ اُن خاص خاص فنون میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اُن کو اُس سلسلہ کا ہیرو قرار دیا جائے۔ مگر اتنا بڑا کام تنہا میرے بس کا نہ تھا۔ مجبوراً حیثیت حکومت کی قید لگا کر میں نے اِس وسیع خیال کو بہت کچھ محدود کر دیا۔ بلکہ سلسلۂ حکومت سے بھی بہت سے خاندان چھوڑ دیئے۔ تاہم وہ خیال دل سے نہ گیا کہ فرصت ہو تو اہل کمال کا دربار بھی سجایا جائے کہ السیف والقلم توامان

المامون کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتدبہ حصہ لکھ بھی لیا لیا تھا۔ لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لئے اُس کی تالیف سے ہاتھ اُٹھانا پڑا۔ اسپر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں۔ حالانکہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اِس تصنیف کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ اور یورپ میں چھپ رہی ہیں۔ ابھی تک پوری چھپکر نہیں چکیں۔ اِس زمانۂ انتظار میں بیکار بیٹھنا تو مشکل تھا۔ خیال ہوا کہ کسی اور نامور کی لائف شروع کردں۔ لیکن یہ دیکھکر کہ الفاروق نا تمام ہے۔ طبیعت رُک جاتی تھی۔ اور اِس میدان میں قدم آگے نہ بڑھ سکتا تھا۔ ادھر یہ خلش چین نہ لینے دیتی تھی کہ علمی نامآوروں کے کارنامے دکھانے بھی ضرور ہیں۔ کیونکہ اسلام میں تیغ و قلم کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے۔

آخر یہ خیال غالب آیا اور چند روز کے لئے خاندانِ حکومت کو چھوڑ کر علمی سلسلہ کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ فقہ۔ حدیث۔ ادب۔ منطق۔ فلسفہ۔ ریاضی۔ مختلف خاندان سامنے تھے بعض وجوہ سے اجتہادی مسائل قریباً بارہ سو برس سے تمام ممالک اسلامی میں پھیلے ہوئے

ہیں۔ بڑی بڑی عظیم الشان اسلامی سلطنتوں میں اُن ہی کے مسائل قانون سلطنت تھے۔ اور آج بھی ہیں۔ اسلامی دنیا کا غالب حصہ اُن ہی کے مسائل کا پیرو ہے۔ عربی۔ فارسی۔ ترکی بلکہ یورپ کی زبانوں میں۔ اُنکی متعدد سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ ظلم تھا۔ اگر اُن کی لائف خود اُردو میں نہ لکھی جاتی جو بلحاظ غالب اُن ہی کے پیرووں کی زبان ہے۔

امام ابو حنیفہ کو اسلام میں جو رتبہ حاصل ہے اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جس کثرت سے اُن کی سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ مسلمانوں میں علم رجال کو جو ترقی ہوئی۔ دنیا میں اُس کی کوئی نظیر موجود نہیں۔ تراجم۔ طبقات۔ قرون۔ وفیات۔ اعیان۔ سنین وغیرہ کے نام سے جدا جدا عنوان قائم ہوئے۔ اور ایک ایک عنوان کے ذیل میں اس کثرت سے کتابیں لکھی گئیں۔ کہ اُن کا شمار بھی مشکل ہے۔ لیکن خاص ایسیرت (لائف) کے فن کو چنداں ترقی نہیں ہوئی۔ علماء شعرا۔ قضاۃ۔ حکماء میں سے بہت کم ایسے خوش قسمت ہیں جن کے حالات مستقل تصنیفوں میں لکھے گئے۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے صرف امام ابو حنیفہ ایک شخص ہیں جن کے واقعات زندگی کے ساتھ معمول سے زیادہ اعتنا کیا گیا۔ نہایت کثرت سے اُن کی سوانح عمریاں لکھی گئیں اور اُن نامعدود نے لکھیں جو خود اس قابل تھے کہ اُن کی مستقل سوانح عمریاں لکھی جاتیں۔ اس خصوصیت میں اگر کوئی شخص امام ابو حنیفہ کا ہمسر ہے تو صرف امام شافعی ہیں۔ امام ابو حنیفہ کے حالات میں جس قدر کتابیں لکھی گئیں اُن میں سے جسقدر ہم تحقیق کر سکے حسب ذیل ہیں:۔

نام کتاب[1]	نام مصنف	کیفیت
عقود المرجان	امام احمد بن محمد طحاوی المتوفی سنہ ۳۲۱	امام طحاوی حدیث و فقہ کے مشہور امام اور صرف ایک واسطہ سے امام شافعی کے شاگرد ہیں اُنکی تصنیفات میں سے معانی الآثار چھپ گئی ہے۔
قلائد عقود الدر والعقیان	امام احمد بن محمد طحاوی	یہ عقود المرجان کا خلاصہ ہے۔
الروضۃ العالیۃ المنیفۃ مناقب النعمان	امام محمد بن احمد بن شعیب المتوفی سنہ ۳۵۰ھ	امام محمد بن احمد حدیث میں حاکم کے اُستاد ہیں یہ کتاب بیس جزو میں ہے۔ (الجواہر المضیئۃ ترجمہ محمد بن احمد)
مناقب النعمان	شیخ ابو عبد اللہ الصیمری حسین بن علی	قاضی صیمری بڑے فقیہ اور فن حدیث میں دارقطنی

[1] یہ فہرست زیادہ تر کشف الظنون سے ماخوذ ہے۔ بعض کتابوں کے نام یا مصنفین اور کتب کے زائد حالات اور کتابوں سے لئے گئے ہیں اور وہاں خاص تصریح کر دی گئی ہے۔

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		کے شاگرد تھے۔ مورخ خطیب نے اُن سے روایت کی ہے۔ قاضی ابوالولید باجی نے اُن کو امام الحنفیۃ کہا ہے۔ ۴۳۶ھ میں وفات پائی۔ یہ تصنیف ایک ضخیم کتاب ہے اور امام ابوحنیفہ کی متعلق تصنیفات کا زیادہ تر ماخذ یہی کتاب ہے (الجواہر المضیئۃ فی طبقات الحنفیہ)
مناقب النعمان	ابوالعباس احمد بن الصلب الحمانی المتوفی ۳۰۸ھ	نہایت مفصل کتاب ہے۔ صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ خطیب بغدادی نے ابوالعباس کی تصنیف کی ہے۔ جیسا کہ حنفیوں کی نسبت اُن کی عام عادت ہے۔
شقایق النعمان فی مناقب النعمان	علامہ جار اللہ زمخشری المتوفی ۵۳۸ھ	زمخشری ایک نامور مصنف ہیں۔ تفسیر کشاف اُن کی مشہور کتاب ہے۔
مناقب النعمان	موفق الدین بن احمد المکی الخوارزمی المتوفی ۵۶۸ھ	یہ کتاب چالیس بابوں میں ہے۔ موفق الدین علامہ زمخشری کے شاگرد ہیں۔ فقہ و ادب میں کامل تھے۔ حافظ سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ میں اِن کا ذکر کیا ہے۔
کشف الآثار	امام عبداللہ بن محمد الحارثی	مشہور مصنف ہیں۔ ابن جوزی نے ابوسعید سے روایت کی ہے کہ حدیث میں اُن کا اعتبار نہیں۔ اسیر صاحب جواہر المضیئۃ فرماتے ہیں کہ امام عبداللہ کا رتبہ ابن جوزی و ابوسعید دونوں سے بڑھکر ہے۔
مناقب النعمان	امام ظہیر الدین المرغینانی المتوفی ۵۰۶ھ	مشہور فقیہ ہیں۔ جواہر المضیئۃ کے مصنف نے لکھا ہے کہ قاضی خاں انہیں کے شاگرد تھے۔
مناقب النعمان	امام محمد بن محمد الکردری المتوفی ۸۲۷ھ	گیارہ بابوں میں ہے۔ اس میں امام کے حالات کے ساتھ اُنکے مشہور تلامذہ یعنی قاضی ابویوسف

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		امام محمدؒ عبداللہ بن المبارک - امام زفر داؤد الطائی - وکیع بن الجراح - حفص بن غیاث - یحییٰ بن زکریا - حسن بن زیاد کے حالات بھی جدا جدا بابوں میں لکھے ہیں - یہ کتاب روم میں بہت متداول ہے - سلطان مراد ثانی کے حکم سے محمد بن عمرؒ نے ترکی زبان میں اُس کا ترجمہ کیا -
مناقب النعمان	ابو القاسم بن ابی کاس	عقود الجمان میں اِسی کتاب کے اکثر حوالے ہیں -
کتاب الانتہاء فی مناقب الثلاثة الفقہاء	قاضی بن عبد البر المتوفی سنہ ۴۶۳	امام ابو حنیفہ و امام مالک و امام شافعی کے حالات ہیں - علامہ ابن خلکان نے قاضی ابو یوسف کے ترجمہ میں اس کتاب کا ذکر کیا گیا ہے - قاضی بن عبد البر بہت بڑے محدث اور امام ہیں - اُن کی کتاب الاستیعاب صحابہؓ کے حالات میں ایک مشہور اور مستند کتاب ہے -
مناقب النعمان	ابو القاسم عبد اللہ بن محمد احمد المعروف بابن ابی العوام	
مناقب ابیحنیفہ	علامہ ذہبی	علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ ہیں نے امام ابو حنیفہ کے مناقب ایک جداگانہ رسالہ میں لکھے ہیں - علامہ ذہبی بہت بڑے محدث تھے اِس فن میں اُنکے بعد کوئی اس رتبہ کا نہیں ہوا - میزان الاعتدال وکاشف وعبر - ودول الاسلام وتذکرۃ الحفاظ

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		اُن کی مشہور کتابیں ہیں۔
المواہب الشریفہ		اس کا ترجمہ ہوگیا ہے جس کا نام تحفۃ السلطان فی مناقب النعمان ہے۔
بستان فی مناقب النعمان	شیخ محی الدین عبد القادر القرشی المتوفی ۷۷۵ھ	الجواہر المضیئۃ فی طبقات الحنفیہ انہیں کی تالیف ہے۔ حدیث میں حافظ تقی الدین سبکی کے شاگرد ہیں۔
تبییض الصحیفہ فی مناقب ابی حنیفہ	حافظ جلال الدین سیوطی	مشہور مصنف ہیں۔
عقود الجمان فی مناقب النعمان	محمد بن یوسف بن علی الدمشقی	زیادہ تفصیل آگے آئیگی۔
الخیرات الحسان فی مناقب النعمان	حافظ ابن حجر مکی مصنف صواعق محرقہ	مشہور مصنف ہیں۔
قلائد عقود العقیان		مؤلف کا نام معلوم نہیں۔ دیباچہ سے معلوم ہوا کہ یمن کا کوئی عالم ہے۔
مناقب النعمان	شمس الدین احمد بن محمد السعتواسی	ترکی میں ہے اور نظم ہے۔
مناقب الامام الاعظم	شیخ ابو سعید عتیق	فارسی زبان میں ہے۔
رسالہ فی فضل ابی حنیفہ	بن داؤد الیمانی	
نظم الجمان	شیخ صارم الدین ابراہیم بن محمد بن دقماق المتوفی ۸۰۹ھ	تین جلدوں میں ہے۔ امام ابوحنیفہ قاضی ابویوسف و امام محمد۔ ہر ایک کے حال میں الگ الگ جلد ہے۔
مناقب الامام اعظم	مولانا محمد کامی افندی قاضی بغداد المتوفی ۱۱۳۶ھ	ترکی میں ہے۔
مناقب الامام اعظم	مستقیم زادہ سلیمان سعد الدین آفندی	ضخیم کتاب ہے ۱۱۶۱ھ میں تالیف ہوئی ترکی زبان میں ہے۔

افسوس ہے کہ یہ کتابیں ہمارے ملک میں ناپیدا ہیں۔ میرے پاس عقود الجمان والخیرات الحسان موجود ہیں۔ اور قلاید العقیان کا ایک عتیق نسخہ نظر سے گذرا ہے۔ الخیرات الحسان اگرچہ اس وجہ سے کہ ابن حجر مکی کی طرف منسوب ہے زیادہ مشہور ہے۔ لیکن وہ خود کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ تمامتر عقود الجمان کا خلاصہ ہے اور خود مصنف نے دیباچۂ کتاب میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ قلاید العقیان کے دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیادہ تر قاضی ضیمری کی تصنیف سے ماخوذ ہے۔ عقود الجمان جو نہایت جامع اور مفصل کتاب ہے۔ اور میری تالیف کا عام ماخذ وہی ہے۔ حافظ ابو المحاسن محمد بن یوسف بن علی الدمشقی الصالحی نزیل برقوقیہ کی تصنیف ہے۔ حافظ ابو المحاسن۔ جلال الدین سیوطی کے شاگرد اور فن حدیث میں ممتاز ہیں۔ یہ کتاب جیسا کہ خود مصنف نے خاتمہ میں تصریح کی ہے ربیع الثانی ۹۳۹ھ میں تمام ہوئی۔ دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے امام ابو حنیفہ کے حالات میں بہت سی کتابیں دیکھیں۔ جن میں سے موفق بن احمد خوارزمی کی تصنیف سب سے عمدہ تر اور جامع ہے۔ کتاب کے خاتمہ میں لکھا ہے کہ "میں نے اس بحث میں جسقدر کتابیں دیکھیں اگر ان سب کا لکھنا چاہتا تو یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں طیار ہوتی"۔

امام ابو حنیفہ کے حالات میں مستقل تصنیف تو مجھکو ایک ہی مل سکی۔ لیکن رجال و تاریخ کی مستند کتابیں جن میں امام کا ذکر ہے اکثر میری نظر سے گذریں۔ جن میں تاریخ صغیر بخاری۔ معارف ابن قتیبہ۔ مختصر تاریخ خطیب بغدادی۔ انساب سمعانی۔ تہذیب الاسماء واللغات للنووی تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی۔ دول الاسلام للذہبی۔ عبر فی اخبار من غبر للذہبی۔ تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر عسقلانی۔ خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال للعلامہ صفی الدین الخزرجی خاصۃً قابل ذکر ہیں۔ کیونکہ یہ وہ کتابیں ہیں جن پر آج فن رجال کا مدار ہے۔ اور محدثوں کی تنقید کے لئے زیادہ تر انہیں تصنیفات کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔

میری کتاب کا پہلا حصہ جس میں امام ابو حنیفہ کے عام حالات ہیں۔ انہیں تصنیفات سے ماخوذ ہے۔ لیکن دوسرا حصہ جس میں امام صاحب کی طرز اجتہاد و اصول استنباط سے بحث ہے۔ اس کے لئے یہ تمام دفتر بیکار تھا۔ کیونکہ قدیم زمانہ میں سوانح عمریوں کا یہ ڈھنگ ہی نہ تھا کہ حالات زندگی کے ساتھ اس شخص کی تصنیفات یا مسائل سے بھی بحث کرتے۔ مناظرہ اور مذہبی حمایت کے پیرایہ میں البتہ ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ان سے مسائل اور تصنیفات پر تفصیلی ریویو لکھا جا چکا ہے۔ مثلاً ابن ابی شیبہ نے امام ابو حنیفہ کے مسائل پر جو اعتراضات کئے اور ثابت کیا کہ وہ حدیث کے مخالف ہیں۔ قاسم بن قطلوبغا المتوفی ۸۷۹ھ نے اس کا

مفصل جواب لکھا۔ شمس الائمہ کردری نے مغول کے جواب میں ایک مستقل کتاب لکھی۔ اسی طرح ترجیح مذہب ابی حنیفہ کے نام سے شیخ اکمل الدین محمد بن محمد البابرتی المتوفی ۷۸۶ھ اور شیخ ابو عبداللہ محمد بن یحییٰ الجرجانی المتوفی ۳۹۷ھ نے مستقل کتابیں لکھیں۔ مورخ سبط ابن جوزی نے ایک ضخیم کتاب دو جلدوں میں لکھی جس کا نام الانتصار لامام ائمۃ الامصار ہے۔ اسی مورخ کی ایک اور تصنیف ہے جو تیس بابوں میں ہے اُس میں تفصیلاً امام ابوحنیفہ کے مسائل کی عمدگی ثابت کی ہے۔ صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ "یہ کتاب اپنے باب میں بے نظیر ہے" اسی مضمون پر عمر بن محمد بن سید الموصلی کی ایک تصنیف ہے جس کا نام الانتصار و الترجیح ہے۔ سب سے مفصل کتاب الابانۃ ہے۔ جو قاضی ابو جعفر احمد بن عبد اللہ بن القاسم کی تصنیف ہے۔ اور چھ بابوں پر منقسم ہے۔ پہلے باب میں ثابت کیا ہے کہ امام کا مذہب اصول سلطنت سے بہت مناسبت رکھتا ہے۔ دوسرا باب اس بحث میں ہے کہ اُن کے مسائل حدیث و آثار سے ثابت ہیں چھٹے باب میں اُن مسائل کا ذکر ہے جن پر مخالفوں نے اعتراض کئے ہیں۔ پھر نہایت تفصیل کے ساتھ اُن کے جواب دیئے ہیں۔ جواہر مضیئہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ "میں نے یہ کتاب دیکھی ہے۔ نہایت عمدہ کتاب ہے اور جو دعوےٰ کیا ہے اُس کے ثبوت میں بہت سی مثالیں دی ہیں"۔

بے شبہ اس قسم کی تصنیفات سے بہت بڑی مدد مل سکتی تھی۔ لیکن میں مصنف کشف الظنون کی سی قسمت کہاں سے لاتا کہ اِن نایاب تصنیفات پر دسترس پا سکتا۔ بڑی تلاش سے شمس الائمہ کردری کا رسالہ بہم پہنچا کہ اِس ناداری میں وہ بھی غنیمت ہے۔ بعض بعض باتیں اِس رسالے سے لیں۔ باقی میرا تتبع اور تحقیق ہے۔ جس کے لئے خوش قسمتی سے حدیث و فقہ کا بڑا ذخیرہ میرے پاس مہیا تھا۔

یہ بات بھی لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ امام ابوحنیفہ کی زندگی کی مختلف حیثیتیں ہیں۔ ولادت نشو و نما۔ طریقۂ معاش۔ طرز معاشرت وغیرہ۔ اِس قسم کے حالات تاریخی پیرایہ رکھتے ہیں۔ روایت میں اُن کا ثقہ ہونا نہ ہونا نہ بحث ہے۔ اُن کے مسائل و طریقۂ اجتہاد پر رائے قائم کرنی مجتہد کا کام ہے۔ اس لئے جو کتاب ان تمام حیثیتوں پر شامل ہوگی ضرور ہے کہ مختلف بحثوں میں خود اُس کی حیثیتیں بھی بدلتی جائیں۔ اُس کا طرز تحریر کہیں مورخانہ ہوگا۔ کہیں محدثانہ اور کہیں دونوں پہلوؤں سے الگ مجتہدانہ روش ہوگی۔ اس کتاب میں میں نے ان مختلف حیثیتوں کا لحاظ رکھا ہے۔ جو حالات تاریخ سے متعلق ہیں۔ اُن میں وہ شہادتیں کافی سمجھی ہیں جو عام مورخوں کے نزدیک مسلّم ہیں۔ جو واقعہ محدثانہ پہلو رکھتا ہے اُس میں زیادہ تر تدقیق کی ہے

اور تمام تر اُن اصول سے کام لیا ہے جو محدثین نے اخبار و روایت کے لئے قرار دیئے ہیں۔ عام ناظرین کو شائد اُن بحثوں میں مزا نہ آئے مگر ایسے ضروری حصہ کو میں کیونکر چھوڑ سکتا تھا۔ عام تاریخی واقعات میں گو روایت حدیث کی طرح بال کی کھال نہیں نکالی ہے تاہم کوئی ایسا واقعہ نہیں لکھا۔ جس کی سند موجود نہ ہو۔ ساتھ ہی اس کا التزام کیا ہے کہ ایسی کتاب کا حوالہ نہ دیا جائے۔ جو خود میری نظر سے نہ گذری ہو کیونکہ نقل در نقل ہو کر اکثر روائتیں اپنی حالت پر قائم نہیں رہتی۔ ان احتیاطوں کے ساتھ بھی ممکن۔ بلکہ ضرور ہے کہ مجھ سے مسامحات اور غلطیاں ہوئی ہوں۔ لیکن میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔ وقال اللہ تعالےٰ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا

امام ابوحنیفہؒ کا نام و نسب و ولادت

نعمان اُن کا نام۔ ابوحنیفہ کنیت۔ امام اعظم لقب۔ شجرہ نسب[1] یہ ہے۔ نعمان بن ثابت بن زوطی ابن ماہ۔ یہ امر جیسا کہ خود ناموں کی ترکیب سے ظاہر ہے عموماً مسلم ہے کہ امام صاحب عجمی النسل تھے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ کس نسل سے تھے۔ اور عرب میں کیونکر آئے۔ خطیب مورخ بغدادی نے امام کے پوتے اسمٰعیل کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے کہ "میں اسمٰعیل بن حماد بن نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان ہوں۔ ہم لوگ نسل فارس سے ہیں۔ اور کبھی کسی کی غلامی میں نہیں آئے۔ ہمارے دادا ابوحنیفہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ثابت بچپن میں حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ انہوں نے اُن کے اور اُنکے خاندان کے حق میں دعائے خیر کی تھی۔ ہم کو امید ہے کہ وہ دعا بے اثر نہیں رہی ہے"۔ اسمٰعیل نے امام صاحب کے دادا کا نام نعمان بتایا اور پر دادا کا نام مرزبان حالانکہ عام طرح پر زوطی اور ماہ مشہور ہیں۔ غالباً جب زوطی ایمان لائے۔ تو اُن کا نام نعمان سے بدل دیا گیا۔ اسمٰعیل نے سلسلۂ نسب کے بیان میں زوطی کا وہی اسلامی نام لیا اور حمیت اسلام کا مقتضا بھی یہی تھا۔ زوطی کے باپ کا اصلی نام غالباً کچھ اور ہوگا۔ اور ماہ اور مرزبان لقب ہونگے۔ کیونکہ اسمٰعیل کی روایت سے اسقدر اور بھی ثابت ہے کہ ان کا خاندان فارس کا ایک معزز اور مشہور خاندان تھا۔ فارس میں رئیس شہر کو مرزبان کہتے ہیں۔ اس لئے نہایت قرین قیاس ہے کہ ماہ اور مرزبان لقب ہیں نہ نام۔ حافظ ابوالمحاسن نے قیاس لگایا ہے کہ "ماہ" اور مرزبان ہم معنی الفاظ ہونگے۔ انہوں نے قیاساً کہا کیونکہ وہ فارسی زبان نہیں جانتے تھے۔ لیکن میں یقیناً کہتا ہوں کہ درحقیقت ماہ اور مرزبان کے ایک معنی ہیں ماہ در اصل وہی ماہ ہے جسکے معنے بزرگ اور سردار کے ہیں۔ مشہور مصرع ہے۔ نہ کہ رامنزلت ماند و نہ مہ را۔

[1] مختصر تاریخ بغداد لابن جزلہ۔ ترجمہ امام ابوحنیفہ ۱۲

عربی لہجہ نے مہ کو ماہ کر دیا ہے۔

بعض مورخوں نے زوطی کی نسبت، لکھا ہے کہ کابل سے گرفتار ہو کر آئے۔ اور قبیلہ بنی تیم اللہ کی ایک عورت نے خریدا۔ کچھ دنوں غلامی میں رہے۔ پھر اُس نے آزاد کر دیا۔ اس لئے امام کا خاندان "مولیٰ بنی تیم اللہ کہلاتا ہے"۔ مخالفوں نے جن کو امام کی تنقیص میں مزا آتا ہے۔ اِس روایت کو زیادہ چمکایا ہے۔ حالانکہ اِس قسم کی غلامی ثابت بھی ہو تو کسر شان کی کیا بات ہے۔ زمانہ نے خاندان کسریٰ پر اِس لقب کا داغ لگایا ہے۔ ہمارے علماء حضرت ہاجرہ کو کنیز تسلیم کرتے ہیں۔ (گو توریت سے ثابت نہیں)۔ اسلام کے قریب تر زمانہ میں اکثر وہ لوگ حدیث و روایت کے امام نظر آتے ہیں۔ جن پر اس قسم کی غلامی کا اطلاق ہو چکا تھا۔ امام حسن بصری۔ ابن سیرین طاؤس۔ عطا بن یسار۔ نافع۔ عکرمہ۔ مکحول۔ جو اپنے زمانہ کے مقتدائے عام تھے۔ خود یا اُنکے باپ دادا غلام رہ چکے تھے۔[1]

زوطی کا غلام ہونا بھی ثابت ہو تو کچھ عار نہیں۔ لیکن تاریخی شہادتیں اِس کے خلاف ہیں امام کے نسب میں اور بھی اختلافات ہیں۔ ابو مطیع نے اُن کو نسل عرب سے شمار کیا ہے اور سلسلۂ نسب یوں بتایا ہے۔ نعمان بن ثابت بن زوطی بن یحییٰ بن زید بن اسد بن راشد الانصاری حافظ ابو اسحٰق نے شجرۂ نسب کے متعلق یہ روایت نقل کی ہے نعمان بن ثابت بن کاؤس بن ہرمز بن بہرام۔ زوطی کے مقام سکونت میں بھی اختلاف ہے۔ اور یہ اختلافات ضرور ہونے چاہئیں تھے۔ زوطی اول اول جب عرب میں آئے ہونگے تو برسوں تک اُنکی حالت بیگانگی کی حالت رہی ہوگی۔ لوگوں کو اُن کے حالات کے ساتھ چنداں اعتنا نہ ہوگا اور ہوگا۔ تو زبان کی اجنبیت کی وجہ سے صحیح حالات نہ معلوم ہو سکے ہونگے۔ معاشرت کی ضرورتوں نے زوطی کو مجبور کیا ہوگا کہ وہاں کے رہنے والوں سے دوستانہ تعلق پیدا کریں۔ یہ طریقہ عرب میں عام طور پر جاری تھا اور اِس قسم کے تعلق کو ولاء کہتے تھے جس کا مشتق مولےٰ ہے۔ مولےٰ غلام کو بھی کہتے ہیں۔ اسطرح لفظی مشارکت سے بعضوں نے زوطی کو غلام سمجھ لیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ خیال روایت کی شکل پکڑ کر کسی قدر عام ہو گیا جس کی وجہ سے اسمٰعیل کو دفع دخل کرنا پڑا کہ "واللہ ہمارا خاندان کبھی کسی کی غلامی میں نہیں آیا"۔ اسمٰعیل نہایت ثقہ اور معزز شخص تھے۔ اس وجہ سے دقیقہ سنج مورخوں نے اِس بحث میں اُن کی روایت پر اعتماد کیا ہے۔ کہ صاحب البیت ادریٰ بما فیہا قاضی صیمری نے جو بڑے پایہ کے مصنف ہیں صاف تصریح کی ہے کہ زوطی۔ بنی تیم اللہ کے حلیف یعنے ہم قسم تھے۔[1] اس روایت کا (جس میں زوطی کی غلامی کا ذکر ہے) یہ حصہ بھی غلط ہے کہ وہ کابل سے

---

[1] دیکھو قلائد عقود العقیان باب اول۔ علامہ نووی نے تہذیب الاسماء واللغات کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ مولےٰ کا لفظ زیادہ تر حلیف ہی کے معنے میں مستعمل ہوتا ہے

گرفتار ہوکر آئے۔ زوطی کے باپ دادا کے نام فارسی زبان کے ہیں۔ خود امام ابو حنیفہ کی نسبت ثابت ہے کہ وہ خاندانی حیثیت سے فارسی زبان جانتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ کابل کی زبان فارسی نہ تھی۔ زوطی کی نسبت ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ خاص کس شہر کے رہنے والے تھے۔ مورخوں نے مختلف شہروں کے نام لئے ہیں جن میں سے کسی کی نسبت ترجیح کا دعوےٰ نہیں کیا جا سکتا۔ یقینی طور پر جو ثابت ہے وہ صرف اسقدر ہے کہ اقلیم فارس اور فارسی نسل سے تھے۔ یہ ممالک اُس زمانہ میں اسلامی اثر سے معمور تھے اور اکثر بڑے بڑے خاندان اسلام قبول کرتے جاتے تھے۔ غالباً زوطی اسی زمانہ میں اسلام لائے۔ اور جوش شوق۔ یا خاندان والوں کی ناراضی سے جس کا باعث تبدیل مذہب تھا۔ عرب کا رُخ کیا۔ یہ جناب امیر علیہ السلام کی خلافت کا زمانہ تھا۔ اور شہر کوفہ دار الخلافہ ہونے کا شرف رکھتا تھا۔ اس تعلق سے زوطی نے کوفہ کو پسند کیا۔ اور وہیں سکونت اختیار کی۔ کبھی کبھی جناب امیر کے دربار میں حاضر ہوتے اور خلوص عقیدت کے آداب بجالاتے ایک بار نوروز کے دن کہ پارسیوں کی عید کا دن ہے فالودہ نذر کے طور پر بھیجا۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ "نوروزنا کل یوم" یعنے "ہمارے ہاں ہر روز نوروز ہے"۔ ثابت امام ابو حنیفہ کے پدر بزرگوار کوفہ ہی میں پیدا ہوئے۔ زوطی نے نیک فال لڑکے کو حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر کیا۔ آپ نے بزرگانہ شفقت فرمائی اور اُنکے اور اُن کی اولاد کے حق میں دعائے خیر کی۔

ثابت کے حالات زندگی بالکل نامعلوم ہیں۔ قراین سے اسقدر پتہ چلتا ہے کہ تجارت کے ذریعہ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ چالیس برس کی عمر ہوئی تو خدا نے فرزند عطا کیا جس کا نام والدین نے نعمان رکھا لیکن زمانہ نے آگے چلکر امام اعظم کے لقب سے پکارا۔

اُس وقت عبد الملک بن مروان جو دولت مروانیہ کا دوسرا تاجدار شمار کیا جاتا ہے۔ مسند آرائے خلافت تھا۔ یہ مبارک عہد تھا۔ کہ رسول اللہ کے جمال مبارک سے جن لوگوں کی آنکھیں روشن ہوئی تھیں۔ اُن میں چند بزرگ موجود تھے جن میں سے بعض امام ابو حنیفہ کے آغاز شباب تک زندہ رہے۔ انس بن مالک نے جو رسول اللہ کے خادم خاص تھے سنہ ۹۳ھ میں وفات پائی سہل بن سعد نے سنہ ۹۱ھ میں انتقال کیا۔ اور ابو الطفیل عامر بن واثلہ تو سو ہجری تک زندہ رہے لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امام ابو حنیفہ نے کسی سے بھی کوئی حدیث روایت کی۔ اسپر لوگوں کو نہایت تعجب ہے اور مورخوں نے اسکے مختلف اسباب خیال کئے ہیں۔ بعضوں کی رائے ہے کہ امام ابو حنیفہ نے اُس وقت تک کسی قسم کی تعلیم نہیں حاصل کی تھی۔ اُنکے باپ دادا تجارت کرتے تھے۔ اس لئے اُن کی نشو و نما بھی ایک عام تاجر کی حیثیت سے ہوئی۔ بڑے ہونے پر امام شعبی کی ہدایت سے علم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُس وقت موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا یعنے صحابہ

میں سے کوئی باقی نہیں رہا تھا۔

لیکن میرے نزدیک اُسکی ایک اور وجہ ہے۔ محدثین میں باہم اختلاف ہے کہ حدیث سیکھنے کے لئے کم از کم کیا عمر مشروط ہے۔ اس امر میں ارباب کوفہ سب سے زیادہ احتیاط کرتے تھے۔ یعنی بیس برس سے کم عمر کا شخص حدیث کی درسگاہ میں شامل نہیں ہوسکتا تھا[1]۔ اُن کے نزدیک چونکہ حدیثیں بالمعنی روایت کی گئی ہیں۔ اس لئے ضرور ہے کہ طالب علم پوری عمر کو پہنچ چکا ہو۔ ورنہ مطالب کے سمجھنے اور اُس کے ادا کرنے میں غلطی کا احتمال ہے۔ غالباً یہی قید تھی جس نے امام ابوحنیفہ کو ایسے بڑے شرف سے محروم رکھا اور سچ پوچھو تو یہ قید مصلحت سے خالی بھی نہیں جن لوگوں نے دس بارہ برس کے سن میں صحابہؓ سے حدیثیں سنیں اُنکی روائتیں اس لحاظ سے تو نہایت قابل اعتماد ہیں کہ رسول اللہؐ تک صرف ایک واسطہ ہے۔ لیکن اسبات کا قوی احتمال موجود ہے کہ کم سنی کی وجہ سے مضمون حدیث کی تمام خصوصیتیں خیال میں نہ آئی ہوں جس کی وجہ سے ادائے مطلب میں عظیم الشان غلطیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

بہرنوع وجہ کچھ ہو واقعہ یہ ہے کہ امامؒ ابوحنیفہؒ نے کسی صحابیؓ سے حدیث نہیں سُنی۔ تاہم یہ شرف اُن کی قسمت میں تھا کہ جن آنکھوں نے پیغمبرؐ کا جمال دیکھا تھا اُنکے دیدار سے عقیدت کی آنکھیں روشن کیں، یہ واقعہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ لیکن چونکہ اُسی سے تابعیت کا رتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اِس لئے یہ مسئلہ مذہبی پیرایہ میں آگیا ہے۔ اور اُسپر بڑی بڑی بحثیں قائم ہوگئی ہیں بے شبہ امامؒ ابوحنیفہ کو اس شرف پر ناز تھا اور بجا تھا کہ اُنھوں نے حضرت انس صحابیؓ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ غیر قومیں اِن باتوں کو معمولی امر خیال کرینگی۔ لیکن اِن واقعات سے اُس محبت اور جوش عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو مسلمانوں کو رسول اللہؐ۔ اور اُن کے تعلق کی وجہ سے صحابہؓ کے ساتھ تھا۔ سچ ہے۔ **شعر**

فی الجملہ نسبتی بتو کافی بود مرا … بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است

تابعیت کی بحث

ہمارے زمانہ کے بعض مصنفوں نے امام کی تابعیت سے انکار کیا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں پہلے بھی لوگوں کو شبہ ہوا تھا لیکن محدثین نے جن کو اِس قسم کی بحثوں کے طے کرنے کا سب سے زیادہ حق حاصل ہے۔ امام کے موافق فیصلہ کیا۔ حافظ **ابن حجر عسقلانی** سے کہ فن حدیث کے ایک عنصر ہیں، فتوے لیا گیا تھا۔ اُنھوں نے یہ جواب لکھا "امامؒ ابوحنیفہ کے زمانہ میں کئی صحابیؓ موجود تھے۔ اِس لئے کہ امام ۸۰؁ھ میں بمقام کوفہ پیدا ہوئے اور اُس وقت وہاں صحابہؓ میں سے عبداللہ بن ابی اوفی موجود تھے کیونکہ وہ ۸۷؁ھ میں یا اس کے بعد مرے اور ابن سعد نے

حافظ ابن حجر کا فیصلہ

[1] مقدمہ ابن اصلاح۔ مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۵۸-۱۲

روایت کی ہے جس کی سند میں کچھ نقصان نہیں۔ کہ امام ابوحنیفہ نے انس رضی اللہ عنہ بن مالک کو دیکھا تھا۔ اِن دو صحابہ رضی اللہ عنہم کے سوا اور اصحاب بھی مختلف شہروں میں موجود تھے۔ بعض لوگوں نے اُن حدیثوں کو جمع کیا ہے، جو امام نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیں۔ لیکن اِن حدیثوں کی سندیں ضعف سے خالی نہیں۔ اور صحیح یہی ہے کہ امام اُنکے ہمزماں تھے۔ اور بعض صحابہ کو دیکھا تھا جیسا کہ ابن سعد نے روایت کی ہے۔ پس اس لحاظ سے امام ابوحنیفہ تابعین کے طبقہ میں ہیں۔ اور یہ امر اور اماموں کی نسبت جو اُن کے ہمعصر تھے مثلاً اوزاعی۔ شام میں۔ حماد بن سلمہ بصرہ میں۔ ثوری۔ کوفہ میں۔ مالک۔ مدینہ شریف میں۔ لیث۔ مصر میں۔ ثابت نہیں ہوا واللہ اعلم"[1]

ابن سعد کی جس روایت کا حافظ ابن حجر نے حوالہ دیا ہے۔ وہ صرف ایک واسطہ یعنی سیف ابن جابر کے ذریعہ سے امام ابوحنیفہ تک پہنچتی ہے۔ یعنی ابن سعد نے سیف بن جابر سے سُنا اور سیف نے خود امام ابوحنیفہ سے۔ ابن سعد وہ شخص ہیں جن کی نسبت علامہ نودی نے تہذیب الاسماء میں لکھا ہے کہ "اگرچہ اُن کا شیخ واقدی ثقہ نہیں مگر وہ خود نہایت ثقہ ہیں"۔ سیف بن جابر۔ بصرہ کے قاضی اور صحیح الروایت تھے۔ اِس لحاظ سے یہ روایت اسقدر صحیح اور مستند ہے کہ قوی سے قوی حدیث بھی اُس سے زیادہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ اسی بنا پر تمام بڑے بڑے محدثین مثلاً خطیب بغدادی۔ علامہ سمعانی مصنف کتاب الانساب۔ علامہ نودی شارح صحیح مسلم۔ علامہ ذہبی۔ حافظ حجر عسقلانی۔ زین الدین عراقی۔ سخاوی۔ ابو المحاسن دمشقی نے جن پر اب حدیث و روایت کا مدار ہے قطعاً فیصلہ کر دیا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے حضرت انس کو دیکھا تھا۔[2]

ابن خلکان نے بھی خطیب بغدادی کا یہ قول نقل کیا ہے لیکن چونکہ مورخ مذکور نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ کو کسی صحابی سے ملاقات اور روایت حاصل نہیں ہوئی"۔ لوگوں کو دھوکا ہوا کہ ابن خلکان تابعیت کے منکر ہیں۔ حالانکہ ابن خلکان کو ملاقات اور روایت سے انکار ہے نہ روایت سے۔ لیکن اگر ابن خلکان کی عبارت کا وہی مطلب ہو جو بعض ظاہربینوں نے قرار دیا ہے تاہم کون کہہ سکتا ہے کہ ایسے بڑے بڑے محدثین کے مقابلہ میں انکی شہادت کچھ بھی اعتبار کے قابل ہوگی۔ اصول روایت میں یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے کہ اگر کسی واقعہ کے اثبات و نفی میں برابر درجہ کی شہادتیں موجود ہوں تو اثبات کا اعتبار ہوگا۔ یہاں نفی کی شہادت ثبوت

---

[1] اس فتوے کو حافظ ابو المحاسن نے عقود الجمان میں بعبارتہا نقل کیا ہے۔ اور ہمنے اُسی کا لفظی ترجمہ کیا ہے۔
[2] تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی میں یہ تصریح موجود ہے۔ [3] مختصر تاریخ خطیب بغداد و کتاب الانساب و تہذیب الاسماء واللغات و تذکرۃ الحفاظ و عبر فی اخبار من غبر للذہبی و تہذیب التہذیب میں امام ابوحنیفہ کا ترجمہ دیکھو۔

سے مقابلہ میں بالکل کم رتبہ ہے۔

بعض حنفیوں نے رؤیت سے بڑھ کر روایت کا بھی دعوے کیا ہے۔ اور تعجب ہے کہ علامہ عینی شارح ہدایہ بھی اس غلطی کے حامی ہیں۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ دعوے ہرگز پایہ ثبوت کو نہیں نہیں پہنچتا۔ حافظ ابوالمحاسن نے عقود الجمان میں ان تمام حدیثوں کو مع سند نقل کیا ہے جن کی نسبت یہ خیال ہے کہ امام نے صحابہ سے سُنیں تھیں۔ پھر اصول حدیث سے اُنکی جانچ کی ہے۔ اور ثابت کر دیا ہے کہ ہرگز ثابت نہیں۔ محدثانہ بحثیں تو وقت طلب ہیں۔ صاف بات ہے۔ کہ امام نے صحابہ سے ایک بھی روایت کی ہوتی تو سب سے پہلے امام کے تلامذۂ خاص اُس کو شہرت دیتے۔ لیکن قاضی ابو یوسف امام محمدؒ حافظ عبد الرزاق بن ہمام عبد اللہ بن المبارک ابونعیم فضل بن دکین۔ مکی بن ابراہیم ابو عاصم النبیل وغیرہ سے کہ امام کے مشہور اور با اخلاص شاگرد تھے اور سچ پوچھئے تو زیادہ تر انہیں لوگوں نے اُنکے نام آوری کے سکے بٹھائے ہیں۔ ایک حرف بھی اس واقعہ کے متعلق منقول نہیں۔

صحابہ سے روایت نہیں کی

امام کی کنیت جو نام سے زیادہ مشہور ہے حقیقی کنیت نہیں ہے۔ امام کی کسی اولاد کا نام حنیفہ نہ تھا۔ یہ کنیت وصفی معنی کے اعتبار سے ہے۔ یعنی ابو الملۃ الحنیفۃ قرآن میں خدا نے مسلمانوں سے خطاب کرکے کہا ہے **واتبعوا ملۃ ابراہیم حنیفا** امام ابوحنیفہ نے اسی نسبت سے اپنی کنیت ابوحنیفہ اختیار کی۔

سن رشد۔ تعلیم و تربیت شیوخ۔ و اساتذہ

امام کے بچپن کا زمانہ نہایت پُر آشوب زمانہ تھا۔ حجاج بن یوسف خلیفہ عبد الملک کی طرف سے عراق کا گورنر تھا اور ہر طرف ایک قیامت برپا تھی۔ چونکہ مذہبی گروہ کی مخالفت کی وجہ سے عرب و عراق میں ابتک مروانی حکومت کے پانوں نہیں جمے تھے۔ حجاج کی سفاکیاں زیادہ تر اُنہیں لوگوں پر مبذول تھیں جو ائمہ مذہب۔ اور علم و فضل کی حیثیت سے مقتدائے عام تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے نہایت سچ کہا کہ اگر اور پیغمبروں کی اُمتیں سب ملکر اپنے اپنے زمانہ کے بدکاروں کو پیش کریں اور ہم صرف حجاج کو مقابلہ میں لائیں تو واللہ ہمارا پلہ بھاری رہیگا" عبد الملک نے ۸۶ھ میں وفات کی اور اُس کا بیٹا ولید تخت نشین ہوا۔ ولید کے زمانہ میں اگرچہ فتوحات نے نہایت ترقی کی۔ اسپین و ہند دو بڑی مملکتیں اسلام کے قبضہ میں آگئیں۔ خوارزم وسمرقند سے گذر کر کابل و فرغانہ پر عَلَم اسلام نصب ہوا۔ مغرب کی طرف جزائر منورقہ ومیورقہ فتح ہوئے۔ لیکن اسلام کی روحانی برکتوں کا نشان نہ تھا۔ ملکی عہدہ داروں میں سے جو لوگ

جسقدر زیادہ معزز اور با اختیار تھے اُسی قدر ظالم اور سفاک تھے۔ اُسی زمانہ کی نسبت حضرت عمرؓ بن عبد العزیز فرمایا کرتے تھے کہ "ولید۔ شام میں۔ حجاج۔ عراق میں۔ عثمان۔ حجاز میں۔ قرہ۔ مصر میں واللہ تمام دنیا ظلم سے بھر گئی"۔ اس عالمگیر آشوب میں بھی اگرچہ درس و تعلیم کا سلسلہ بند نہیں ہوا تھا۔ جابجا حدیث و روایت کی درسگاہیں موجود تھیں اور فقہا و محدثین باوجود بے اطمینانی کے درس و تدریس میں مشغول تھے۔ تاہم اسلام کی حوصلہ مندیوں اور جوش کے لحاظ سے جسقدر تھا۔ نہایت کم تھا۔

ملک کی خوش قسمتی تھی کہ حجاج ۹۵ھ میں مر گیا۔ ولید نے بھی ۹۶ھ میں وفات پائی۔ ولید کے بعد سلیمان بن عبد الملک نے مسند خلافت کو زینت دی جس کی نسبت مورخین کا بیان ہے کہ خلفائے بنو امیہ میں سب سے افضل تھا۔ سلیمانؒ نے اسلامی دنیا پر سب سے بڑا یہ احسان کیا کہ عمرؒ بن عبد العزیز کو مشیر سلطنت بنایا اور مرتے دم تحریری وصیت کی۔ کہ "میرے بعد عمرؒ بن عبد العزیز تخت نشین ہوں"۔ سلیمان نے ۹۹ھ میں وفات پائی اور وصیت کے موافق عمر بن عبد العزیز مسند خلافت پر بیٹھے۔ انکی خلافت نے دفعۃً حکومت مروانی کا رنگ بدل دیا۔ اور تمام ملک میں عدل و انصاف۔ علم و عمل۔ خیر و برکت کی جان تازہ ڈال دی۔ ایک مدت سے حضرت علیؓ پر خطبوں میں جو لعن پڑھا جاتا تھا یک لخت موقوف کر دیا۔ شہزادگان بنو امیہ کے ہاتھوں سے جاگیریں چھین لیں۔ جہاں جہاں ظالم عمال تھے یک قلم معزول کر دیئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ علوم مذہبی کو وہ رونق دی کہ گھر گھر یہی چرچے پھیل گئے۔ امام زہری کو حکم دیا کہ حدیثوں کو یکجا کریں۔ یہ مجموعہ طیار ہوا تو ممالک اسلامیہ میں اُس کی نقلیں بھجوائیں۔

غرض حجاج و ولید کے عہد تک تو امام ابوحنیفہ کو تحصیل علم کی طرف متوجہ ہونے کی نہ رغبت ہو سکتی تھی نہ کافی موقع مل سکتا تھا۔ تجارت باپ دادا کی میراث تھی۔ اس لئے خزبافی کا کارخانہ قائم کیا۔ اور حسن تدبیر سے اُسکو بہت کچھ ترقی دی۔ لیکن سلیمان کی عہد خلافت میں جب درس تدریس کے چرچے زیادہ عام ہوئے تو اُنکے دل میں بھی ایک تحریک پیدا ہوئی۔ حسن اتفاق یہ کہ ان ہی دنوں میں ایک اتفاقی واقعہ پیش آیا جس سے اُنکے ارادہ کو اور بھی استحکام ہوا۔

تحصیل علم کی تحریک

ایک دن بازار جا رہے تھے۔ امام شعبیؒ جو کوفہ کے مشہور امام تھے ان کا مکان راہ میں تھا۔ سامنے سے نکلے تو اُنہوں نے یہ سمجھکر کہ کوئی نوجوان طالب علم ہے۔ پاس بلا لیا اور پوچھا کہ "کہاں جا رہے ہو"؟ اُنہوں نے ایک سوداگر کا نام لیا۔ امام شعبی نے کہا "میرا مطلب یہ نہ تھا۔ تم پڑھتے کس سے ہو"؟ اُنہوں نے افسوس کے ساتھ جواب دیا کہ "کسی سے بھی نہیں"۔ شعبی نے کہا کہ "مجھکو تم میں قابلیت کے جوہر نظر آتے ہیں۔ تم علما کی صحبت میں بیٹھا کرو"[1]۔ اس نصیحت نے اُنکے دل میں گھر کر لیا۔ اور

[1] عقود الجمان۔ باب سادس۔ ۱۲

نہایت اہتمام سے تحصیل علم پر متوجہ ہوئے۔ اُس وقت تک جس چیز کا نام تھا۔ وہ ادب۔ انساب۔ ایام العرب۔ فقہ۔ حدیث۔ کلام۔ تھا کلام۔ اگرچہ آجکل کا علم کلام نہ تھا۔ کیونکہ اس عہد تک مسائل اسلام پر فلسفہ کا پرتو نہیں پڑا تھا۔ تاہم ان علوم میں۔ دقت نظر۔ بلندی خیال۔ زور طبع کے لئے اُس سے وسیع تر میدان نہ تھا۔ اسلام جب تک عرب کی آبادی میں محدود رہا اُسکے مسائل نہایت سادہ اور صاف رہے۔ لیکن فارس اور مصر و شام پہنچکر ان میں رنگ آمیزیاں شروع ہو گئیں۔ ان ملکوں میں اگرچہ حکمت و فلسفہ کا وہ زور باقی نہ رہا تھا۔ تاہم فلسفہ کے بگڑے بگڑائے مسائل عام لوگوں میں پھیلے ہوئے تھے اور طبیعتیں عموماً باریک بینی اور احتمال آفرینی کی عادی تھیں۔ قرآن پاک میں خدا کی ذات و صفات۔ مبدا و معاد وغیرہ کے متعلق جو کچھ مذکور ہے عرب نے اُسکو اجمالی نگاہ سے دیکھا اور خلوص اعتقاد کے لئے وہی کافی تھا۔ بخلاف اس کے فارس و شام میں نہایت دقیق بحثیں پیدا ہو گئیں جو وسعت تمدن اور ترقی خیالات کے لحاظ سے ضرور پیدا ہونی چاہئیں تھیں۔ تنزیہ و تشبیہ۔ صفات کی عینیت و غیریت۔ حدوث و قدم غرض اِس قسم کے بہت سے مضامین نکل آئے جن کو بحث و تدقیق کی وسعت نے مستقل فن بنا دیا رفتہ رفتہ عام اعتقادی مسائل میں بھی موشگافیاں شروع ہو گئیں۔ اور رایوں کے اختلافات سے مختلف فرقے بنتے گئے جو قدری۔ مرجی۔ معتزلی۔ جہمی۔ خارجی۔ رافضی۔ کہلائے یہ فتنہ یہاں تک بڑھا کہ اہلِ حق جو ابتک اِن جھگڑوں سے الگ تھے اُن کو بھی مخالفت کی ضرورت سے اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اِس طرح علم کلام پیدا ہو گیا۔ جس کو تدوین و ترتیب کی وسعت نے اِس رتبہ کو پہنچایا کہ بڑے بڑے ائمہ مذہب (مثلاً امام اشعری و ابو المنصور ماتریدی) کا مایۂ ناز ٹھہرا۔

علم کلام زمانۂ مابعد میں اگرچہ مدون و مرتب ہو کر اکتسابی علوم میں داخل ہو گیا۔ لیکن اس وقت تک اس کی تحصیل کے لئے صرف قدرتی ذہانت اور مذہبی معلومات درکار تھیں۔ قدرت نے امام ابو حنیفہ میں یہ تمام باتیں جمع کر دی تھیں۔ رگوں میں ایرانی خون۔ اور طبیعت میں زور اور جدت تھی۔ مذہبی روایتیں اور مسائل۔ کوفہ میں ایسے عام تھے کہ ایک معمولی شخص بھی تعلیم یافتہ لوگوں میں اُٹھ بیٹھکر حاصل کر سکتا تھا۔ امام ابو حنیفہ نے اِس فن میں وہ کمال پیدا کیا کہ بڑے بڑے اساتذۂ فن بحث کرنے میں ان سے جی چراتے تھے۔ تجارت کی ضرورت سے اکثر بصرہ۔ جانا ہوتا تھا۔ جو ان تمام فرقوں کا دنگل اور خاصکر خارجیوں کا مرکز تھا۔ اباضیہ۔ صفریہ حشویہ۔ وغیرہ سے اکثر بحثیں کیں اور ہمیشہ غالب رہے۔ اگرچہ آخر ان جھگڑوں کو چھوڑ کر وہ علم فقہ پر مائل ہوئے اور تمام عمر اس کی نذر کر دی۔ لیکن اخیر تک یہ مذاق طبیعت سے نہ گیا۔ خارجیوں وغیرہ سے اُنکے مناظرے۔ علم کلام کی جان ہیں۔ اُنکی علمی زندگی کے تذکرہ میں ہم بعض

واقعات کی تفصیل بیان کرینگے۔

شروع شروع میں تو امام صاحبؒ اِس فن کے بہت دلدادہ رہے لیکن جسقدر عمر اور تجربہ بڑہتا جاتا تھا اِنکی طبیعت رکتی جاتی تھی۔ خود ان کا بیان ہے کہ آغاز عمر میں میں اس علم کو سب سے افضل جانتا تھا کیونکہ مجھکو یقین تھا کہ عقیدہ و مذہب کی بنیاد انہیں باتوں پر ہے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ صحابۂ کبار اِن بحثوں سے ہمیشہ الگ رہے۔ حالانکہ ان باتوں پر کی حقیقت اُن سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا۔ ان کی توجہ جسقدر تھی فقہی مسائل پر تھی۔ اور یہی مسائل وہ دوسروں کو تعلیم دیتے تھے۔ ساتھ ہی خیال گذرا کہ جو لوگ علم کلام میں مصروف ہیں اِن کا طرز عمل کیا ہے۔ اِس خیال سے اور بھی بیدلی پیدا ہوئی۔ کیونکہ اِن لوگوں میں وہ اخلاقی پاکیزگی اور روحانی اوصاف نہ تھے۔ جو اگلے بزرگوں کا تمغاے امتیاز تھا۔ انہی زمانہ میں ایک دن ایک عورت نے آکر یہ پوچھا کہ ایک شخص اپنی بیوی کو سنت کے طریقے پر طلاق دینی چاہتا ہے۔ کیونکر دے۔ خود تو بتا نہ سکا عورت کو ہدایت کی کہ امام حماد۔ جن کا حلقۂ درس یہاں سے قریب ہے جاکر پوچھے۔ یہ بھی کہدیا کہ حماد جو کچھ بتائیں مجھسے کہتی جانا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئی اور کہا کہ حماد نے یہ جواب دیا۔ مجھکو سخت عبرت ہوئی۔ اُسی وقت اُٹھ کھڑا ہوا اور حماد کے حلقۂ درس میں جا بیٹھا"۔

امام کی ابتدائی تحصیل کے متعلق ایک اور روایت ہے جس کا سلسلہ سند خطیب نے امام تک پہنچایا ہے یعنے امام صاحب کا بیان ہے کہ جب مینے تحصیل علم پر توجہ کی تو بہت سے علوم پیش نظر تھے اور میں متردد تھا کہ کس کو اختیار کروں۔ سب سے پہلے کلام کا خیال آیا۔ ساتھ ہی دل میں گذرا کہ وہ کندن و کاہ بر آوردن ہے۔ ایک مدت کی محنت اور دردسری کے بعد کمال بھی پیدا کیا تو علانیہ اظہار نہیں کرسکتے کہ لوگ الحاد کی تہمت نہ لگائیں۔ ادب او قرأت کا بجز اس کے کہ مکتب پڑھائیں۔ اور کچھ فائدہ نہ تھا۔ شعر و شاعری میں ہجو اور جھوٹی مدح کے سوا اور کیا دھرا تھا۔ حدیث کے لئے اوّلا ایک مدت درکار تھی۔ اسکے علاوہ۔ کم سنوں سے واسطہ پڑتا اور ہر وقت یہ فکر رہتی کہ لوگ جرح و تعدیل کا نشانہ نہ بنائیں۔ آخر فقہ پر نظر پڑی اور دنیا و دین کی حاجتیں اُس سے وابستہ نظر آئیں"۔ لیکن یہ روایت محض غلط ہے۔ تمام معتمد روایتیں اِسکے خلاف ہیں۔ جو ریمارک امام صاحب کی طرف منسوب کئے ہیں۔ ایسے جاہلانہ ریمارک ہیں کہ ایک معمولی آدمی کی طرف بھی نسبت نہیں کی جاسکتی۔ اِس روایت کو صحیح مانیں تو ماننا پڑیگا۔ کہ حدیث و کلام کی طرف امام ابوحنیفہ نے توجہ ہی نہیں کی۔ حالانکہ ان فنوں میں امام ابوحنیفہ کا جو پایہ ہے اُس سے کون انکار کرسکتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ تحصیل علوم کے بعد امام نے خیال کیا ہو کہ کس فن کو

ؔ عقود الجمان باب سادس ۱۲

اپنا خاص فن بنائیں۔ اور چونکہ عام خلائق کی ضرورتیں۔ فقہ سے وابستہ دیکھیں۔ اُسی کو ترجیح دی یہی بات طرزِ بیان کی رنگ آمیزیوں سے اِس حد تک پہنچ گئی۔ جس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ روایت بااین ہمہ کہ قیدِ کتابت میں آچکی تھی عقود الجمان کے مصنف نے نقل کی تو بہت سے اختلافات پیدا ہوگئے۔ ابن جزلہ نے تاریخ بغداد کا جو اختصار کیا ہے ہماری پیشِ نظر ہے اُس میں اِس روایت کا جہاں ذکر ہے ہر علم کے متعلق جو ریمارک ہیں۔ دوسروں کی طرف منسوب ہیں۔ امام ابو حنیفہ کی نسبت صرف اُنکا تسلیم کرنا بیان کیا ہے۔

حماد کوفہ کے مشہور امامؒ اور اُستادِ وقت تھے۔ حضرت انسؓ سے جو رسول اللہ کے خادم خاص تھے حدیث سُنی تھی اور بڑے بڑے تابعینؒ کی فیض صحبت سے مستفید ہوئے تھے۔ اُس وقت کوفہ میں اُنہیں کا مدرسہ مرجع امام سمجھا جاتا تھا۔ مسعر، شعبہ نے جو ائمہ فن خیال کئے گئے ہیں۔ اُنہیں کے حلقۂ درس میں تعلیم پائی تھی۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود (صحابیؓ) سے فقہ کا جو سلسلہ چلا آتا تھا اُسکا مدار انہیں پر رہ گیا تھا۔ اِن باتوں کے ساتھ زمانہ نے بھی اُن کا ساتھ دیا تھا۔ یعنی دولتمند اور فارغ البال تھے۔ اور اس وجہ سے نہایت اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہتے تھے۔ اِن وجوہ سے امام ابو حنیفہؒ نے علم فقہ پڑھنا چاہا۔ تو اُستادی کے لئے اُنہی کو انتخاب کیا۔ اُس وقت درس کا طریقہ یہ تھا کہ اُستاد کبھی خاص مسئلہ پر زبانی گفتگو کرتا تھا جس کو شاگرد یاد کرلیتے اور کبھی لکھ بھی لیا کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہؒ پہلے دن بائیں صف میں بیٹھے کیونکہ مبتدیوں کے لئے یہ امتیاز عموماً قائم رکھا جاتا تھا۔ لیکن چند روز کے بعد جب حمّاد کو تجربہ ہوگیا کہ تمام حلقہ میں ایک شخص بھی حافظہ اور ذہانت میں اُن کا ہمسر نہیں ہے تو حکم دیدیا کہ ابو حنیفہ سب سے آگے بیٹھا کریں[1]۔

امامؒ نے اگرچہ اسی زمانہ میں حدیث پڑھنی شروع کردی تھی جسکا تفصیلی بیان آگے آتا ہے تاہم حمّادؒ کے حلقۂ درس میں ہمیشہ حاضر ہوتے تھے۔ خود اُن کا بیان ہے کہ "میں دس برس تک حمّاد کے حلقۂ درس میں حاضر ہوتا رہا پھر خیال ہوا کہ اب خود درس و تعلیم کا سلسلہ قائم کروں۔ لیکن اُستاد کا ادب مانع ہوتا تھا۔ اتفاق سے اُنہیں دنوں حمّاد کا ایک رشتہ دار جو بصرہ میں رہا کرتا تھا مر گیا۔ حماد کے سوا اور کوئی اُس کا وارث نہ تھا۔ اِس ضرورت سے اُن کو بصرہ جانا پڑا۔ چونکہ مجھکو اپنا جانشین کر گئے تھے۔ تلامذہ اور ارباب حاجت نے میری طرف رجوع کیا۔ بہت سے ایسے مسئلے پیش آئے جن میں اُستاد سے میں نے کوئی روایت نہیں سُنی تھی۔ اس لئے اپنے اجتہاد سے جواب دیئے اور احتیاط کے لئے ایک یادداشت لکھتا گیا۔ دو مہینے کے بعد حمّاد بصرہ سے واپس

[1] عقود الجمان باب سادس ۱۲

آئے۔ میں نے وہ یادداشت پیش کی۔ کل ساٹھ مسئلے تھے۔ ان میں سے بیس میں غلطیاں نکالیں باقی کی نسبت فرمایا کہ تمہارے جواب صحیح ہیں۔ میں نے عہد کیا کہ حماد جب تک زندہ ہیں۔ اُنکی شاگردی کا تعلق کبھی نہ چھوڑونگا۔

حماد نے ۱۲۰ھ میں انتقال کیا۔ امام ابو حنیفہؒ نے اگرچہ حمادؒ کے سوا اور بزرگوں کی خدمت میں بھی فقہ کی تحصیل کی لیکن کچھ شبہ نہیں کہ اِس فن خاص میں وہ حماد ہی کے تربیت یافتہ ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ حد سے زیادہ اُنکی تعظیم کرتے تھے۔

حدیث کی تحصیل

حماد کے زمانہ میں ہی امامؒ نے حدیث کی طرف توجہ کی کیونکہ مسائل فقہ کی مجتہدانہ تحقیق جو امام کو مطلوب تھی حدیث کی تکمیل کے بغیر ممکن نہ تھی۔

اُس وقت تمام ممالک اسلامیہ میں بڑے زور شور سے حدیث کا درس جاری تھا اور ہر جگہ سند اور روایت کے دفتر کھلے ہوئے تھے۔ صحابہؓ جنکی تعداد کم از کم دس ہزار ہے تمام ممالک میں پہنچ گئے تھے۔ اور انکی وجہ سے اسناد و روایت کا ایک عظیم الشان سلسلہ قائم ہوگیا تھا۔ لوگ جہاں کسی صحابیؓ کا نام سن پاتے تھے ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے تھے کہ چلکر رسول اللہ کے حالات سنیں۔ یا مسائل شرعیہ کی تحقیق کریں۔ اِس طرح تابعین کا۔ جو صحابہؓ کے شاگرد کہلاتے تھے۔ بیشمار گروہ پیدا ہو گیا تھا۔ جن کے سلسلے تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گئے تھے۔ جن شہروں میں صحابہؓ یا تابعینؒ کا زیادہ مجمع تھا۔ وہ دار العلم کے لقب سے ممتاز تھے۔ اِن میں مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، یمن۔ بصرہ۔ کوفہ کو خاص امتیاز تھا۔ کیونکہ اسلامی آثار کے لحاظ سے کوئی شہر اِن مقامات کا ہمسر نہ تھا۔

کوفہ

کوفہ جو امام ابو حنیفہؒ کا مولد و مسکن تھا اسلام کی وسعت و تمدن کا گویا دیباچہ تھا۔ اہل عرب کی روز افزوں ترقی کے لئے عرب کی مختصر آبادی کافی نہ تھی۔ اِس ضرورت سے حضرت عمرؓ نے سعدؓ بن ابی وقاص کو جو اُس وقت حکومت کسریٰ کا خاتمہ کر کے۔ مداین میں اقامت گزین تھے خط لکھا کہ مسلمانوں کے لئے ایک شہر بساؤ جو اُن کا دار الہجرۃ اور قرار گاہ ہو۔ سعدؓ نے کوفہ کی زمین پسند کی۔ ۱۷ھ میں اُس کی بنیاد کا پتھر رکھا گیا۔ اور معمولی سادہ وضع کی عمارتیں طیار ہوئیں اُسی وقت عرب کے قبائل ہر طرف سے آ آ کر آباد ہونے شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ تھوڑے دنوں میں وہ عرب کا ایک خطہ بن گیا حضرت عمرؓ نے یمن کے بارہ ہزار اور نزار کے آٹھ ہزار آدمیوں کے لئے جو وہاں جا کر آباد ہوئے تھے۔ روزینے مقرر کر دیئے چند روز میں جمعیت کے لحاظ سے کوفہ نے وہ حالت پیدا کی کہ جناب فاروقؓ کوفہ کو "رمح اللہ" "کنز الایمان" "جمجمۃ العرب" یعنی خدا کا علم۔ ایمان کا خزانہ۔ عرب کا سر۔ فرمایا کرتے تھے۔ اور خط لکھتے تو اِس عنوان سے لکھتے تھے

"اِلی راس الاسلام" اے راس العرب[1] حضرت علیؓ نے اِس شہر کو دار الخلافہ قرار دیا۔ صحابہؓ میں سے ایک ہزار پچاس شخص جن میں چوبیس وہ بزرگ تھے جو غزوہ بدر میں رسول اللہؐ کے ہمرکاب رہے تھے وہاں گئے اور بہتوں نے سکونت اختیار کرلی۔ ان بزرگوں کی بدولت ہر جگہ حدیث و روایت کے چرچے پھیل گئے تھے۔ اور کوفہ کا ایک ایک گھر۔ حدیث و روایت کا درسگاہ بن گیا تھا[1]۔

بصرہ بھی اُسی مقدس خلیفہؓ کے حکم سے آباد ہوا تھا اور وسعتِ علم اور اشاعت حدیث کے اعتبار سے کوفہ کا ہمسر تھا۔ یہ دونوں شہر بلکہ مکۂ معظمہ اور مدینہ منورہ کی طرح علوم اسلامی کے دار العلم خیال کئے جاتے تھے۔ علامۂ ذہبی نے اسلام کے دوسرے تیسرے دور میں جن لوگوں کو حاملینِ حدیث کا لقب دیا ہے۔ اور اُنکے مستقل ترجمے لکھے ہیں۔ اُن میں اکثر۔ مثلاً مشروق بن الاجدع عبیدہ بن عمرؓ۔ اسود بن یزید۔ الاعمر النخعی۔ ذر بن جبیش۔ ربیع بن خثیم۔ عبد الرحمٰن بن ابی لیلےٰ۔ ابو عبد الرحمٰن السلمی۔ شریح بن الحرث۔ شریح بن ہانی۔ ابو وائل شقیق بن سلمہ۔ قیس بن ابی حازم محمد بن سیرین۔ حسن بصری۔ شعبۃ بن حجاج۔ قتادۃ بن دعامہ۔ انہیں دونوں شہروں کے رہنے والے یا خوشباش تھے۔ سفیان بن عیینہ جو ائمہ حدیث میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اکثر فرماتے تھے کہ "مناسک کے لئے مکہ۔ قرءت کے لئے مدینہ اور حلال و حرام یعنی فقہ کے لئے کوفہ ہے[2]"۔

فقہ میں امام نے زیادہ تر حمادؒ کا حلقۂ درس کافی سمجھا تھا۔ لیکن حدیث میں یہ قناعت ممکن نہ تھی۔ یہاں صرف ذہانت اور اجتہاد سے کام نہیں چل سکتا تھا بلکہ درایت کے ساتھ روایت کی بھی ضرورت تھی۔ حدیثیں اُس وقت تک نہایت پریشان اور غیر مرتب تھیں یہانتک کہ بڑے بڑے اساتذہ۔ دو چار حدیثوں سے زیادہ یاد نہیں رکھتے تھے۔ یہ تعداد ضروری مسائل کے لئے بھی کافی نہ تھی۔ اس کے علاوہ طرق روایت میں اسقدر اختلافات پیدا ہوگئے تھے کہ ایک حدیث جب تک متعدد طریقوں سے نہ معلوم ہو اُسکے مفہوم اور تعبیر کا ٹھیک ٹھیک متعین ادنا دشوار تھا۔ امام ابو حنیفہؒ کو حمادؒ کی صحبت اور پختگی عمر نے اِن ضرورتوں سے اچھی طرح واقف کردیا تھا۔ اس لئے نہایت سعی اور اہتمام سے حدیثوں کے بہم پہنچانے پر توجہ کی۔ تقریباً کوفہ میں کوئی ایسا محدث باقی نہ تھا جس کے سامنے امام صاحب نے زانوی شاگردی طے نہ کیا ہو اور حدیثیں نہ سیکھی ہوں۔ ابو المحاسن شافعی نے جہاں اُنکے شیوخ حدیث[3] کے نام گنائے ہیں ترانوے ۹۳ شخصوں کی نسبت لکھا ہے کہ کوفہ کے رہنے والے یا نزیل تھے۔ تہذیب التہذیب و تہذیب الاسماء۔ و تذکرۃ الحفاظ وغیرہ میں۔ اگرچہ (جیسا کہ ان کتابوں کا عام طریقہ ہے) امام

---

[1] یہ تمام تفصیل۔ فتوح البلدان بلاذری ذکر آبادی کوفہ و معجم البلدان۔ و فتح المغیث صفحہ ۳۸۲ میں مذکور ہے۔ ۱۲
[2] تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی۔ ۱۲ [3] معجم البلدان ذکر کوفہ ۱۲

کے شیوخ کا استقصا نہیں کیا ہے۔ تاہم انہیں کتابوں کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے ایک گروہ کثیر سے روایت کی جن میں ۲۹ شخص خاص کوفہ کے رہنے والے تھے۔ اور اُن میں اکثر تابعی تھے۔ شیوخ کوفہ میں خاصکر۔ امام شعبی۔ سلمۃ بن کہیل محارب بن دثار۔ ابو اسحٰق سبیعی۔ عون بن عبد اللہ۔ سماک بن حرب۔ عمرو بن مرۃ۔ منصور بن المعتمر اعمش۔ ابراہیم بن محمد۔ عدی بن ثابت الانصاری۔ عطا بن السائب۔ موسیٰ بن ابی عائشہ علقمۃ بن مرثد۔ بہت بڑے محدث۔ اور سندو روایت کے مرجع عام تھے۔ سفیان ثوری اور امام حنبل وغیرہ کا سلسلۂ سند اکثر انہیں بزرگوں تک پہنچتا ہے۔

امام شعبی۔ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے اوّل اوّل امام ابو حنیفہ کو تحصیل علم کی رغبت دلائی تھی۔ بہت سے صحابہؓ سے حدیثیں روایت کی تھیں۔ مشہور ہے کہ پانسو صحابہؓ کو دیکھا تھا۔ عراق۔ عرب۔ شام میں چار شخص جو اُستاد کامل تسلیم کئے جاتے تھے ان میں ایک یہ تھے۔ امام زہری کہا کرتے تھے کہ "عالم صرف چار ہیں۔ مدینہ۔ میں ابن المسیب۔ بصرہ۔ میں حسن۔ شام میں مکحول۔ کوفہ میں شعبی" حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے انکو ایکبار مغازی کا درس دیتے دیکھا تو فرمایا کہ "واللہ یہ شخص اِس فن کو مجھ سے اچھا جانتا ہے"۔ ایک مدت تک منصب قضا پر مامور رہے خلفا اور اعیان دولت۔ اِن کا نہایت احترام کرتے تھے۔ سنہ ۱۰۴ ہجری یا سنہ ۱۰۶ ہجری میں وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ

سلمۃ بن کہیل۔ مشہور محدث اور تابعی تھے۔ جندب بن عبد اللہ بن ابی اوفی۔ ابو الطفیل اور انکے علاوہ اور بہت سے صحابہؓ سے حدیثیں روایت کیں۔ ابن سعد نے انکو کثیر الحدیث لکھا ہے۔ سفیان بن عیینہ (امام شافعی کے اُستاد) فرماتے تھے کہ سلمۃ بن کہیل ایک رکن ہیں۔ ارکان میں سے ابن مہدی کا قول تھا کہ کوفہ میں چار شخص سب سے زیادہ صحیح الروایۃ تھے۔ منصور۔ سلمۃ۔ عمرو بن مرۃ۔ ابو حصین۔

ابو اسحٰق سبیعی۔ کبار تابعین سے تھے۔ عبد اللہ بن عباسؓ۔ عبد اللہ بن عمرؓ۔ ابن زبیرؓ۔ نعمان بن بشیرؓ۔ زید بن ارقمؓ۔ اور بہت سے صحابہؓ سے جنکے نام علامہ نودی نے تہذیب الاسماء میں بہ تفصیل لکھے ہیں۔ حدیثیں سنیں تھیں۔ عجلی نے کہا ہے کہ ۳۸ صحابہؓ سے انکو بالمشافہ روایت ہے۔ علی بن المدینی۔ جو امام بخاری کے اُستاد تھے اُنکا قول ہے کہ ابو اسحٰق کے شیوخ حدیث میں سے شمار کئے تو کم و بیش تین سو ٹھیرے۔ حافظ ابن حجر نے تہذیب میں انکا مفصل تذکرہ لکھا ہے۔

سماک بن حرب۔ بہت بڑے تابعی اور محدث تھے۔ امام سفیان ثوری نے کہا ہے کہ سماک نے

۱؎ امام کے شیوخ حدیث کا حال۔ زیادہ تر تہذیب التہذیب معارف ابن قتیبہ۔ و مرآۃ الجنان یافعی سے لکھا ہے۔

کبھی حدیث میں غلطی نہیں کی۔ خود سماک کا بیان ہے کہ میں اسی صحابہؓ سے ملا ہوں۔

محارب بن دثار نے عبد اللہ بن عمرؓ اور جابرؓ وغیرہ سے روایت کی۔ امام سفیان ثوری کہا کرتے تھے کہ "میں نے کسی زاہد کو نہیں دیکھا جس کو محارب پر ترجیح دوں" علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ محارب عموماً حجت ہیں امام احمدؒ بن معینؒ۔ ابوزرعہ۔ دارقطنی۔ ابو حاتم۔ یعقوبؒ بن سفیان۔ نسائی نے ان کو ثقہ تسلیم کیا ہے۔ کوفہ میں منصب قضا پر مامور تھے سنہ ۱۱۶ھ میں وفات پائی۔ رح

عون بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود حضرت ابو ہریرہؓ اور عبد اللہؓ بن عمرؓ سے حدیثیں روایت کیں۔ نہایت ثقہ اور پرہیزگار تھے۔

ہشام بن عروہ معزز و مشہور تابعی تھے۔ بہت سے صحابہؓ سے حدیثیں روایت کیں۔ بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً سفیان ثوری۔ امام مالک۔ سفیان بن عیینہ انکے شاگرد تھے۔ ابو جعفر منصور کے زمانہ میں کوفہ گئے۔ اہل کوفہ نے اسی زمانہ میں ان سے حدیثیں روایت کیں۔ خلیفہ منصور ان کا نہایت احترام کرتا تھا۔ ایکبار لاکھ درہم انکو عطا کئے۔ انکے جنازہ کی نماز بھی منصور نے ہی پڑھائی تھی۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ ابو حاتم نے انکو امام حدیث کہا ہے

سلیمان بن مہران معروف باعمش۔ کوفہ کے مشہور امام تھے۔ صحابہؓ میں سے انسؓ بن مالک سے ملے تھے۔ اور عبد اللہؓ بن ابی اوفیٰ سے حدیث سنی تھی۔ سفیان ثوری و شعبہ انکے شاگرد ہیں۔ امام کی تحصیل حدیث کا دوسرا مدرسہ بصرہ تھا جو امام حسنؒ بصری و شعبہ و قتادہ کے فیض تعلیم سے مالا مال تھا۔ تعجب ہے کہ حسن بصری باوجودیکہ سنہ ۱۱۰ ہجری تک زندہ رہے۔ لیکن امام ابو حنیفہ کا انکے درس سے مستفید ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ قتادہ کی شاگردی کا ذکر۔ عام محدثین نے کیا ہے۔ اور عقود الجمان کے مختلف مقامات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ امام نے شعبہ سے حدیث روایت کی اور انہوں نے اپنے سامنے ہی فتوے و روایت کی اجازت بھی دیدی تھی۔

قتادہ بہت بڑے محدث اور مشہور تابعی تھے حضرت انسؓ بن مالک و عبد اللہ بن سرجسؓ و ابو الطفیل اور دیگر صحابہؓ سے حدیثیں روایت کیں۔ حضرت انسؓ کے دو شاگرد جو نہایت نامور ہیں ان میں ایک یہ ہیں۔ اس خصوصیت میں انکو نہایت شہرت تھی کہ حدیث کو بعینہٖ ادا کرتے تھے۔ یعنی الفاظ و معنی میں بالکل فرق نہیں ہوتا تھا۔ انکی قوت حافظہ کی ایک عجیب مثال لکھی ہے۔ عمروؒ بن عبد اللہ کا بیان ہے کہ یہ مدینہ میں سعید بن المسیب سے فقہ و حدیث پڑھتے تھے۔ ایک دن انہوں نے فرمایا کہ "تم ہر روز بہت سی باتیں پوچھتے ہو تم کو ان میں سے کچھ یاد بھی ہیں"؟ انہوں نے کہا "ایک ایک حرف محفوظ ہے"۔ چنانچہ جس قدر ان سے سُنا تھا بقید تاریخ اور روں کے بیان کرنا شروع کیا۔ وہ نہایت متعجب ہوئے اور کہا "خدا نے دنیا میں تم جیسے لوگ

بھی پیدا کئے ہیں"۔ اِسی بنا پر لوگ انکو احفظ الناس کہا کرتے تھے۔ امام حنبلؒ نے انکے تفقہ۔ وواقفیت اختلافات وتفسیر دانی کی نہایت مدح کی ہے اور کہا ہے کہ "کوئی شخص اِن باتوں میں اِن کی برابر ہو تو ہو مگر اِن سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا"۔

حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ان کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ جس سے انکی عظمت وشان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

شعبہ بھی بڑے مرتبہ کے محدث تھے۔ دو ہزار حدیثیں یاد تھیں۔ سفیان ثوریؒ نے فن حدیث میں انکو امیر المومنین مانا ہے۔ عراق میں یہ پہلے شخص ہیں جس نے جرح و تعدیل کے مراتب مقرر کئے۔ امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے کہ شعبہ نہ ہوتے تو عراق میں حدیث کا رواج نہ ہوتا۔ سنہ ۱۶۰ھ میں انتقال کیا۔ سفیانؒ ثوری کو انکے مرنے کی خبر پہنچی تو کہا "آج فن حدیث بھی مر گیا"۔ شعبہ کو امام ابوحنیفہ کے ساتھ ایک خاص ربط تھا۔ غیبت میں اکثر انکی دیانت اور خوبی فہم کی تعریف کرتے۔ ایک بار اِنکا ذکر آیا تو کہا کہ "جس طرح میں جانتا ہوں کہ آفتاب روشن ہے اِسی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علم اور ابوحنیفہ ہم نشین ہیں"۔ یحییٰ بن معینؒ سے جو امام بخاری کے اُستاد تھے کسی نے پوچھا کہ آپ ابوحنیفہ کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں فرمایا "اسقدر کافی ہے کہ شعبہ نے اُنکو حدیث وروایت کی اجازت دی اور شعبہ آخر شعبہ ہی ہیں"[1]۔ بصرہ کے اور شیوخ جن سے امام ابوحنیفہ نے حدیثیں روایت کیں اُن میں عبدالکریم بن امیۃ اور عاصم بن سلیمان الاحول زیادہ ممتاز ہیں۔

حرمین کا سفر

امام ابوحنیفہ کو اگرچہ اِن درسگاہوں سے حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا۔ تاہم تکمیل کی سند حاصل کرنے کے لئے حرمین جانا ضرور تھا۔ جو علوم مذہبی کے اصلی مرکز تھے۔ تاریخوں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ امام کا پہلا سفر کس سنہ میں واقع ہوا تاہم ظن غالب ہے کہ جب اُنہوں نے حرمین کا سفر کیا تو تحصیل کا آغاز تھا۔ مورخ ابن خلکان نے لکھا ہے[2] کہ وکیع نے خود امام ابوحنیفہ سے روایت کی ہے کہ حج میں ایک حجام نے جس سے مینے بال منڈوائے تھے کئی باتوں میں مجھپر گرفت کی۔ میں نے اُجرت پوچھی تو بولا "مناسک حج کا بھی نہیں جاتے"۔ میں چپ ہو کر اصلاح بنوانے لگا۔ اُس نے پھر ٹوکا کہ "حج میں چپ نہیں رہنا چاہئے۔ تکبیر کہے جاؤ"۔ حجامت سے فارغ ہو کر میں گھر چلا تو اُس نے کہا "پہلے دو رکعت نماز پڑھ لو پھر کہیں جانا"۔ مینے متعجب ہو کر پوچھا کہ مسائل تُنے کہاں سیکھے۔ بولا "عطا بن ابی رباح کا فیض ہے"۔ اِس واقعہ سے زیادہ تر یہی قیاس ہو سکتا ہے کہ ابتدائی زمانہ تھا۔

---

[1] عقود الجمان۔ باب دہم ۱۲۔ [2] تاریخ ابن خلکان ترجمہ عطاء بن ابی رباح ۱۲

جس زمانہ میں امام ابو حنیفہ مکہ معظمہ پہنچے درس و تدریس کا نہایت زور تھا۔ متعدد استاذہ کی جو فن حدیث میں کمال رکھتے تھے اور اکثر صحابہ کی خدمت سے مستفید ہوئے تھے الگ الگ درسگاہ قائم تھے۔ اِن میں عطاء بن ابی رباح کا حلقہ سب سے زیادہ وسیع اور مستند تھا۔ عطاء مشہور تابعی تھے اکثر صحابہ کی خدمت میں رہے تھے اور اُن کی فیض صحبت سے اجتہاد کا رتبہ حاصل کیا تھا۔

عطا بن ابی رباح حضرت عبداللہ بن عباسؓ۔ ابن عمرؓ۔ ابن زبیرؓ۔ اسامہ بن زیدؓ۔ جابر بن عبداللہؓ۔ زید بن ارقمؓ۔ عبداللہ بن سائبؓ۔ عقیلؓ۔ رافعؓ۔ ابو دردا ؓ۔ ابو ہریرہؓ۔ اور بہت سے صحابہ سے حدیثیں سُنی تھیں۔ خود اُنکا بیان ہے کہ "میں دو سو بزرگوں سے ملا ہوں جن کو رسول اللہ کی صحبت کا شرف حاصل تھا"۔ مجتہدین صحابہ اُنکے علم و فضل کے معترف تھے۔ عبداللہ بن عمرؓ جو حضرت فاروقؓ کے فرزند رشید اور صاحب افتاء تھے اکثر فرماتے تھے کہ "عطا بن رباح کے ہوتے لوگ میرے پاس کیوں آتے ہیں"۔ حج کے زمانہ میں ہمیشہ سلطنت کی طرف سے ایک منادی مقرر ہوتا تھا کہ "عطاء کے سوا کوئی شخص فتوے دینے کا مجاز نہیں ہے"۔[1] بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً امام اوزاعی۔ زہری۔ عمرو بن دینار انہیں کے حلقہ درس سے نکلکر اُستاد کہلائے۔

امام ابو حنیفہ استفادہ کی غرض سے اُنکی خدمت میں حاضر ہوئے تو اُنہوں نے احتیاط کے لحاظ سے عقیدہ پوچھا۔ امام نے کہا "میں اسلاف کو بُرا نہیں کہتا۔ گنہگار کو کافر نہیں سمجھتا۔ قضا و قدر کا قائل ہوں"۔ عطا نے اجازت دی کہ حلقہ درس میں شریک ہوا کریں۔[2] روز بروز اُنکی ذہانت و طباعی کے جوہر ظاہر ہوتے گئے اور اُسکے ساتھ اُستاد کی نظر میں اُنکا وقار بھی بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جب یہ حلقہ درس میں جاتے تو عطا۔ اوروں کو ہٹا کر اُنکو اپنے پہلو میں جگہ دیتے۔[3] عطا سنہ ۱۱۵ تک زندہ رہے۔ اس مدت میں امام ابو حنیفہ کو جب مکہ جانے کا اتفاق ہوتا تو اُن کی خدمت میں اکثر حاضر رہتے اور مستفید ہوتے۔

عکرمہ عطاء کے سوا مکہ معظمہ کے اور محدثین جنسے امام نے حدیث کی سند لی اُنمیں سے عکرمہ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ عکرمہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے غلام اور شاگرد تھے۔ اُنہوں نے نہایت توجہ اور کوشش سے اِنکی تعلیم و تربیت کی تھی۔ یہاں تک کہ اپنی زندگی ہی میں اجتہاد و فتوے کا مجاز کر دیا تھا۔ عکرمہ نے اور بہت سے صحابہ مثلاً حضرت علیؓ۔ ابو ہریرہؓ۔ عبداللہ بن عمرؓ۔ عقبہ بن عمرؓ۔ صفوانؓ۔ جابرؓ۔ ابو قتادہؓ سے حدیثیں سیکھی تھیں اور فقہی مسائل تحقیق کئے تھے۔ کم و بیش ستر مشہور تابعین حدیث و تفسیر میں اِنکے شاگرد ہیں۔ امام شعبیؒ کہا کرتے تھے کہ قرآن کا جاننے والا عکرمہ سے بڑھ کر نہیں رہا۔ سعید بن جبیر کہ تابعین کے سردار تھے اُن سے ایک شخص نے

[1] ابن خلکان۔ اور کتب رجال میں اُنکے حالات پڑھو۔ ۱۲ [2] مختصر تاریخ بغداد لابن جزلہ ۱۲ [3] عقود الجمان۔ باب۔ حاشیہ ۱۲

پوچھا کہ دنیا میں آپ سے بڑھ کر بھی کوئی عالم ہے۔ فرمایا ہاں عکرمہؒ۔

فقہائے سبعہ
اسی زمانہ میں یعنی سنہ ۱۰۲ھ سب سے پہلے امام ابو حنیفہ نے مدینہ کا قصد کیا کہ حدیث کا مخزن اور نبوت کا اخیر اقرار گاہ تھا۔ صحابہؓ کے بعد تابعین کے گروہ میں سے سات شخص علم فقہ و حدیث کے مرجع بن گئے تھے اور مسائل شرعیہ میں عموماً ان کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ ان لوگوں نے بڑے بڑے صحابہؓ کے دامن فیض میں تعلیم پائی تھی اور یہ مرتبہ حاصل کیا تھا۔ کہ تمام ممالک اسلامی میں واسطہ در واسطہ انکے درس کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ لوگ ہمعصر تھے اور ایک مشترک مجلس افتا کے ذریعہ سے تمام شرعی مسائل کا فیصلہ کرتے تھے۔ مدینہ کی فقہ جس کی تدوین امام مالکؒ نے کی اسکی بنیاد زیادہ تر انہیں کے فتووں پر ہے۔ امام ابو حنیفہؒ جب مدینہ میں پہنچے تو ان بزرگوں میں سے صرف دو شخص زندہ تھے۔ سلیمانؒ۔ و سالمؒ بن عبد اللہ۔ حضرت میمونہ کے جو رسول اللہ کی ازواج مطہراتؓ میں تھیں غلام تھے اور فقہائے سبعہ میں فضل و کمال کے لحاظ سے اُن کا دوسرا نمبر تھا۔ سالمؒ حضرت فاروقؓ کے پوتے تھے اور اپنے والد بزرگوار سے تعلیم پائی تھی۔ امام ابو حنیفہؒ دونوں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے حدیثیںؒ روایت کیں۔

امام ابو حنیفہؒ کی طالب العلمی کی مسافت اگرچہ مدینہ تک محدود ہے۔ تاہم تعلم کا سلسلہ اخیر زندگی تک قائم رہا۔ اکثر حرمین جاتے اور مہینوں قیام کرتے۔ حج کی تقریب میں ممالک اسلامی کے ہر گوشہ سے بڑے بڑے اہل کمال مکہ میں اگر جمع ہو جاتے تھے جن کا مقصد حج کے ساتھ افادہ اور استفادہ بھی ہوتا تھا۔ امام صاحبؒ اکثر اُن لوگوں سے ملتے اور مستفید ہوتے۔ امام اوزاعی اور مکحول شامی۔ کہ شام کے امام المذہب کہلاتے تھے۔ امام ابو حنیفہ نے مکہ ہی میں اِن لوگوں سے تعارف حاصل کیا اور حدیثؒ کی سند لی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ امام صاحب کی ذہانت اور اجتہاد کی شہرت دور دور پہنچ گئی تھی۔ یہاں تک کہ ظاہر بینوں نے انکو قیاس مشہور کر دیا تھا۔

انہیں دنوں میں عبد اللہؒ بن مبارک نے جو امام ابو حنیفہ کے مشہور شاگرد ہیں۔ بیروت کا سفر کیا کہ امام اوزاعی سے فن حدیث کی تکمیل کریں۔ پہلی ہی ملاقات میں اوزاعی نے ان سے پوچھا کہ "کوفہ میں ابو حنیفہ کون شخص پیدا ہوا ہے۔ جو دین میں نئی باتیں نکالتا ہے"۔ اُنہوں نے کچھ جواب نہ دیا اور گھر چلے آئے۔ دو تین دن کے بعد پھر گئے تو کچھ اجزاء ساتھ لیتے گئے۔ اوزاعی نے اُنکے ہاتھ سے وہ اجزاء لے لئے۔ سرنامہ پر لکھا تھا "قال نعمان بن ثابت"۔ دیر تک غور سے دیکھا کئے پھر عبد اللہؒ سے پوچھا نعمان کون بزرگ ہیں۔ اُنہوں نے کہا عراق کے ایک شیخ ہیں جنکی صحبت میں میں رہا ہوں۔ "فرمایا بڑے پایہ کا شخص ہے۔ عبد اللہؒ نے عرض کی یہ وہی ابو حنیفہ ہیں جنکو آپ مبتدع بتاتے تھے۔ اوزاعی کو اپنی غلطی پر افسوس ہوا۔ حج کی تقریب سے اوزاعی مکہ گئے

توامام ابوحنیفہ سے ملاقات ہوئی۔ انہیں مسائل کا ذکر آیا۔ اتفاق سے عبداللہ بن المبارک بھی موجود تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اِس خوبی سے تقریر کی کہ اوزاعی حیران رہ گئے۔ امام ابوحنیفہ کے جانے کے بعد مجھ سے کہا کہ اِس شخص کے کمال نے اِس کو لوگوں کا محسود بنا دیا ہے۔ بے شبہ میری بدگمانی غلط تھی جس پر میں افسوس کرتا ہوں۔ تاریخوں سے ثابت ہے کہ امام ابوحنیفہ نے فن حدیث میں امام اوزاعی کی شاگردی کی ہے۔ غالباً یہی زمانہ ہوگا۔

امام باقر علیہ السلام کی شاگردی

حضرت امام باقر علیہ السلام کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ امام ابوحنیفہ دوسری بار مدینہ گئے تو امام موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اِنکے ایک ساتھی نے پہچنوایا کہ یہ ابوحنیفہ ہیں۔ اُنہوں نے ابوحنیفہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "ہاں تمہیں قیاس کی بنا پر ہمارے دادا کی حدیثوں کی مخالفت کرتے ہو"۔ اُنہوں نے نہایت ادب سے کہا "عیاذاً باللہ حدیث کی کون مخالفت کرسکتا ہے۔ آپ تشریف رکھیں تو کچھ عرض کروں"۔ پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی (ابوحنیفہ) مرد ضعیف ہے یا عورت (امام باقر) عورت (ابوحنیفہ) وراثت میں مرد کا حصہ زیادہ ہے یا عورت کا (امام باقر) مرد کا (ابوحنیفہ) میں قیاس لگاتا تو کہتا کہ عورت کو زیادہ حصہ دیا جائے۔ کیونکہ ضعیف کو ظاہر قیاس کی بنا پر زیادہ ملنا چاہیئے۔ پھر پوچھا نماز افضل ہے یا روزہ (امام باقرؑ) نماز (ابوحنیفہ) اس اعتبار سے حائضہ عورت پر نماز کی قضا واجب ہونی چاہیئے نہ روزہ کی۔ حالانکہ میں روزہ ہی کی قضا کا فتوے دیتا ہوں۔ امام باقر اسقدر خوش ہوئے کہ اُٹھ کر اُنکی پیشانی چوم لی۔ ابوحنیفہ ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے اِنکی خدمت میں حاضر رہے۔ اور فقہ و حدیث کے متعلق بہت سی نادر باتیں حاصل کیں۔ شیعہ و سُنی دونوں نے مانا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی معلومات کا بڑا ذخیرہ۔ حضرت ممدوح کا فیض صحبت تھا۔ امام صاحب نے اُنکے فرزند رشید حضرت جعفر صادق علیہ السلام کی فیض صحبت سے بھی بہت کچھ فائدہ اُٹھایا جس کا ذکر عموماً تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ ابن تیمیہ نے اس سے انکار کیا ہے اور اُس کی وجہ یہ خیال کی ہے کہ امام ابوحنیفہ حضرت جعفر صادقؑ کے معاصر اور ہمسر تھے اس لئے اُن کی شاگردی کیونکر اختیار کرتے۔ لیکن یہ ابن تیمیہ کی گستاخی اور خیرہ چشمی ہے۔ امام ابوحنیفہ ہزار مجتہد اور فقیہ ہوں لیکن فضل و کمال میں اُنکو حضرت جعفر صادقؑ سے کیا نسبت؟ حدیث و فقہ بلکہ تمام مذہبی علوم اہلبیت کے گھر سے نکلے و صاحب البیت ادری بما فیھا

یا تو وہ زمانہ تھا کہ امام ابوحنیفہ نے ایک طالب العلم کی حیثیت سے حرمین کا سفر کیا تھا یا اب یہ نوبت پہنچی کہ سفر کا قصد کرتے تو تمام اطراف میں شہرہ ہو جاتا کہ فقیہ عراق عرب کو جا رہا

لہ عقود الجمان باب غاز دہم ۱۲

ہے۔ جس شہر یا گانوں میں گذرتا ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہو جاتا۔ ایک دفعہ مکہ معظمہ گئے تو لوگوں کی یہ کثرت ہوئی کہ مجلس میں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ ارباب حدیث و فقہ دونوں فرقے کے لوگ تھے اور شوق کا یہ عالم تھا کہ ایک پر ایک گرا پڑتا تھا۔ آخر امام صاحب نے تنگ آکر فرمایا "کاش ہمارے میزبان سے کوئی جاکر کہتا کہ اس ہجوم کا انتظام کرتے"۔ ابو عاصم نبیل حاضر تھے۔ عرض کی کہ میں جاتا ہوں۔ لیکن چند مسئلے دریافت کرنے رہ گئے ہیں۔ امام نے پاس بلا لیا اور زیادہ توجہ کے ساتھ اُنکی باتیں سُنیں۔ اسی میں میزبان کا خیال جاتا رہا۔ ابو عاصم نے فارغ ہو کر ایک اور طالب علم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور پھر وہی سلسلہ قائم ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد خیال آیا تو فرمایا کسی شخص نے میزبان کے پاس جانے کا اقرار کیا تھا وہ کہاں گیا۔ ابو عاصم بولے میں نے عرض کیا تھا۔ فرمایا پھر تم گئے نہیں؟ ابو عاصم نے مناظرانہ شوخی سے کہا میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ ابھی جاتا ہوں۔ جب فرصت ہوگی جاؤنگا"۔

امام نے فرمایا "عام بول چال میں اِن احتمالات کا موقع نہیں۔ اِن لفظوں کے معنے ہمیشہ وہی لئے جائینگے جو عوام کی غرض ہوتی ہے"[1]۔ ایک اعتبار سے یہ بھی ایک فقہی مسئلہ تھا۔ جس کو امام صاحب نے باتوں باتوں میں حل کر دیا۔

امام صاحب کے اساتذہ بھی نہایت عزت کرتے تھے۔

امام صاحب کے اساتذہ۔ اُنکا اِسقدر ادب و احترام کرتے تھے کہ لوگوں کو تعجب ہوتا تھا۔ محمد بن الفضل کا بیان ہے کہ ایک دفعہ امام ابو حنیفہ ایک حدیث کی تحقیق کے لئے خصیب کے پاس گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ خصیب نے اِن کو آتے دیکھا تو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور نہایت تعظیم کے ساتھ لاکر اپنی برابر بٹھایا۔ امام صاحب نے پوچھا کہ بیضہ نعام کے بارہ میں کیا حدیث آئی ہے"۔ خصیب نے کہا "اخبرنی ابو عبیدۃ عن عبد اللّٰہ بن مسعود فی بیضۃ النعام یصیبھا المحرم ان فیہ قیمتہ"۔ عمرو بن دینار جو کہ مشہور محدث تھے۔ ابو حنیفہ کے ہوتے حلقۂ درس میں اور کسی کی طرف خطاب نہیں کرتے تھے[2]۔

امام کی صحبت۔

اِس عظمت کے ساتھ امام صاحب کو طلبِ علم میں کسی سے عار نہ تھی۔ امام مالک عمر میں اِن سے تیرہ برس کم تھے۔ اُنکے حلقۂ درس میں بھی اکثر حاضر ہوئے اور حدیثیں سُنیں۔ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ "امام مالک کے سامنے ابو حنیفہ اِس طرح مؤدب بیٹھے تھے۔ جس طرح شاگرد استاد کے سامنے بیٹھتا ہے"۔ اِس کو بعض کوتاہ بینوں نے امام کی کسرِ شان پر محمول کیا ہے لیکن ہم اِس کو علم کی قدر شناسی اور شرافت کا تمغہ سمجھتے ہیں۔ امام مالک بھی اُنکا نہایت احترام کرتے تھے۔ عبد اللہ بن المبارک کی زبانی منقول ہے کہ میں امام مالک کی خدمت میں حاضر تھا۔ ایک بزرگ آئے جنکی اُنہوں نے نہایت تعظیم کی اور اپنی برابر بٹھایا۔ اُنکے جانے کے بعد فرمایا

[1] الجواہر المضیئۃ۔ باب الکنی ترجمۂ ابو عاصم النبیل ۱۲۔ [2] عقود الجمان باب ثالثہ ۱۲۔

جانتے ہو کون شخص تھا؟ یہ ابوحنیفہ عراقی تھے جو اس ستون کو سونے کا ثابت کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔"
ذرا دیر کے بعد ایک اور بزرگ آئے۔ امام مالک نے اُنکی بھی تعظیم کی لیکن نہ اسقدر جتنی ابوحنیفہ کی کی تھی۔ وہ اُٹھ گئے تو لوگوں سے کہا یہ سفیان ثوری تھے۔

حجاز و عراق کے ائمہ فن۔ روایت کے متعلق جدا جدا اصول رکھتے تھے۔ طرز تعلیم بھی مختلف تھا۔ بعضوں کے نزدیک لکھنے کا زیادہ اعتبار تھا۔ بعض مثلاً ابراہیم و شعبی صرف حافظہ سند سمجھتے تھے۔ اکثروں نے اسبات کو جائز رکھا تھا کہ مطلب میں فرق نہ آئے تو روایت میں حدیث کا ایک ٹکڑا چھوڑ دیا جا سکتا ہے۔ بعض اسکے بالکل خلاف تھے۔ ایک فریق کہتا تھا کہ راوی جب تک سامنے نہ ہو اُس سے روایت نہیں کی جا سکتی۔ شعبہ جو امام صاحب کے اُستاد تھے اُنکا یہی مذہب تھا۔ دوسرا گروہ پردہ کی اوٹ سے تحریر کی بنا پر روایت کرنے کو جائز سمجھتا تھا۔ امام زہری کی عادت تھی کہ روایت کے ساتھ الفاظ و مطالب کی تفسیر بھی کرتے جاتے تھے۔ بعض لوگ اِس کے سخت مخالف تھے۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے خود زہری کو ٹوکا کہ "حدیث نبوی میں آپ اپنے الفاظ نہ ملائیں"۔ امام مالک کو یہ طریقہ زیادہ پسند تھا کہ شاگرد پڑھیں اور وہ سنتے جائیں۔ بعض اس کے مخالف تھے۔ یحیٰی بن سلام اتنی بات پر اُنکے حلقہ درس سے ناراض ہو کر اُٹھ آئے کہ وہ خود نہیں پڑھتے شاگرد وہاں سے پڑھواتے ہیں"۔ اِسی طرح اور بہت سے اختلافات تھے جن کو فتح المغیث[۱] میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ کی کثرتِ شیوخ اور ریزہ چینیوں کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ اِن مختلف اصول سے آگاہ ہوں تاکہ سب کے مقابلہ سے خود ایک مستقل اور جنچی ہوئی رائے قائم کر سکیں۔ امام موصوف نے اصول سے میں جو اصلاحیں کی ہیں اُنکا بیان آگے آئیگا۔

طریقہ تعلیم کی ترقی

امام کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ اُنکی آغاز تحصیل ہی میں حدیث کی تعلیم کا طریقہ مرتب اور باقاعدہ ہو چلا تھا۔ اس سے پہلے عموماً زبانی روایت کا رواج تھا۔ بعض ائمہ حدیث کتابت کو قریباً ناجائز سمجھتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تقریباً سنہ ۱۰۱ھ میں اہل مدینہ کو خط لکھا جس کے یہ الفاظ تھے۔ انظروا بما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبوہ فانی خشیت دروس العلم و ذہاب العلماء یعنی "رسول اللہ کی جسقدر حدیثیں ہیں قلمبند کر لی جائیں ورنہ ضائع ہونے کا ڈر ہے"۔ اور شہروں میں بھی اس مضمون کے فرامین بھیجے۔ چنانچہ مدینہ میں امام زہری نے ایک مجموعہ مرتب کیا جس کی نقلیں سلطنت کی طرف سے تمام ممالک اسلامی میں شائع کی گئیں۔ اُس وقت سے تدوین کا عام رواج ہو گیا۔ اور جہاں جہاں اہل حدیث تھے اِسی طریقہ کو

۱؎ فتح المغیث صفحہ ۲۳۹ و مقدمہ قسطلانی شرح بخاری مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۱۲۶

برتنے لگے۔ شعبی (امام ابوحنیفہ کے اُستاد) کو اگرچہ زبانی روایت پر اصرار تھا تاہم کتاب ساتھ رکھتے تھے۔

طرز تعلیم نے بھی نہایت ترقی کی شیخ مجمع عام میں ایک بلند مقام پر بیٹھتا اور حدیث کا مجموعہ ہاتھ میں ہوتا۔ شاگرد دوات قلم لے کر بیٹھتے۔ اور اُستاد جو کچھ روایت کرتا اُسی کے الفاظ میں لکھتے جاتے۔ شائقین کی زیادہ کثرت ہوتی تو ایک مستملی کھڑا ہو کر وہ الفاظ دور کے بیٹھنے والوں تک پہنچاتا مگر یہ التزام تھا کہ مطلب بلکہ جہاں تک ہو الفاظ میں فرق نہ آئے۔ اس ضرورت کے مستملی ہمیشہ ایسا شخص مقرر ہوتا تھا جس کا حافظہ قوی اور معلومات وسیع ہوں۔ ساتھ ہی خوش لہجہ اور بلند آواز ہو۔ چنانچہ امام شعبہ کی مجلس درس میں۔ آدم بن ابی ایاس۔ اور امام مالک کے حلقہ میں ابن علیتہ اس خدمت پر مامور تھے۔

امام کے شیوخ حدیث بہت تھے۔

امام ابوحنیفہ اس خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں کہ اُنکے شیوخ حدیث بیشمار تھے۔ ابو حفص کبیر نے دعوےٰ کیا ہے کہ امام نے کم از کم چار ہزار شخصوں سے حدیثیں روایت کیں۔ اگرچہ تاریخ اسلام میں یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ مسلمانوں نے حدیثوں کے جمع کرنے میں جو محنتیں اور جانفشانیاں کی ہیں دنیا کی اور قومیں اُس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ ہم متعدد شخصوں کے نام بتا سکتے ہیں جنکے شیوخ حدیث چار ہزار سے کم نہ تھے اور ایسے تو بہت گذرے ہیں۔ جن کے اساتذہ ہزار سے زیادہ تھے۔ علامہ سخاوی نے فتح المغیث میں اِن لوگوں کے نام بھی گنائے ہیں۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کی نسبت یہ دعوےٰ محدثانہ اصول پر ثابت نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امام نے ایک گروہ کثیر سے روایت کی ہے اور اس کا خود محدثین کو اعتراف ہے علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں جہاں اُنکے شیوخ حدیث کے نام گنائے ہیں۔ اخیر میں لکھدیا ہے "وخلق کثیر" حافظ ابوالمحاسن شافعی نے عقود الجمان میں تین سو اُنیس شخصوں کے نام بقید نسب لکھے ہیں۔ اور اخیر میں لکھدیا ہے کہ میںنے ایک دوسری کتاب میں جس کا نام تحصیل السبیل الی معرفۃ الثقات والمجاہیل ہے۔ اِن لوگوں کے حالات بھی تفصیل سے لکھے ہیں۔ لیکن چونکہ اُنکی فہرست زیادہ تر فقہا حنفیہ سے ماخوذ ہے۔ ممکن ہے کہ محدثین کو کلیۃً اُس سے اتفاق نہ ہو۔

افسوس ہے کہ محدثین نے امام کے حالات میں جو کتابیں لکھیں ہیں اور جن میں اُنکے شیوخ کا پورا پورا استقصا کیا ہے۔ ہماری نظر سے نہیں گذریں۔ رجال کی مستند کتابیں جن میں امام کا ذکر ہے ہمارے سامنے ہیں لیکن اُن میں سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کے حالات ہیں۔ اس وجہ سے کسی خاص شخص کے متعلق پوری تفصیل نہیں مل سکتی۔ مختصر تاریخ بغداد و تہذیب الکمال۔

تہذیب الاسماء و اللغات ۔ تذکرۃ الحفاظ ۔ ملخص طبقات الحفاظ ۔ تہذیب التہذیب انساب سمعانی موطا امام محمدؒ ۔ کتاب الآثار امام محمدؒ کے تتبع[1] سے جسقدر اُنکے شیوخ انتخاب ہو سکتے ہیں اُنکے نام حسب ذیل ہیں ۔ ان میں سے اکثر کے اجمالی حالات ہم اوپر لکھ آئے ہیں ۔

عطاء بن ابی رباح مکی ۔ عاصم بن ابی النجود کوفی ۔ علقمہ بن مرثد کوفی ۔ حکم بن عتبہ کوفی ۔ سلمہ بن کہیل کوفی ۔ حضرت امام باقر علیہ السلام مدنی ۔ علی بن الاقمر الکوفی ۔ زیاد بن علاقہ کوفی ۔ سعید بن مسروق کوفی ۔ عدی بن ثابت انصاری کوفی ۔ عطیہ بن سعید کوفی ۔ ابو سفیان سعدی عبد الکریم بن امیہ بصری ۔ یحییٰ بن سعید مدنی ۔ ہشام بن عروہ مدنی (از تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر عسقلانی ۔

ابو اسحٰق السبیعی کوفی ۔ نافع بن عمرؓ مدنی ۔ عبد الرحمن بن ہرمز الاعرج المدنی ۔ قتادہ بصری ۔ عمرو بن دینار المکی ۔ محارب بن دثار کوفی ۔ ہیثم بن حبیب الصراف کوفی ۔ قیس بن مسلم کوفی ۔ محمد بن المنکدر المدنی ۔ یزید الفقیر کوفی ۔ سماک بن حرب کوفی ۔ عبد العزیز بن رفیع المکی ۔ مکحول شامی ۔ عمرو بن مرۃ الکوفی ۔ ابو الزبیر محمد بن مسلم مکی ۔ عبد الملک بن عمیر کوفی منصور بن زاذان ۔ منصور المعتمر عطاء بن السائب الثقفی ۔ عطاء بن ابی مسلم الخراسانی ۔ عاصم بن سلیمان الاحول بصری ۔ اعمش کوفی ۔ عبد اللہ بن عمر بن حفص المدنی ۔ امام اوزاعی (طبقات الحفاظ ذہبی از مقامات مختلفہ) ابراہیم بن محمد الکوفی اسمٰعیل بن عبد الملک المکی ۔ حارث بن عبد الرحمن المکی ۔ خالد بن علقمہ الوداعی ۔ ربیعۃ الرائے ۔ شداد بن عبد الرحمن بصری ۔ شیبان بن عبد الرحمن بصری ۔ طاؤس بن کیسان یمنی ۔ عبد اللہ بن دینار المدنی ۔ عکرمہ مولی ابن عباس مکی ۔ عون بن عبد اللہ کوفی ۔ قابوس بن ابی ظبیان کوفی ۔ محمد بن السائب الکلبی کوفی ۔ محمد بن مسلم بن شہاب الزہری ۔ ابو سعید مولیٰ ابن عباس (تہذیب الکمال)

موسیٰ بن ابی عائشہ کوفی ۔ صلیب بن بہرام ۔ عثمان بن عبد اللہ بن موہب ۔ بلال ۔ ہیثم بن ابی الہیثم ۔ حصین بن عبد الرحمن ۔ معن ۔ میمول بن سیاہ ۔ جواب التیمی ۔ سالم الافطس ۔ یحییٰ بن عمرو بن سلمہ عمرو بن جبیر ۔ عبد اللہ بن عمرؓ ۔ محمد بن مالک الہمدانی ۔ ابو السوار ۔ خارجہ بن عبد اللہ ۔ عبد اللہ بن ابی زیاد ۔ حکم بن زیاد ۔ کثیر الاصم ۔ حمید الاعرج ابو العطوف ۔ عبد اللہ بن الحسن ۔ سلیمان الشیبانی ۔ سعید المرزبان ۔ عثمان بن عبد اللہ ۔ ابو جحیہ (کتاب الآثار امام محمدؒ) ۔

ہم نے اسقدر نام سرسری طور سے انتخاب کیئے ہیں ۔ زیادہ چھان بین کرتے تو شاید عقود الجمان کی فہرست کے برابر اُترتے ۔ لیکن سچ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے لئے کثرت شیوخ اسقدر فخر کا باعث نہیں جتنا کہ اُنکی احتیاط اور تحقیق ہے ۔ وہ اس نکتہ سے خوب واقف تھے کہ روایت میں

[1] ان کتابوں میں سے تہذیب الکمال میری نظر سے نہیں گذری ۔ مولوی عبد الحی صاحب مرحوم نے التعلیق المجد میں امام ابو حنیفہ کی شیوخ تہذیب الکمال کے حوالہ سے لکھے ہیں ۔ میں نے اُنہی کے حوالہ سے لکھا ہے ۔

جس قدر واسطے زیادہ ہوتے ہیں اسیقدر تغیر و تبدل کا احتمال بڑھتا جاتا ہے - یہی باعث ہے کہ اُنکے اساتذہ - اکثر تابعین ہیں - جن کو رسول اللہ تک صرف ایک واسطہ ہے یا وہ لوگ ہیں جو مدت تک بڑے بڑے تابعین کی صحبت میں رہے تھے اور علم و فضل و دیانت و پرہیزگاری کے نمونے خیال کئے جاتے تھے - اِن دو قسموں کے سوا گر ہیں تو شاذ ہیں - اُن کی تعلیم کا بھی عام طالب علموں سے الگ تھا - بحث و اجتہاد کی شروع سے عادت تھی - اور اسباب میں وہ اُستادوں کی مخالفت کی بھی کچھ پرواہ نہ کرتے تھے - ایک دفعہ حماد کے ساتھ امام اعمش کی مشایعت کو نکلے - چلتے چلتے مغرب کا وقت آگیا - وضو کے لئے پانی کی تلاش ہوئی مگر کہیں نہ مِل سکا - حماد نے تیمم کا فتوے دیا - امام نے مخالفت کی کہ اخیر وقت تک پانی کا انتظار کرنا چاہئیے - اتفاق یہ کہ کچھ دور چلکر پانی مل گیا اور سب نے وضو سے نماز ادا کی - کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ اُستاد سے مخالفت کی - اور غالباً یہ زمانہ تحصیل کا آغاز تھا -

امام شعبی اِن کے اُستاد قائل تھے کہ معصیت میں کفارہ نہیں - ایک دفعہ اُستاد و شاگرد کشتی میں سوار جا رہے تھے - اس مسئلہ کا ذکر آیا - اُنہوں نے کہا ضرور معصیت میں کفارہ ہے کیونکہ خدا نے ظہار میں کفارہ مقرر کیا ہے - اور اس آیت میں وانھم لیقولون منکرا من القول وزوراً تصریح کردی ہے کہ ظہار معصیت ہے " امام شعبی کچھ جواب نہ دے سکے خفا ہو کر فرمایا - اقیاس انت عطا ابن ابی رباح سے کسی نے اس آیت کے معنے پوچھے واتیناہ اھلہ ومثلھم معھم عطا نے کہا خدا نے حضرت ایوبؑ کے آل و اولاد جو مر گئی تھی زندہ کردی - اور اُنکے ساتھ اور نئی پیدا کردی - امام ابوحنیفہ نے کہا جو شخص کسی کی صلب سے نہ پیدا ہوا ہو وہ اُس کی اولاد کیونکر ہو سکتا ہے[1] "

امام کی علمی ترقی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اِن کو بڑے بڑے اہلِ کمال کی صحبتیں میسر آئیں جن شہروں میں اُنکو رہنے کا اتفاق ہوا یعنی کوفہ - بصرہ - مکہ - مدینہ - یہ وہ مقامات تھے کہ مذہبی روائتیں وہاں کی ہوا میں سرایت کر گئی تھیں - علما سے ملنے اور علمی جلسوں میں شریک ہونے کا شوق امام کے خمیر میں داخل تھا - ساتھ ہی اسکے اُنکی شہرت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ جہاں جاتے تھے استفادہ - ملاقات - مناظرہ کی غرض سے خود اُنکے پاس ہزاروں آدمیوں کا مجمع رہتا تھا :

درس و افتا و بقیہ زندگی

اگرچہ حماد کی زندگی ہی امام صاحب نے اجتہاد کا رتبہ حاصل کر لیا تھا - عمر بھی کچھ نہ تھی - لیکن

[1] عقود الجمان - باب ثامن - ۲۰ [2] مختصر تاریخ بغداد - ترجمہ امام ابوحنیفہ - ۱۲

حماد کی وفات کے وقت کم وبیش چالیس برس کا سن تھا تاہم شاگرد انہ خلوص نے یہ گوارا نہ کیا کہ اُستاد کے ہوتے اپنا دربار الگ جمائیں۔ اگلے زمانہ میں اُستاد کے ساتھ جو محبت اور ادب آمیز تعلق ہوتا تھا آج اُس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ خود امام سے منقول ہے کہ حماد جب تک زندہ رہے۔ میں نے اُن کے مکان کی طرف کبھی پانوں نہیں پھیلائے۔ حماد نے سنہ ۱۲۰ھ میں قضا کی چونکہ ابراہیم نخعی کے بعد فقہ کا مدار انہیں پر رہ گیا تھا۔ اُن کی موت نے کوفہ کو بے چراغ کر دیا۔ حماد نے ایک لائق بیٹا چھوڑا تھا۔ لوگوں نے اُنہیں کو مسند درس پر بٹھایا۔ لیکن وہ لغت اور ادب کی طرف زیادہ مائل تھے۔ آخر موسیٰ بن کثیر نے کہ حماد کے شاگردوں میں تجربہ کار اور سن کے لحاظ سے سب سے ممتاز تھے اُنکی جگہ لی۔ وہ اگرچہ فقہ کے پورے ماہر نہ تھے لیکن اکثر بزرگوں کی صحبتیں اُٹھائی تھیں اور اِس وجہ سے لوگوں پر اُن کا ایک خاص اثر تھا۔ چند روز تک حلقۂ درس اُن کی وجہ سے قائم رہا۔ وہ حج کو چلے گئے۔ تو تمام بزرگوں نے متفقاً امام ابوحنیفہ سے درخواست کی کہ مسند درس کو مشرف فرمائیں۔

اُستاد کا ادب

مختلف حالتوں کا اقتضا دیکھو! یا تو وہ زمانہ تھا کہ جوانی ہی میں اُستادی کی مسند پر بیٹھنے کی آرزو تھی یا اب اور لوگ درخواست کرتے ہیں اور اُن کو اُس کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے انکار ہے۔ تاہم لوگوں کا اصرار غالب آیا اور چار و ناچار قبول کرنا پڑا۔ پھر بھی دل مطمئن نہ تھا۔ حافظ ابوالمحاسن نے لکھا ہے کہ "انہیں دنوں میں خواب دیکھا کہ پیغمبر خدا کی قبر مبارک کھود رہے ہیں۔" ڈر کر چونک پڑے اور سمجھے کہ میری ناقابلیت کی طرف اشارہ ہے۔ امام بن سیرین علم تعبیر کے اُستاد مانے جاتے تھے۔ اُنہوں نے تعبیر بتائی کہ اس سے ایک مردہ علم کو زندہ کرنا مقصود ہے۔ امام صاحب کو تسکین ہو گئی اور اطمینان کے ساتھ درس میں مشغول ہوئے۔" خواب کا ذکر تمام مورخوں اور محدثوں نے بھی کیا ہے۔ اس لحاظ سے گمان غالب ہے کہ اصل واقعہ صحیح ہو۔ لیکن یہ زمانہ۔ اور ابن سیرین کی تعبیر گوئی۔ محض غلط ہے کیونکہ ابن سیرین اِس سے بہت پہلے سنہ ۱۱۰ھ میں قضا کر چکے تھے۔ بہرحال امام صاحب نے استقلال کے ساتھ تدریس شروع کی۔ اوّل اوّل حماد کے پُرانے شاگرد درس میں شریک ہوتے تھے۔ لیکن چند روز میں وہ شہرت ہوئی کہ کوفہ کی اکثر درسگاہیں ٹوٹ کر انکے حلقہ میں آملیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود اُنکے اساتذہ۔ مثلاً مسعر بن کدام۔ امام اعمش وغیرہ اُن سے استفادہ کرتے تھے اور دوسروں کو ترغیب دلاتے تھے۔ اسپین کے سوا اسلامی دنیا کا کوئی حصہ نہ تھا جو اُن کی شاگردی کے تعلق سے آزاد رہا ہو۔ جن جن مقامات کے رہنے والے اُن کی خدمت میں پہنچے اُن سب کا شمار نہیں ہو سکتا۔ لیکن جن اضلاع یا ممالک کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔ مکہ۔ مدینہ

سلسلہ درس کی وسعت

دمشق - بصرہ - واسط - موصل - جزیرہ - رقہ نصیبین - رملہ - مصر - یمن - یمامہ - بحرین - بغداد - ہواز - کرمان - اصفہان - حلوان - استراباد - ہمدان - نہاوند - رے - قومس - دامغان - طبرستان - جرجان - نیشاپور - سرخس - نسا - بخارا - سمرقند - کس - صغانیان - ترمذ - ہرات - نہستار - خوارزم - سیستان - مداین - مصیصہ - حمص۔ مختصر یہ کہ اُنکے اُستادی کے حدود - خلیفہ وقت کی حدود حکومت کے برابر تھے۔

رفتہ رفتہ عراق میں اُن کا ملکی اثر قائم ہو گیا۔ یہاں تک کہ ملک میں جو انقلابات ہوتے تھے۔ لوگوں کو ان کی شرکت کا عموماً گمان ہوتا تھا۔ شاہ عبد العزیز صاحبؒ نے تحفہ میں لکھا ہے کہ زید بن علیؓ نے بنو امیہ کے عہد میں جو بغاوت کی تھی امام صاحب بھی اُس میں شریک تھے"۔ نامۂ دانشوران کے مولفوں نے بھی ایسا ہی گمان کیا ہے۔ لیکن ہم اسپر یقین نہیں کر سکتے۔ جسقدر تاریخیں اور رجال کی کتابیں ہمارے سامنے ہیں۔ اِن میں کہیں اِسکا ذکر نہیں حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو ایک قابل ذکر واقعہ تھا۔ زید بن علیؓ نے ۱۲۲ھ میں بغاوت کی تھی۔ اُس وقت ہشام بن عبد الملک تخت خلافت پر متمکن تھا ہشام اگرچہ کفایت شعار اور بعض امور میں نہایت جزرس تھا لیکن اُسکی سلطنت نہایت امن و امان کی سلطنت تھی۔ ملک میں ہر طرف امن امان کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ رعایا عموماً رضا مند تھی۔ بیت المال میں ناجائز آمدنیاں نہیں داخل ہو سکتی تھیں۔ اس حالت میں امامؒ ابو حنیفہ کو مخالفت کی کوئی وجہ نہ تھی۔ زید بن علیؓ سادات میں ایک صاحب ادعا شخص تھے بے شبہ اُنکو بغاوت کرنی ضرور تھی کیونکہ (بخیال اُنکے) خلافت اُنؓ کا خاص حق تھا۔ غالباً اس غلط فہمی کا منشا یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا خاندان اہلبیت کے ساتھ ایک خاص ارادت رکھتا تھا۔ امام صاحبؒ نے ایک مدت تک امام باقرؒ کے دامن فیض میں تربیت پائی تھی۔ کوفہ کی ہوا میں ایک مدت تک شیعہ پن کا اثر تھا۔ اِن اتفاقی واقعات نے امام ابو حنیفہ کی نسبت یہ گمان پیدا کر دیا۔ ورنہ تاریخی شہادتیں بالکل اسکے خلاف ہیں۔

زید بن علیؓ کے خروج میں امام صاحب شریک نہ تھے۔

ہشام نے ۱۲۵ھ میں وفات کی۔ اُس کے بعد ولید بن یزید۔ یزید الناقص۔ ابراہیم بن الولید مروان الحمار۔ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ عباسی خلافت کی سلسلہ جنبانی جو ایک مدت سے ہو رہی تھی مروان کے عہد میں نہایت قوت پکڑ گئی۔ ابو مسلم خراسانی نے تمام ملک میں سازشوں کا جال پھیلا دیا اور مروانی حکومت کی جڑ ہلا دی۔ چونکہ زیادہ تر فساد کا مرکز عراق اور عراق میں بھی خاص کوفہ تھا۔ مروان نے یزید بن عمر بن ہبیرہ کو وہاں کا گورنر مقرر کیا جو نہایت مدبر۔ دلیر فیاض۔ خاندانی۔ اور صاحب اثر شخص تھا۔ یزید نے حکومت مروانی کی ترکیب کو غور سے دیکھا

---

۱ عقود الجمان باب عاشر ۱۲۰

تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس گل میں اور سب کچھ ہے۔ لیکن مذہبی پرزے نہیں ہیں۔ اس بنا پر اُس نے چاہا کہ ایوان حکومت مذہبی ستونوں پر قائم کیا جائے۔ عراق کے تمام فقہاء کو جن میں قاضی بن ابی لیلیٰ بن شبرمہ۔ داؤد بن ہند بھی شامل تھے بلا کر بڑی بڑی ملکی خدمتیں دیں۔ امام صاحب کو میر منشی اور افسر خزانہ مقرر کرنا چاہا۔ اُنہوں نے صاف انکار کیا۔ یزید نے قسم کھا کر کہا کہ جبراً منظور کرنا ہوگا۔ انکے ہم صحبت بزرگوں نے بھی سمجھایا۔ مگر یہ اپنے انکار پر قائم رہے۔ اور کہا کہ یزید کہے کہ" مسجد کے دروازے گن دو تو بھی مجھکو گوارا نہیں۔ نہ کہ وہ کسی مسلمان کے قتل کا فرمان لکھے اور میں اُسپر مہر کردوں۔[1]" یزید نے غصہ میں آ کر حکم دیا کہ ہر روز اِن کو دس دُرّے لگائے جائیں۔ اس ظالمانہ حکم کی تعمیل ہوئی تاہم وہ اپنی ضد سے باز نہ آئے۔ آخر مجبور ہو کر یزید نے چھوڑ دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ اُسی وقت مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ اور سنہ ۱۳۶ھ کی اخیر تک وہیں رہے۔ ابن قتیبہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ جھگڑا قضا کے قبول کرنے پر تھا۔ ممکن ہے کہ یہ عہدہ بھی اُنکے لئے تجویز ہوا ہو۔ اور اُنہوں نے اُس سے بھی انکار کیا ہو۔

[illegible] میں سلطنت اسلام نے دوسرا پہلو بدلا۔ یعنی بنو امیہ کا خاتمہ ہو گیا اور آل عباسؓ تاج و تخت کے مالک ہوئے۔ اِس خاندان کا پہلا فرمانروا ابو العباس سفاح تھا۔ اُس نے چار برس کی حکومت کے بعد سنہ ۱۳۶ھ میں قضا کی۔ سفاح کے بعد اُسکا بھائی منصور تخت نشین ہوا عباسیوں نے گو۔ اموی خاندان کو بالکل تباہ کر دیا یہاں تک کہ خلفائے بنی امیہ کی قبریں اُکھڑوا کر اُنکی ہڈیاں تک جلاویں۔ تاہم چونکہ نئی نئی سلطنت تھی اور انتظام کا سکہ نہیں بیٹھا تھا۔ جا بجا بغاوتیں۔ انہیں اِن فتنوں کے فرو کرنے میں سفاح و منصور اعتدال کی حد سے بہت دور نکل گئے۔ اور وہ زیادتیاں کیں کہ مروانی حکومت کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ تمام ملک کی آنکھیں اِن نئے جانشینوں پر لگی تھیں۔ لیکن ان خونریزیوں نے سب کے دل افسردہ کر دیئے۔ چنانچہ ایک موقع پر منصور نے عبد الرحمٰن سے جو اُس کا بچپن کا یار تھا پوچھا کہ" ہماری سلطنت کو مروان کی سلطنت سے کیا نسبت ہے"۔ اُس نے کہا میرے نزدیک تو کچھ فرق نہیں"۔ منصور نے کہا کیا کروں کام کے آدمی نہیں ملتے"۔ عبد الرحمٰن نے کہا" بازار میں جس جنس کی زیادہ مانگ ہوتی ہے۔ کثرت بھی اس کی ہوتی ہے۔

سفاح و منصور کی سفاکیاں

اور بے رحمیاں تو تھی ہیں منصور نے یہ ستم کیا کہ سادات کی خانہ بربادی شروع کی ان میں شبہ نہیں کہ سادات ایک مدت سے خلافت کا خیال پکا رہی تھی۔ اور ایک لحاظ سے اُن کا حق بھی تھا۔ تاہم سفاح کی وفات تک اُنکی کوئی سازش ظاہر نہ ہوئی تھی۔ صرف بدگمانی پر منصور نے

[1] عقود الجمان باب بست ویکم ۱۲

سادات اور علویین کی بیخ کنی شروع کی۔ جو لوگ اُن میں ممتاز تھے اُنکے ساتھ زیادہ بے رحمیاں کیں۔ محمد بن ابراہیم کہ حسن و جمال میں یگانۂ روزگار تھے اور اس وجہ سے دیباج کہلاتے تھے انکو زندہ دیوار میں چنوا دیا۔ اِن بے رحمیوں کی ایک بڑی داستان ہے جس کے بیان کرنے کو بڑا سخت دل چاہئے آخر تنگ آ کر ۱۴۵ھ میں انہیں مظلوم سادات میں سے محمد نفس ذکیہ نے تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ مدینہ منورہ میں خروج کیا اور چند روز میں ایک بڑی جمعیت پیدا کر لی بڑے بڑے پیشوایانِ مذہب حتےٰ کہ امام مالک نے فتوے دیدیا کہ منصور نے جبراً بیعت لی خلافت نفس ذکیہ کا حق ہے۔ نفس ذکیہ اگرچہ نہایت دلیر بقوی بازو۔ فن جنگ سے واقف تھے لیکن تقدیر سے کس کا زور چل سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رمضان ۱۴۵ھ میں نہایت بہادری سے لڑ کر میدان جنگ میں مارے گئے۔ اُنکے بعد ابراہیم اُنکے بھائی نے علم خلافت بلند کیا۔ اور اس سر و سامان سے مقابلہ کو اُٹھے کہ منصور کے حواس جاتے رہے کہتے ہیں کہ اس اضطراب میں منصور نے دو مہینے تک کپڑے نہیں بدلے۔ سرہانے سے تکیہ اُٹھا لیتا تھا اور کہتا تھا کہ "میں نہیں جانتا یہ تکیہ میرا ہے یا ابراہیم کا۔" انہیں دنوں میں دو کنیزیں حرم میں آئیں۔ اُن سے بات تک نہ کی۔ ایک شخص نے سبب پوچھا۔ تو کہا "یہ فرصت کے کام ہیں۔ اِس وقت تو یہ دھن ہے کہ ابراہیم کا سر میرے آگے یا میرا سر ابراہیم کے آگے رکھا جاوے۔"

ابراہیم چونکہ شجاعت اور دلیری کے ساتھ بہت بڑے عالم اور مقتدائے عام تھے۔ اُن کے دعوائے خلافت پر۔ ہر طرف سے لبیک کی صدائیں بلند ہوئیں: خاص کوفہ میں کم و بیش لاکھ آدمی اُنکے ساتھ جان دینے کو طیار ہو گئے۔ مذہبی گروہ خاصکر علماء و فقہا نے عموماً اُن کا ساتھ دیا۔ امام ابو حنیفہ شروع سے عباسیوں کی بے اعتدالیاں دیکھتے آتے تھے۔ سفاح ہی کے زمانہ میں اُنکی رائے قائم ہو چکی تھی کہ یہ لوگ منصب خلافت کے شایاں نہیں۔ ابراہیم بن میمون جو ایک نہایت دیندار عالم تھے امام صاحب کے خالص دوستوں میں سے تھے وہ اکثر کہتے کہ اِن مظالم پر کیا ہم کو چپ رہنا چاہئے۔ امام صاحب فرماتے کہ "امر بالمعروف بے شبہ فرض ہے مگر اُس کے لئے سامان شرط ہے۔" لیکن وہ مذہبی جوش میں صبر کی تاب نہ لا سکے۔ ابو مسلم خراسانی کہ ان ظلموں کا بانی تھا۔ اُس کے پاس گئے اور نہایت بیباکی کے ساتھ اس امر کے متعلق گفتگو کی اُس نے انکی گستاخی یا فساد پیدا ہونے کے احتمال سے انکو قتل کرا دیا۔ امام ابو حنیفہ سُنکر بہت روئے۔[1] لیکن کیا کر سکتے تھے۔ یہ ۱۳۱ھ کا واقعہ ہے ۱۴۵ھ میں ابراہیم نے جب عَلم خلافت بلند کیا تو اور پیشوایان مذہب کے ساتھ امام صاحب نے بھی اُنکی تائید کی۔

[1] الجواہر المضیئہ ترجمہ ابراہیم بن میمون ۱۲

خود شریک جنگ ہونا چاہتے تھے لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے نہ ہو سکے۔ جسکا اُنکو ہمیشہ افسوس رہا۔ نامۂ دانشوراں میں امام صاحب کا ایک خط نقل کیا ہے۔ جو اُنہوں نے ابراہیم کو لکھا تھا اُسکے یہ الفاظ ہیں:۔ اما بعد فانی قد جهزت الیک اربعة آلاف درهم ولم یکن عندی غیرها ولولا امانات الناس عندی لحقت بک فاذا لقیت القوم وظفرت بهم فافعل کما فعل ابوک فی اهل صفین اقتل مدبرهم واجهز علی جریحهم ولا تفعل کما فعل ابوک فی اهل الجمل فان القوم لهم فئة

یعنے میں آپکے پاس چار ہزار درہم بھیجتا ہوں کہ اس وقت اسیقدر موجود تھے۔ اگر لوگوں کی امانتیں میرے پاس نہ رکھی ہوتیں تو میں ضرور آپ سے آملتا۔ جب آپ دشمنوں پر فتح پائیں تو وہ برتاؤ کریں جو آپکے باپ (حضرت علیؑ) نے صفین والوں کے ساتھ کیا تھا۔ زخمی اور بھاگ جانے والے سب قتل کئے جائیں۔ وہ طریقہ نہ اختیار کیجئے گا جو آپکے والد نے حرب جمل میں جائز رکھا تھا۔ کیونکہ مخالف بڑی جمعیت رکھتا ہے" نامۂ دانشوراں میں اس خط کی نسبت لکھا ہے کہ معتبر کتابوں میں منقول ہے۔ لیکن کسی خاص کتاب کا نام نہیں بتایا۔ اس لئے ہم اُس کی صحت پر یقین نہیں کر سکتے۔

یہ خط صحیح ہو یا غلط مگر اس میں شبہ نہیں کہ امام صاحب۔ ابراہیمؒ کے علانیہ طرفدار تھے۔ اور بجز اس کے کہ خود شریک جنگ نہ ہو سکے اور ہر طرح پر انکی مدد کی۔ ابراہیم نے اپنی بے تدبیری سے شکست کھائی اور بصرہ میں نہایت دلیری سے لڑکر مارے گئے۔ اس مہم سے فارغ ہوکر منصور اُن لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جنہوں نے ابراہیم کا ساتھ دیا تھا۔ ان میں امام صاحب بھی تھے۔ اُس وقت تک منصور کا پایہ تخت ہاشمیہ ایک مقام تھا جو کوفہ سے چند میل پر ہے۔ لیکن چونکہ کوفہ والے سادات کے سوا اور کسی خاندان کو خلافت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ منصور نے ایک دوسری دار الخلافتہ کی تجویز کی اور بغداد کو منتخب کیا۔ سنہ ۱۴۶ھ میں بغداد پہنچکر امام ابو حنیفہ کے نام فرمان بھیجا کہ فوراً پائے تخت میں حاضر ہوں۔ وہ بنو امیہ کی تباہی بعد مکہ معظمہ سے چلے آئے تھے۔ اور کوفہ میں مقیم تھے۔ منصور نے گو پہلے ہی اُنکے قتل کا ارادہ کر لیا تھا تاہم بہانہ ڈھونڈتا تھا۔ دربار میں حاضر ہوئے تو ربیع نے کہ حاجب کا عہدہ رکھتا تھا ان لفظوں سے اُنکو دربار میں پیش کیا "یہ دنیا میں آج سب سے بڑا عالم ہے" منصور نے پوچھا تم نے کس سے علم کی تحصیل کی۔ امام نے اُستادوں کے نام بتائے جنکا سلسلۂ شاگردی بڑے بڑے صحابہؓ تک پہنچتا تھا۔ منصور نے اُنکے لئے قضا کا عہدہ تجویز کیا۔ امام صاحب نے صاف انکار کیا اور کہا کہ "میں اسکی قابلیت نہیں رکھتا"! منصور نے غصہ میں آکر کہا "تم جھوٹے ہو" امام صاحب نے کہا "اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ

دعوے ضرور سچا ہے کہ میں عہدہ قضا کے قابل نہیں کیونکہ جھوٹا شخص قاضی نہیں مقرر ہو سکتا۔"
یہ تو ایک منطقی لطیفہ تھا۔ لیکن در اصل وہ قضا کی ذمہ واریاں نہیں اٹھا سکتے تھے۔ انہوں نے
منصور کے سامنے اپنی ناقابلیت کی جو وجہیں بیان کیں وہ بالکل بجا تھیں۔ یعنی یہ کہ "مجھکو اپنی
طبیعت پر اطمینان نہیں۔" "میں عربی النسل نہیں ہوں اس لئے اہل عرب کو میری حکومت ناگوار ہوگی"
درباریوں کی تعظیم کرنی پڑیگی اور یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔" پھر بھی منصور نے نہ مانا اور قسم کھا کر کہا
تم کو قبول کرنا ہوگا۔ امام صاحب نے بھی قسم کھائی کہ ہرگز نہ قبول کرونگا۔

عہدۂ قضا سے انکار

اس جرأت اور بیباکی پر۔ تمام دربار حیرت زدہ تھا۔ ربیع نے غصہ میں آکر کہا ابوحنیفہ! تم امیر المومنین
کے مقابلہ میں قسم کھاتے ہو۔ امام صاحب نے فرمایا "ہاں کیونکہ امیر المومنین کو قسم کا کفارہ ادا
کرنا میری نسبت زیادہ آسان ہے۔"

خطیب کی ایک اور روایت ہے کہ منصور نے زیادہ جبر کیا تو مجبوراً دار القضا میں جاکر بیٹھے
ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں قرضہ کا دعوے تھا۔ لیکن ثبوت کے گواہ نہ تھے۔ مدعا علیہ کو روپے
سے انکار تھا۔ امام صاحب نے حسب قاعدہ مدعا علیہ سے کہا تم قسم کھاؤ کہ مدعی کا تم پر کچھ دینا
نہیں آتا۔ وہ طیار ہو گیا۔ واللہ کا لفظ کہا تھا کہ امام صاحب نے گھبرا کر روک دیا۔ اور آستین سے
کچھ روپے نکالکر مدعی کے حوالہ کئے کہ تم اپنا قرض لو۔ ایک مسلمان کو قسم بیجا کیوں کھلاتے ہو۔
عدالت سے آکر منصور سے کہدیا کہ مجھ سے کسی طرح یہ کام نہیں چل سکتا۔ اسپر حکم ہوا کہ قید خانہ
بھیجے جائیں جس سے اس وقت چھوٹے کہ قید حیات سے چھوٹے۔ اس مدت میں منصور اکثر
انکو قید خانہ سے بلا لیتا اور علمی بحثیں کیا کرتا۔

قید

وفات۔ رجب سنہ ۱۵۰ ہجری

منصور نے امام کو سنہ ۱۴۶ھ میں قید کیا۔ لیکن اس حالت میں بھی اسکو انکی طرف سے اطمینان
نہ تھا۔ بغداد۔ دار الخلافہ ہونے کی وجہ سے علوم و فنون کا مرکز بن گیا تھا۔ طالبان کمال ممالک
اسلامی کے ہر گوشہ سے اٹھ کر بغداد ہی کا رخ کرتے تھے۔ امام صاحب کی شہرت دور دور
پہنچ چکی تھی۔ قید کی حالت نے انکے اثر اور قبول عام کو بجائے کم کرنے کے اور زیادہ کر دیا
تھا۔ بغداد کی علمی جماعت جس کا شہر میں بہت کچھ اثر تھا۔ انکے ساتھ نہایت خلوص رکھتی
تھی۔ ان باتوں کا یہ اثر تھا کہ منصور نے ان کو نظر بند رکھا۔ لیکن کوئی امر انکے ادب اور تعظیم
کے خلاف نہ کر سکتا تھا۔ قید خانہ میں انکا سلسلہ تعلیم بھی برابر قائم رہا امام محمد نے کہ فقہ حنفی کے
دست و بازو ہیں۔ قید خانہ ہی میں ان سے تعلیم پائی۔ ان وجوہ سے منصور کو امام صاحب کی طرف سے

امام صاحب کو زہر دیا گیا

جو اندیشہ تھا وہ قید کی حالت میں بھی باقی رہا جس کی آخری تدبیر یہ تھی کہ بے خبری میں اُنکو زہر زہر دلوا دیا۔ جب اُن کو زہر کا اثر محسوس ہوا تو سجدہ کیا اور اُسی حالت میں قضا کی۔ اُنکے مرنے کی خبر نہایت جلد تمام شہر میں پھیل گئی اور سارا بغداد اُمنڈ آیا۔ حسن بن عمارہ نے کہ قاضی شہر تھے غسل دیا نہلاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "واللہ تم سب سے بڑے فقیہ بڑے عابد بڑے زاہد تھے۔ تم میں تمام خوبیاں جمع تھیں۔ تم نے اپنے جانشینوں کو مایوس کر دیا کہ وہ تمہارے مرتبہ کو پہنچ سکیں"۔ غسل سے فارغ ہوتے ہوتے لوگوں کی یہ کثرت ہوئی کہ پہلی بار نماز جنازہ میں کم و بیش پچاس ہزار کا مجمع تھا۔ اسپر بھی آنے والوں کا سلسلہ قائم تھا یہانتک کہ چھ بار نماز پڑھی گئی۔ اور عصر کے قریب جاکر لاش دفن ہو سکی۔ امامؒ نے وصیت کی تھی کہ خیزران کے مقبرہ میں دفن کئے جائیں۔ کیونکہ یہ جگہ اُنکے خیال میں مغضوب نہ تھی۔ اِس وصیت کے موافق خیزران کے مشرقی جانب اُنکا مقبرہ طیار ہوا۔ مورخ خطیب نے لکھا ہے کہ دفن کے بعد بھی بیس دن تک لوگ اُنکے جنازہ کی نماز پڑھا کئے[1]۔ قبول عام کی اِس سے زیادہ کیا دلیل ہوگی؟

اُس وقت اُن ممالک میں بڑے بڑے ائمہ مذہب موجود تھے۔ جن میں بعض خود امام صاحبؒ کے اُستادؒ تھے۔ سب نے اُنکے مرنے کا رنج کیا اور نہایت تاسف آمیز کلمات کہے۔ ابن جریج مکہ میں تھے۔ سُنکر کہا "انا للہ بہت بڑا علم جاتا رہا"۔ شعبہ بن الحجاج نے امام حنیفہؒ کے شیخ اور بصرہ کے امام تھے۔ نہایت افسوس کیا اور کہا "کوفہ میں اندھیرا ہوگیا"۔ اِس واقعہ کے چند روز کے بعد عبداللہ بن المبارک کو بغداد جانے کا اتفاق ہوا امام کی قبر پر گئے اور رو کر کہا "ابو حنیفہ! خدا تمپر رحم کرے ابراہیم مرے تو اپنا جانشین چھوڑ گئے۔ حماد مرے تو اپنا جانشین چھوڑ گئے۔ افسوس تمنے تمام دنیا میں کسی کو اپنا جانشین نہ چھوڑا"۔

امام کا مزار ایک مدت تک بوسہ گاہ خلائق رہا اور آج بھی ہے۔ سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے کہ بڑی عظمت و شان کا فرمانروا اور نہایت عادل اور فیاض تھا ۴۵۹ سنہ ھ میں اُنکی قبر پر ایک قبہ اور اُس کے قریب ایک مدرسہ طیار کرایا۔ غالباً بغداد میں یہ پہلا مدرسہ تھا۔ کیونکہ نظامیہ جو تمام اسلامی مدرسوں کا آدم خیال کیا جاتا ہے وہ اسی سنہ میں لیکن اسکے بعد تعمیر ہوا۔ رفعت اور خوبی عمارت کے لحاظ سے بھی لاجواب تھا۔ ابو سعد شرف الملک کہ الپ ارسلان کا مستوفی تھا۔ اُس کے اہتمام سے عمارت طیار ہوئی۔ افتتاح کی رسم میں بغداد کے تمام علما اور عمائد شریک تھے۔ اتفاق سے اُسی وقت ابو جعفر مسعود جو ایک مشہور شاعر تھا آنکلا اور برجستہ

[1] عقود الجمان میں یہ تمام تفصیل مذکور ہے۔

یہ اشعار پڑھے۔

الم تران العلم کان مبددا | فجمعہ ھذا المغیث فی اللحد
کذلک کانت ھذہ الارض میتۃ | فانشرھا فعل الحمید ابی سعد

یعنی تم دیکھتے نہیں! علم کس طرح ابتر ہو رہا تھا۔ پھر اُس شخص نے اُسکو ترتیب دی جو اس لحد میں مدفون ہے۔ اِسی طرح یہ زمین مردہ پڑی تھی ابوسعد کی کوشش نے اُسکو دوبارہ زندہ کیا۔ یہ مدرسہ جو مشہد ابو حنیفہ کے نام سے مشہور ہے مدت تک قائم رہا اور بڑے بڑے نامور علما اُسکے پروفیسر مقرر ہوئے۔ جنکے نام اور اجمالی حالات الجواہر المضیئۃ فی طبقات الحنفیہ میں اکثر پائے جاتے تھے ۴۹۳ھ میں حکیم بن جزلہ نے کہ خلیفہ مقتدر باللہ کے دربار کا[1] ایک مشہور حکیم تھا اپنی تمام کتابیں اس مدرسہ پر وقف کیں تھے اس مدرسہ کے متعلق ایک مسافر خانہ بھی تھا۔ شائقان علم جو اطراف ملک سے آکر بغداد میں عارضی قیام کرتے تھے اُنکو وہاں سے کھانا ملتا تھا۔ ایشیا کا مشہور سیاح ابن بطوطہ جس وقت بغداد میں پہنچا ہے عباسی حکومت کا اخیر زمانہ تھا وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ "اس وقت تمام بغداد میں مشہد ابی حنیفہ کے سوا کوئی زاویہ موجود نہیں ہے جہاں سے مسافروں کو کھانا ملتا ہو" آج بھی اُن کا مقبرہ بغداد کے مشہور اور متبرک مقامات نسے ہے۔ حال کے شاہ ایران سلطان ناصر الدین قاچار خلد اللہ سلطنتہ نے اپنے حالات سفر میں اُسکا ذکر کیا ہے کہ "مینے امام ابو حنیفہ کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور نذر چڑھائی" علم کی شان دیکھو! جس کی بدولت کوفہ کے ایک خزار نے یہ رتبہ حاصل کیا کہ بارہ سو برس کے بعد آج اُسکے مزار پر بڑے بڑے شاہنشاہوں کے سر جھکتے ہیں۔

امام کی اولاد

امام صاحب کی اولاد کا مفصل حال معلوم نہیں مگر اسقدر یقینی ہے کہ وفات کے وقت حماد کے سوا اُنکے کوئی اور اولاد موجود نہ تھی۔ حماد بڑے رتبہ کے فاضل تھے۔ بچپن میں اُنکی تعلیم نہایت اہتمام سے ہوئی تھی۔ چنانچہ جب الحمد ختم کی تو اُنکے پدر بزرگوار نے اِس تقریب میں معلم کو پانچسو درہم نذر کئے۔ بڑے ہوئے تو خود امام صاحب سے مراتب علمی کی تکمیل کی۔ علم و فضل کے ساتھ بے نیازی اور پرہیزگاری میں بھی باپ کے خلف الرشید تھے۔ امام صاحب نے جب انتقال کیا تو اُنکے گھر میں لوگوں کا بہت سا مال و اسباب امانت رکھا تھا۔ اُنہوں نے قاضی شہر کے پاس حاضر کیا کہ جن کی امانتیں ہیں اُنکو پہنچا دی جائیں۔ قاضی صاحب نے کہا کہ ابھی اپنے ہی پاس رہنے دو کہ زیادہ حفاظت سے رہے گا۔ اُنہوں نے کہا آپ انکی جانچ

[1] ابن خلکان ترجمہ یحیے بن عیسے بن جزلۃ الطبیب۔

کرلیں کہ میرے باپ کا ذمہ بری ہو جاوے۔ غرض تمام مال و اسباب قاضی صاحب کو سپرد کر کے خود روپوش ہو گئے اور اُس وقت ظاہر ہوئے کہ وہ چیزیں کسی اور مہتمم کے اہتمام میں دیدی گئیں۔ تمام عمر کسی کی ملازمت نہیں کی نہ شاہی دربار سے کچھ تعلق پیدا کیا۔ ذی قعدہ سنہ ۱۷۶ھ میں قضا کی۔ چار بیٹے چھوڑے۔ عمرؒ۔ اسمٰعیلؒ۔ ابوحیانؒ۔ عثمانؒ۔ اسمٰعیلؒ نے علم و فضل میں نہایت شہرت حاصل کی۔ چنانچہ مامون الرشید نے اُنکو عہدۂ قضا پر مامور کیا۔ جس کو اُنھوں نے اِس دیانت داری اور انصاف سے انجام دیا کہ جب بصرہ سے چلے تو سارا شہر اُنکی مشایعت کو نکلا۔ اور سب لوگ اُنکے جان و مال کو دعائیں دیتے تھے[1]۔ مساور نے اُنکی مدح میں کہا ہے[2]۔

اذا ما الناس یوما قایسونا ۔ بآبدۃ من الفتیا طریفہ
اتیناھم بمقیاس صحیح ۔ تلاد من طراز ابی حنیفہ
اذا سمع الفقیہ بھا وعاھا ۔ واثبتھا بحبر فی صحیفہ

امام صاحب کی معنوی اولاد تو آج تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور شاید چھ سات کروڑ سے کم نہ ہوگی۔ لیکن اُنکی جسمانی اولاد بھی جابجا موجود ہے خود ہندوستان میں متعدد خاندان ہیں۔ جن کا سلسلۂ نسب امام تک پہنچتا ہے اور خدا کے فضل سے علم و فضل کا جوہر بھی نسلاً بعد نسلٍ اُنکی میراث میں چلا آتا ہے۔

اخلاق و عادات

ہمارے تذکرہ نویسوں نے امام کے اخلاق و عادات کی جو تصویر کھینچی ہے اُس میں خوش اعتقادی اور مبالغہ کا اسقدر رنگ بھرا ہے کہ امام صاحب کی اصلی صورت اچھی طرح پہچانی نہیں جاتی "چالیس برس تک عشا کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی"۔ "تیس برس تک متصل روزے رکھے"۔ "جہاں وفات کی اُس جگہ سات ہزار بار قرآن ختم کیا"۔ "شہر کوفہ میں مشتبہ گوشت کا ٹکڑا پڑ گیا تو اِس خیال سے کہ مچھلیوں نے کھایا ہوگا اور مچھلیاں بہت دنوں تک زندہ رہتی ہیں۔ ایک مدت تک مچھلی نہیں کھائی"۔ "اسی طرح ایک شبہ پر بکری کا گوشت کھانا چھوڑ دیا۔ اُن کا ذاتی صرف صرف دس آنہ ماہوار تھا"۔ یہ اور اِس قسم کے بہت سے افسانے اُنکی نسبت مشہور ہیں اور لطف یہ کہ ہمارے مورخین انہیں دور از کار قصوں کو امام کے کمالات کا جوہر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ واقعات نہ تاریخی اصول سے ثابت ہیں نہ اُن سے کسی کے شرف پر استدلال ہو سکتا ہے۔

مبالغہ آمیز روائتیں

یہ سچ ہے کہ امام صاحب کے جن فضائل یا عام حالات کو ہم صحیح تسلیم کرتے ہیں وہ بھی نہیں

[1] ابن خلکان ترجمہ حماد ۱۲۔ [2] معارف ابن قتیبہ ترجمہ امام ابوحنیفہ ۱۲

کتابوں سے ماخوذ ہیں جن میں یہ فضول قصے مذکور ہیں لیکن ہر واقعہ کی حیثیت الگ ہوتی ہے اور اُسی اعتبار سے شہادت کی حیثیت بھی بدل جاتی ہے۔ معمولی واقعات میں عام شہادتیں کافی ہیں۔ لیکن اِس قسم کے واقعات کے لئے ایسی سند درکار ہے جس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہ ہو یعنی حدیث صحیح مرفوع متصل کے لئے جو قیدیں ضروری ہیں اُن سے بھی کچھ بڑھ کر ساتھ ہی درایت کے اصول پر منطبق ہو۔ امام صاحب کی دانشمندی۔ دقیقہ سنجی۔ نکتہ شناسی پر جب نگاہ پڑتی ہے جنکا ثبوت سمعی نہیں۔ عیانی موجود ہے تو اُن واقعات پر مشکل سے یقین آ سکتا ہے جو رہبانیت اور بے اعتدالی حد سے بھی متجاوز ہیں۔

امام صاحب کی محاسن اخلاق کی صحیح (مگر اجمالی) تصویر دیکھنی ہو تو قاضی ابو یوسف کی تقریر سنو۔ جو اُنہوں نے ہرون الرشید کے سامنے بیان کی تھی۔ ہرون نے ایک موقع پر قاضی صاحب موصوف سے کہا کہ ابو حنیفہ کے اوصاف بیان کیجئے۔ اُنہوں نے کہا جہاں تک میں جانتا ہوں ابو حنیفہ کے اخلاق و عادات یہ تھے کہ نہایت پرہیزگار تھے۔ منہیات سے بہت بچتے تھے۔ اکثر چپ رہتے تھے اور سوچا کرتے تھے۔ کوئی شخص مسئلہ پوچھتا اور اُنکو معلوم ہوتا تو جواب دیتے ورنہ خاموش رہتے۔ نہایت سخی اور فیاض تھے۔ کسی کے آگے حاجت نہ لیجاتے اہل دنیا سے احتراز تھا۔ دنیوی جاہ و عزت کو حقیر سمجھتے تھے۔ غیبت سے بہت بچتے تھے جب کسی کا ذکر کرتے تو بھلائی کے ساتھ کرتے۔ بہت بڑے عالم تھے۔ اور مال کی طرح علم کے صرف کرنے میں بھی فیاض تھے"۔ ہرون الرشید نے یہ سُنکر کہا "صالحین کے یہی اخلاق ہوتے ہیں"۔ عام نگاہوں میں یہ باتیں چنداں وقعت نہیں رکھتیں۔ لیکن روحانی اوصاف کے نکتہ شناس سمجھ سکتے ہیں کہ یہ طرز زندگی ظاہر میں جسقدر سادہ اور آسان ہے۔ در اصل اُسی قدر مشکل اور قدر کے قابل ہے۔

امام صاحب کو خدا نے حسن سیرت کے ساتھ جمال صورت بھی دیا تھا۔ میانہ قد۔ خوشرو اور موزون اندام تھے۔ گفتگو نہایت شیریں اور آواز بلند اور صاف تھی۔ کیسا ہی پیچیدہ مضمون نہایت صفائی اور فصاحت سے ادا کر سکتے تھے۔ مزاج میں تکلف تھا۔ اور اکثر عمدہ لباس پہنتے تھے۔ کبھی کبھی سنجاب وہ قیمتی جبّے بھی استعمال کرتے تھے۔ ابو مطیع بلخی اُنکے شاگرد کا بیان ہے۔ لباس
کہ "میں نے ایک دن اُنکو نہایت قیمتی چادر اور قمیص پہنے دیکھا جنکی قیمت کم از کم چار سو درہم ہوگی"۔

ایک دن نصر بن محمدؒ اُن سے ملنے گئے۔ امام صاحب کہیں باہر جانے کی طیاری کر رہے تھے اِن سے کہا کہ ذرا دیر کے لئے اپنی چادر مجھے دیدو۔ واپس آئے تو شکایت کی کہ ناحق تمہاری چادر لیکر مجھ کو شرمندہ ہونا پڑا"۔ اُنہوں نے کہا کیوں؟ فرمایا بہت گندہ ہے۔ نصر کہتے ہیں کہ میں نے

دربار ی ٹوپی

وہ چادر پانچ دینار کو خریدی تھی اور مجھکو اُسپر ناز تھا۔ اس لئے امام صاحب کی شکایت سے تعجب ہوا لیکن دوسرے موقع پر جب مینے اُنکو ایک چادر اوڑھے دیکھا جو تیس دینار سے کم قیمت کی نہ تھی تو وہ تعجب جاتا رہا"۔ خلیفہ منصور نے درباریوں کے لئے خاص قسم کی ٹوپیاں ایجاد کی تھیں جو نرکل وغیرہ سے بنتی تھیں اور اُن پر سیاہ کپڑا منڈھا ہوتا تھا چونکہ نہایت لمبی ہوتی تھیں ابو دلامہ شاعر نے ظرافتہً کہا۔

وکنا نرجی من امام زیادۃ فزاد الامام المرتضی فی القلانس

یعنے ہم کو خلیفہ سے اضافہ کی امید تھی۔ سو حضرت نے اضافہ کیا تو ٹوپیوں میں کیا"۔ امام صاحب اگرچہ دربار سے کوسوں بھاگتے تھے لیکن اس قسم کی ٹوپی جو اہل دربار اور امرا کے ساتھ مخصوص تھی کبھی کبھی استعمال کرتے تھے۔ دنیا دار دولتمندوں کے لئے تو ایک معمولی بات ہے۔ لیکن علما کے دائرہ میں یہ امر تعجب کی نگاہ سے دیکھا گیا کہ امام صاحب کے توشہ خانہ میں اکثر سات آٹھ ٹوپیاں موجود رہتی تھیں۔

وظیفہ خواری سے اجتناب

اور باتوں میں بھی امام صاحب کا طرز معاشرت اِن حیثیتوں میں اور علما سے بالکل جدا تھا۔ اُنکے ہمعصر عموماً شاہی دربار یا وزرا اور امرا کے وظیفہ خوار تھے اور اسکو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ قاضی ابن عبد البر پر کسی نے اعتراض کیا تھا کہ آپ امرا کے وظیفہ خوار ہیں۔ اُنہوں نے اسکے جواب میں بعض صحابہؓ اور بہت سے تابعینؒ اور تبع تابعین کی نظریں پیش کیں جو اُمرا کے روزینہ اور انعامات سے زندگی بسر کرتے تھے۔

اگرچہ ہم اِس کو نئے خیال والوں کی طرح کاہلی اور مفت خواری کا اثر نہیں سمجھتے۔ کیونکہ اُس زمانہ تک تعلیم کا سلسلہ معاوضہ کی بنیاد پر نہیں قائم ہوا تھا۔ علما بطیب خود اپنے گھروں پر یا مسجد میں لوگوں کو مفت تعلیم دیتے تھے۔ اور یہ سلسلہ اسقدر وسیع اور مفید تھا کہ آج تک اُس سے بڑھ کر نہ ہوسکا۔ امرا کے ہاں سے اِن لوگوں کے لئے جو وظیفے مقرر تھے یا کبھی کبھی صلہ و نذر کے طور پر مل جاتا تھا اُس کو اِن آنریری پروفیسروں کی تنخواہ سمجھ لینا چاہئے۔ لیکن اِس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ رفتہ رفتہ انہیں مثالوں سے پیرزادگی اور مفت خواری کی بنیاد قائم ہوگئی۔ جس نے قوم کے ایک بڑے حصہ کو بالکل نکما اور اپاہج بنادیا بے شبہ امام ابوحنیفہ اِس اصول کے سرے سے مخالف تھے اور اِس لحاظ سے اُنکی مخالفت بجا بھی تھی۔ اِس بے تعلقی سے ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ امر حق کے اظہار میں امام صاحب کو کسی سے باک نہیں ہوتا تھا۔ انسان کتنا ہی مستقل مزاج اور صاف گو ہو لیکن احسان وہ چھپا ہوا جادو ہے کہ اُسکے اثر سے بچنا ناممکن نہیں تو قریباً ناممکن ہے۔ امام صاحب تمام عمر کسی کے احسانمند نہ ہوئے اور

اس وجہ سے اُنکی آزادی کو کوئی چیز دبا نہ سکتی تھی۔ اکثر موقعوں پر وہ اِس خیال کا اظہار بھی

آزادی اور بے نیازی

کر دیا کرتے تھے۔ بن ہبیرہ نے کہ کوفہ کا گورنر اور نہایت نامور شخص تھا۔ اِن سے یہ لجاجت کہا کہ آپ کبھی کبھی قدم رنجہ فرماتے تو مجھپر احسان ہوتا فرمایا " میں تم سے مل کر کیا کرونگا۔ مہربانی سے پیش آؤگے تو خوف ہے کہ تمھارے دام میں آجاؤں۔ عتاب کروگے تو میری ذلت ہے۔ تمہارے پاس جو زر و مال ہے مجھکو اُس کی حاجت نہیں۔ میرے پاس جو دولت ہے اُسکو کوئی شخص چھین نہیں سکتا "۔ عیسےٰ بن موسےٰ کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ گذرا۔

بلا غرض حق گوئی

خلیفہ منصور اور حرہ خاتون (منصور کی بیوی) میں کچھ شکر رنجی ہو گئی تھی۔ خاتون کو شکایت تھی کہ خلیفہ عدل نہیں کرتا۔ منصور نے کہا کسی کو منصف قرار دو۔ اُس نے امام صاحب کا نام لیا اُسی وقت طلبی کا فرمان گیا۔ خاتون پردہ کے قریب بیٹھی کہ امام صاحب جو فیصلہ کریں خود اپنے کانوں سے سُنے۔ منصور نے پوچھا۔ شرع کی رو سے مرد کتنے کر سکتا ہے۔ امام صاحب نے کہا چار۔ منصور خاتون کی طرف مخاطب ہوا کہ سُنتی ہو؟ پردہ سے آواز آئی کہ ہاں سُنا۔ امام صاحب نے منصور کی طرف خطاب کر کے کہا مگر " یہ اجازت اُس کے لئے خاص ہے جو عدل پر قادر ہو۔ ورنہ ایک سے نکاح کرنا اچھا نہیں۔ خدا خود فرماتا ہے وان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ منصور چپ ہو گیا۔ امام صاحب گھر آئے تو ایک خادم پچاس ہزار درہم کے توڑے لئے ہوئے حاضر ہوا کہ خاتون نے نذر بھیجی ہے۔ اور کہا ہے کہ " آپکی کنیز آپ کو سلام کہتی ہے۔ اور آپ کی حق گوئی کی نہایت مشکور ہے "۔ امام صاحب نے روپے پھیر دیئے اور خادم سے فرمایا جاکر خاتون سے کہنا کہ " مینے جو کچھ کہا کسی غرض سے نہیں کہا۔ بلکہ میرا فرض منصبی تھا "۔

تجارت اور دیانت

امام صاحب کی تجارت نہایت وسیع تھی لاکھوں کا لین دین تھا۔ اکثر شہروں میں گماشتے مقرر تھے۔ بڑے بڑے سوداگروں سے معاملہ رہتا تھا۔ ایسے بڑے کارخانہ کے ساتھ دیانت اور احتیاط کا اسقدر خیال رکھتے تھے کہ ناجائز طور پر ایک حبہ بھی اُنکے خزانہ مین نہیں داخل ہو سکتا تھا۔ اِس احتیاط میں کبھی کبھی نقصان اُٹھانا پڑتا تھا مگر اُن کو کچھ پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ ایک دفعہ حفص بن عبد الرحمٰن کے پاس خز کے تھان بھیجے اور کہلا بھیجا کہ فلاں فلاں تھان میں عیب ہے۔ خریدار کو جتا دینا۔ حفص کو اس ہدایت کا خیال نہ رہا۔ تھان بیچ ڈالے۔ اور خریداروں کو عیب سے اطلاع نہ دی۔ امام صاحب کو معلوم ہوا تو نہایت افسوس کیا۔ تھانوں کی قیمت جو تیس ہزار درہم تھی سب خیرات کر دی۔

ایک دن ایک عورت خز کا تھان لیکر آئی کہ فروخت کرا دیجئے۔ امام صاحب نے دام پوچھے اُس نے سو روپے بتلائے فرمایا کم ہیں۔ اُس نے کہا تو دو سو روپے۔ فرمایا یہ تھان پانچسو سے

کم قیمت کا نہیں۔ اُس نے متعجب ہو کر کہا آپ شائد ہنسی کرتے ہیں۔ امام صاحب نے پانچسو روپے اپنے پاس سے دیدیئے اور تھان رکھ لیا۔ اس احتیاط اور دیانت نے اُنکے کارخانہ کو بجائے نقصان پہنچانے کے اور بھی چمکا دیا تھا۔

فیاضی

تجارت اور اکتساب دولت سے اُنکا مقصود زیادہ تر عام کو فائدہ پہنچانا تھا۔ جتنے احباب اور ملنے والے تھے سب کے روزینے مقرر کر رکھے تھے۔ شیوخ اور محدثین کے لئے تجارت کا ایک حصہ مخصوص کر دیا تھا کہ اُس سے جو نفع ہوتا تھا سال کے سال اُن لوگوں کو پہنچا دیا جاتا تھا[1] عام معمول تھا کہ گھر والوں کے لئے کوئی چیز خریدتے تو اُسی قدر محدثین اور علما کے پاس بھجواتے اتفاقیہ کوئی شخص ملنے آتا تو اُس کا حال پوچھتے اور حاجتمند ہوتا تو حاجت روائی کرتے شاگردوں میں جس کو تنگ حال دیکھتے اُسکی ضروریات خانگی کی کفالت کرتے کہ اطمینان سے علم کی تکمیل کر سکے۔ بہت سے لوگ جنکو مفلسی کی وجہ سے تحصیل علم کا موقع نہیں مل سکتا تھا امام صاحب ہی کی دستگیری کی بدولت بڑے بڑے رتبوں پر پہنچے۔ انہیں میں قاضی ابو یوسف صاحب بھی ہیں جنکا مفصل تذکرہ آگے آتا ہے۔

ایک دفعہ کچھ لوگ ملنے آئے اِن میں ایک شخص ظاہری صورت سے شکستہ حال معلوم ہوتا تھا۔ لوگ رخصت ہو کر چلے تو امام صاحب نے اِس سے فرمایا ذرا ٹھیر جاؤ۔ جا نماز کی طرف اشارہ کیا کہ اِسکو اٹھانا اُس نے دیکھا تو ہزار درہم کی ایک تھیلی تھی۔ عرض کی کہ میں دولتمند ہوں مجھکو اس کی ضرورت نہیں۔ فرمایا تو صورت ایسی بنانی چاہئے کہ دوسروں کو شبہ نہ ہو۔

ایک دفعہ کسی بیمار کی عیادت کو جا رہے تھے۔ راہ میں ایک شخص ملا۔ جو انکا قرضدار تھا۔ اُس نے دور سے انکو دیکھ لیا اور کترا کر دوسری طرف چلا۔ اُنہوں نے پکارا۔ کہ "کہاں جاتے ہو" وہ کھڑا ہو گیا۔ قریب پہنچے تو پوچھا کہ "مجھکو دیکھکر تمنے راستہ کیوں کاٹا" اُس نے کہا آپکے دس ہزار درہم مجھ پر آتے ہیں جو مجھ سے اب تک ادا نہ ہو سکے۔ اِس شرم سے آنکھ برابر نہیں ہوتی" امام صاحب اُس کی غیرت سے متعجب ہوئے اور فرمایا۔ جاؤ میں نے سب معاف کر دیا۔

ایک بار سفر حج میں عبداللہ سہمی کا ساتھ ہوا کسی منزل میں ایک بدوی نے اُنکو پکڑا اور امام صاحب کے سامنے لایا کہ اسپر میرے روپے آتے ہیں اور یہ ادا نہیں کرتا۔

امام صاحب نے عبداللہ سے اِسکی حقیقت پوچھی۔ اُنہوں نے سرے سے انکار کیا۔ امام صاحب نے بدوی سے پوچھا آخر کتنے درہموں پر یہ جھگڑا ہے۔ اُس نے کہا چالیس درہم۔ متعجب ہو کر فرمایا کہ زمانے سے حمیت اُٹھ گئی اتنے سے معاملہ پر یہ فضیحتی!! پھر کل درہم اپنے پاس سے ادا کر دیئے

[1] علامہ نووی نے تہذیب الاسماء میں ان واقعات کو پسند بیان کیا ہے۔ ۱۲

ابراہیم بن عتبہ چار ہزار درہم کے مقروض تھے اور اس ندامت کی وجہ سے لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ اُنکے ایک دوست نے چندہ کر کے اُنکا قرض ادا کرنا چاہا۔ لوگوں نے بقدر حیثیت اعانت کی۔ امام صاحب کے پاس گئے تو فرمایا کہ کل کسقدر قرضہ ہے۔ اُنہوں نے کہا چار ہزار۔ فرمایا اتنی سی رقم کے لئے لوگوں کو کیوں تکلیف دیتے ہو۔ یہ کہکر پورے چار ہزار درہم خود دیدیئے۔ تاریخوں میں اس قسم کے اور بہت سے واقعات اُنکی نسبت منقول ہیں۔ ہم نے اختصار کے لحاظ سے قلم انداز کئے۔

حلیم و عفو

اس دولتمندی اور عظمت و شان کے ساتھ نہایت متواضع حلیم۔ اور خلیق تھے۔ ایک دفعہ مسجد خیف میں تشریف رکھتے تھے۔ شاگردوں اور ارادتمندوں کا حلقہ تھا۔ ایک اجنبی شخص نے مسئلہ پوچھا۔ امام صاحب نے جواب مناسب دیا۔ اُس نے کہا "مگر حسن بصری نے اسکے خلاف بتایا ہے۔" امام صاحب نے فرمایا "حسنؒ نے غلطی کی"۔ حاضرین میں سے ایک شخص کہ حسنؒ کا معتقد تھا طیش میں آگیا اور چلا کر کہا "او ابن الفاحشہ! تو حسنؒ کو خاطی کہتا ہے"۔ اس گستاخی اور بیہودہ گوئی نے تمام مجلس کو برہم کر دیا اور لوگوں نے چاہا کہ اس کو پکڑ کر سزا دیں۔ امام صاحب نے روکا۔ اُنکے لحاظ سے لوگ مجبور ہو گئے۔ مگر دیر تک مجلس میں سناٹا رہا۔ لوگوں کا جوش کم ہوا تو امام صاحب نے اُس شخص کی طرف خطاب کیا اور فرمایا کہ "ہاں حسنؒ نے غلطی کی عبد اللہ بن مسعودؓ نے اس باب میں جو روایت کی ہے وہ صحیح ہے"۔

یزید بن کمیت کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں امام ابو حنیفہ کی خدمت میں حاضر تھا۔ ایک شخص نے اُن سے گستاخانہ گفتگو شروع کی۔ امام صاحب تحمل سے جواب دیتے تھے وہ اور شوخ ہوتا جاتا تھا یہاں تک کہ اُس نے امامؒ کو زندیق کہدیا۔ اِسپر فرمایا کہ "خدا تم کو بخشے۔

وہ خوب جانتا ہے کہ میری نسبت تم نے جو لفظ کہا صحیح نہیں ہے"۔ امام صاحب خود فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے کسی پر لعنت نہیں کی۔ کسی سے انتقام نہیں لیا۔ کسی مسلمان یا ذمی کو نہیں ستایا کسی سے فریب اور بد عہدی نہیں کی"۔

امام سفیان ثوری اور امام صاحب میں کچھ شکر رنجی تھی۔ ایک شخص نے امام صاحب سے آکر کہا کہ سفیان۔ آپ کو بُرا کہہ رہے تھے۔ امام نے فرمایا کہ "خدا میری اور سفیان دونوں کی مغفرت کرے۔ سچ یہ ہے کہ ابراہیم نخعی کے موجود ہوتے بھی اگر سفیان دنیا سے اُٹھ جاتے تو مسلمانوں کو سفیان کے مرنے کا ماتم کرنا پڑتا"۔

ایک دن مسجد میں درس دے رہے تھے ایک شخص نے جس کو اُن سے کچھ عداوت تھی۔ عام مجلس میں اُنکی نسبت ناسزا الفاظ کہے۔ اُنہوں نے کچھ التفات نہ کی۔ اور اسی طرح درس میں مشغول

رہے۔ شاگردوں کو بھی منع کر دیا کہ اُس کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ درس سے اُٹھے تو وہ شخص ساتھ ہوا اور جو کچھ منہ میں آتا تھا بکتا جاتا تھا۔ امام صاحب اپنے گھر کے قریب پہنچے تو کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ "بھائی یہ میرا گھر ہے، کچھ باقی رہ گیا ہو تو اُٹھا نہ رکھو کہ اب میں اندر جاتا ہوں اور تم کو موقع نہ ملے گا"۔

ایک اور دن حلقۂ درس قائم تھا۔ ایک نوعمر نے مسئلہ پوچھا۔ امام صاحب نے جواب دیا۔ اُس نے کہا۔ ابو حنیفہ تم نے جواب میں غلطی کی۔ ابو الخطاب جرجانی بھی حلقہ میں شریک تھے۔ اُنکو نہایت غصہ آیا اور حاضرین کو ملامت کی کہ تم لوگ بڑے بے حمیت ہو۔ امامؒ کی شان میں ایک لونڈا جو جی میں آتا ہے کہہ جاتا ہے۔ تم کو ذرا جوش نہیں آتا۔ امام صاحب نے ابو الخطاب کی طرف خطاب کیا اور فرمایا کہ "ان لوگوں پر کچھ الزام نہیں۔ میں اِس جگہ بیٹھا ہوں تو اِسی لئے بیٹھا ہوں کہ لوگ آزادانہ میری رائے کی غلطیاں ثابت کریں اور میں تحمل کے ساتھ سنوں"۔

محلہ میں ایک موچی رہتا تھا جو نہایت رنگین طبع اور خوش مزاج تھا۔ اُس کا معمول تھا کہ دن بھر مزدوری کرتا۔ شام کو بازار جا کر گوشت اور شراب مول لاتا۔ کچھ رات گئے دوست احباب جمع ہوتے۔ خود سیخ پر کباب لگاتا۔ اور یاروں کو کھلاتا ساتھ ہی شراب کا دور چلتا اور مزے میں آکر یہ شعر گاتا۔ اضاعونی وای فتی اضاعوا۔ لیوم کریہۃ وسداد ثغر

یعنی "لوگوں نے مجھکو ہاتھ سے کھو دیا اور کیسے بڑے شخص کو کھویا جو لڑائی اور رخنہ بندی کے دن کام آتا"۔ امام صاحب، ذکر و شغل میں رات کو سوتے کم تھے۔ اُس کی نغمہ سنجیاں سُنتے اور فرط اخلاق کی وجہ سے کچھ تعرض نہ کرتے۔ ایک رات کوتوال شہر اُدھر آنکلا۔ اور اُس غریب کو گرفتار کر کے قید خانہ میں بھیجدیا۔ صبح کو امام صاحب نے دوستوں سے تذکرہ کیا۔ کہ رات ہمارے ہمسایہ کی آواز نہیں آئی۔ لوگوں نے رات کا ماجرا بیان کیا۔ اُسی وقت سواری طلب کی۔ دربار کے کپڑے پہنے اور دار الامارۃ کا قصد کیا۔ یہ عباسیہ کا عہد حکومت تھا۔ اور عیسےٰ بن موسےٰ کہ خلیفۂ منصور کا برادرزادہ اور تمام خاندان میں عقل و تدبیر دلیری اور شجاعت کے لحاظ سے ممتاز تھا۔ کوفہ کا گورنر تھا۔ لوگوں نے اطلاع کی کہ امام ابو حنیفہ آپ کے ملنے کو آتے ہیں۔ اُس نے درباریوں کو استقبال کے لئے بھیجا۔ اور حکم دیا کہ دار الامارۃ کے صحن تک امام صاحب کو سواری پر لائیں۔ سواری قریب آئی تو تعظیم کو اُٹھا۔ اور نہایت ادب سے لا کر بٹھایا۔ پھر عرض کی کہ "آپ نے کیوں تکلیف فرمائی مجھکو بلا بھیجتے کہ میں خود حاضر ہوتا"۔ امام صاحب نے فرمایا کہ "ہمارے محلہ میں ایک موچی رہتا ہے۔ کوتوال نے اُس کو گرفتار کر لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ رہا کر دیا جاوے"۔ عیسےٰ نے اُسی وقت داروغۂ جیل کو حکم بھیجا اور وہ رہا کر دیا گیا۔ امام صاحب عیسےٰ سے رخصت

ہو کر چلے تو موچی بھی ہمرکاب ہوا۔ امام اُس کی طرف مخاطب ہوئے کہ کیوں! ہم نے تم کو ضائع تو نہیں کیا۔" یہ اُس شعر کی طرف اشارہ تھا جس کو وہ ہمیشہ پڑھا کرتا تھا۔ اضاعونی والے فتی اضاعوا اُس نے عرض کی کہ نہیں آپ نے ہمسائگی کا پورا حق ادا کیا[1]۔ اِس کے بعد اُس نے عیش پرستی سے توبہ کی۔ اور امام صاحب کے حلقۂ درس میں بیٹھنے لگا۔ رفتہ رفتہ علم فقہ میں مہارت حاصل کی۔ اور فقیہ کے لقب سے ممتاز ہوا۔

والدہ کی خدمت

امام صاحب کے والد نے امام کے کبر سن رشد سے پہلے قضا کی۔ لیکن والدہ مدت تک زندہ رہیں اور امام کو اُنکی خدمت گذاری کا کافی موقع ہاتھ آیا۔ وہ مزاج کی شکی تھیں اور جیسا کہ عورتوں کا قاعدہ ہے واعظوں اور قصہ گویوں کے ساتھ نہایت عقیدت رکھتی تھیں۔ کوئی مسئلہ پیش آتا تو امام صاحب کو حکم دیتیں کہ عمرو بن ذر سے پوچھ آؤ۔ امام تعمیل ارشاد کے لئے اُنکے پاس جا کر مسئلہ پوچھتے۔ وہ عذر کرتے کہ آپ کے سامنے میں کیا زبان کھول سکتا ہوں۔ فرماتے کہ والدہ کا یہی حکم ہے۔" اکثر ایسا ہوتا کہ عمرو کو مسئلہ کا جواب نہ آتا۔ امام صاحب سے درخواست کرتے کہ "آپ مجھکو بتا دیں۔ میں اُسی کو آپ کے سامنے دُہرا دوں۔"

کبھی کبھی اصرار کرتیں کہ میں خود چلکر پوچھوں گی۔ خچر پر سوار ہوتیں۔ امام صاحب پاپیادہ ساتھ ہوتے۔ خود مسئلہ کی صورت بیان کرتیں اور اپنے کانوں سے جواب سُن لیتیں تب تسکین ہوتی۔ ایک دفعہ امام صاحب سے پوچھا کہ یہ صورت پیش آئی ہے۔ مجھکو کیا کرنا چاہئے۔

امام صاحب نے جواب بتایا۔ بولیں کہ تمہاری سند نہیں۔ زرعہ واعظ تصدیق کریں تو مجھکو اعتبار آئے۔" امام صاحب اِن کو لیکر زرعہ کے پاس گئے۔ اور مسئلہ کی صورت بیان کی۔ زرعہ نے کہا آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپ کیوں نہیں بتا دیتے۔ امام صاحب نے فرمایا میں نے یہ فتوے دیا تھا۔ زرعہ نے کہا بالکل صحیح ہے۔ یہ سُنکر اُنکو تسکین ہوئی اور گھر واپس آئیں۔

ابن ہبیرہ نے جب امام صاحب کو بُلا کر میر منشی مقرر کرنا چاہا اور انکار کے جرم پر دُرے لگوائے اُس وقت امام کی والدہ زندہ تھیں۔ اُن کو نہایت صدمہ ہوا۔ امام صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مجھکو اپنی تکلیف کا چنداں خیال نہ تھا۔ البتہ یہ رنج ہوتا تھا کہ میری تکلیف کی وجہ سے والدہ کے دل کو صدمہ پہنچتا ہے۔"

رقت طبع

امام صاحب اگرچہ نہایت رقیق القلب تھے اور کسی کو تکلیف اور رنج کی حالت میں دیکھتے تو بیتاب ہو جاتے۔ ایک دفعہ مسجد میں بیٹھے تھے کسی نے آکر کہا کہ فلاں شخص کوٹھے سے گر پڑا۔ دفعۃً اِس زور سے چیخ اُٹھے کہ مسجد میں تہلکہ پڑ گیا۔ حلقۂ درس چھوڑ کر برہنہ پا دوڑے

[1] یہ واقعہ بہت سی کتابوں میں مختلف طریقہ سے مذکور ہے ہم نے کتاب الاغانی و ابن خلکان و عقود الجمان کی روایت اختیار کی ہے۔

اور اُس کے گھر پر جا کر بہت کچھ غمخواری اور ہمدردی کی۔ جب تک وہ اچھا نہ ہو اروزانہ صبح کو جاتے اور اُس کی تیمار داری کرتے۔ تاہم اپنے اوپر کوئی مصیبت آن پڑتی تو اس استقلال سے برداشت کرتے کہ لوگوں کو تعجب ہوتا۔ عمّال اور اہل دربار کے ہاتھ سے اکثر اُن کو تکلیفیں پہنچیں مگر کبھی اُنکے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی۔ نہایت مضبوط دل رکھتے تھے۔ اور ضبط و استقلال گویا مایہ خمیر تھا۔

استقلال

ایک دن جامع مسجد میں درس دے رہے تھے مستفیدوں اور ارادتمندوں کا مجمع تھا۔ اتفاقاً چھت سے ایک سانپ گرا اور امام کی گود میں آیا۔ تمام لوگ گھبرا کر بھاگ گئے مگر وہ اُسی اطمینان سے بیٹھے رہے۔ امام مالک کو بھی ایکبار ایسا ہی اتفاق پیش آیا۔ اور وہ اُنکی تاریخ زندگی کا مشہور اور دلچسپ واقعہ ہے۔

بات نہایت کم کرتے اور غیر ضروری باتوں میں کبھی دخل نہ دیتے۔ درس میں بھی معمول تھا کہ شاگرد جس میں نہایت آزادی سے بحثیں کرتے۔ آپ چپ بیٹھے سُنا کرتے۔ جب بحث زیادہ بڑھ جاتی اور کسی بات کا تصفیہ نہ ہوتا تو قول فیصل بیان کر دیتے کہ سب کو تشفی ہو جاتی۔ غیبت سے پرہیز رکھتے اس نعمت کا شکر ادا کرتے کہ خدا نے میری زبان کو اس آلودگی سے پاک رکھا۔ ایک شخص نے کہا حضرت! لوگ آپ کی شان میں کیا کچھ نہیں کہتے مگر آپ سے ملتے کسی کی بُرائی نہیں سُنی۔ فرمایا ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء امام سفیان ثوری سے کسی نے کہا۔ ابو حنیفہ کو ملتے کسی کی غیبت کرتے نہیں سُنا۔ اُنھوں نے کہا کہ "ابو حنیفہ ایسے بیوقوف نہیں کہ اپنے اعمال صالح کو آپ برباد کریں"۔

حفظ لسان

قسم کھانی بُرا جانتے تھے اور اُس سے بہت پرہیز کرتے تھے۔ عہد کر لیا تھا کہ اتفاقاً کبھی اس خطا کا مرتکب ہونگا تو ایک درہم کفارہ دونگا۔ اتفاق سے بھول کر کسی موقع پر قسم کھالی اُسکے بعد عہد کیا کہ اب بجائے درہم کے دینار دونگا۔

نہایت مرتاض اور زاہد تھے۔ ذکر و عبادت میں اُنکو مزہ آتا تھا اور بڑے ذوق و خلوص سے ادا کرتے تھے۔ اِس باب میں اُنکی شہرت ضرب المثل ہو گئی تھی۔ علامۂ ذہبی نے لکھا ہے کہ "اُنکی پرہیزگاری اور عبادت کے واقعات تواتر کی حد کو پہنچ گئے ہیں"۔ اکثر نماز میں یا قرآن پڑھنے کے وقت رقت طاری ہوتی اور گھنٹوں رویا کرتے۔ ابراہیم بصری کا بیان ہے کہ ایک دفعہ نماز فجر میں امام ابو حنیفہ کے ساتھ شریک تھا۔ امام نماز نے یہ آیت پڑھی ولا تحسبن اللہ غافلا عما یعمل الظالمون یعنے خدا کو ظالموں کی کردار سے بے خبر نہ سمجھنا۔ امام ابو حنیفہ پر ایسی حالت طاری ہوئی کہ سارا بدن کانپنے لگا۔ زایدہ کہتے ہیں کہ مجھکو ایک ضروری مسئلہ

ذکر و عبادت

دریافت کرنا تھا امام ابوحنیفہ کے ساتھ نماز عشا میں شریک ہوا اور منتظر رہا کہ نوافل سے فارغ ہوں تو دریافت کروں وہ قرآن پڑھتے پڑھتے اِس آیت پر پہنچے ووقنا عذاب السموم بار بار اِس آیت کو پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی اور وہ یہی آیت پڑھتے رہے۔ ایک بار نماز میں یہ آیت پڑھی بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر" یعنے قیامت گنہگاروں کا وعدہ گاہ ہے اور قیامت سخت مصیبت کی چیز اور ناگوار چیز ہے"۔ اِسی آیت میں رات ختم ہوگئی بار بار پڑھتے تھے اور روتے جاتے تھے۔

یزید بن کمیت ایک مشہور عابد اور امام صاحب کے ہمعصر تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ میں ایک دفعہ نماز عشا میں امام ابوحنیفہ کے ساتھ شریک تھا۔ امام نماز نے اذا زلزلت پڑھی۔ لوگ نماز پڑھ کر چلے گئے۔ میں ٹھیر ا رہا۔ امام ابوحنیفہ کو دیکھا کہ بیٹھے ٹھنڈی سانسیں بھر رہے ہیں یہ دیکھ کر میں اُٹھ آیا کہ اُنکے اوقات میں خلل نہ ہو۔ صبح کو مسجد میں گیا تو دیکھا کہ غمزدہ بیٹھے ہیں ڈاڑھی ہاتھ میں ہے اور بڑی رقت سے کہہ رہے ہیں " اے وہ! جو ذرہ بھر نیکی اور ذرہ بھر بدی کا دونوں کا بدلہ دیگا۔ نعمان اپنے غلام کو آگ سے بچانا"۔

ایک دن بازار میں چلے جاتے تھے۔ ایک لڑکے کے پاؤں پر پانوں پڑ گیا۔ وہ چیخ اُٹھا اور کہا کہ خدا سے نہیں ڈرتا۔ امام کو غش آگیا۔ مسعر بن کدام ساتھ تھے۔ اُنہوں نے سنبھالا۔ ہوش میں آئے تو پوچھا کہ ایک لڑکے کی بات پر اسقدر بیقرار ہوجانا کیا تھا؟ فرمایا کیا عجب کہ اُسکی آواز غیبی ہدایت ہو"۔ عبرت پذیری

ایک دفعہ حسب معمول دوکان پر گئے۔ نوکر نے کپڑوں کے ساتھ تھان نکال کر رکھے۔ اور تفاؤل کے طور پر کہا۔ خدا ہم کو جنت دے۔ امام صاحب پر رقت طاری ہوئی اور اسقدر روئے کہ شانے تر ہوگئے۔ نوکر سے کہا دوکان بند کردو۔ آپ چہرہ پر رومال ڈال کر کسی طرف نکل گئے۔ دوسرے دن دوکان پر گئے تو نوکر سے کہا۔ بھائی! ہم اِس قابل کہاں ہیں کہ جنت کی آرزو کریں۔ یہی بہت ہے کہ عذاب الٰہی میں گرفتار نہ ہوں"۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ" قیامت کے دن اگر مجھ سے مواخذہ ہو نہ انعام ملے۔ تو میں بالکل راضی ہوں"

ایک دفعہ کسی کو مسئلہ بتا رہے تھے ایک شخص نے کہا ابوحنیفہ! خدا سے ڈر کر فتوے دیا کرو۔ امام صاحب پر اس کا اسقدر اثر ہوا کہ چہرہ کی رنگت زرد پڑ گئی۔ اُس شخص کی طرف مخاطب ہوئے۔ اور کہا بھائی! خدا تم کو جزائے خیر دے۔ اگر مجھکو یہ یقین نہ ہوتا کہ خدا مجھ سے مواخذہ کرے گا کہ تو نے جان کر علم کو کیوں چھپایا۔ تو میں ہرگز فتوے نہ دیتا"۔ کوئی مسئلہ مشکل آجاتا اور جواب نہ معلوم ہوتا تو متردد ہوتے کہ غالباً میں کسی گناہ کا مرتکب ہوا۔ یہ اُسی کی شامت ہے

پھر وضو کرکے نماز پڑھتے۔ اور استغفار کرتے۔ فضیل بن عیاض کہ مشہور صوفی گذرے ہیں۔ اُنسے کسی نے یہ حکایت بیان کی۔ بہت روئے اور کہا "ابوحنیفہ کے گناہ کم تھے۔ اس لئے اُنکو یہ خیال ہوتا تھا۔ جو لوگ گناہوں میں غرق ہیں اُنپر ہزار آفتیں آتی ہیں۔ اور مطلق خبر نہیں ہوتی کہ یہ غیبی تنبیہ ہے"

معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد مسجد میں درس دیتے۔ دور دور سے استفتے آئے ہوتے۔ اُنکے جواب لکھتے پھر تدوین فقہ کی مجلس منعقد ہوتی۔ بڑے بڑے نامور شاگردوں کا مجمع ہوتا جو مسائل اتفاق رائے سے طے ہوتے قلمبند کرلئے جاتے۔ نماز ظہر پڑھ کر گھر آتے۔ گرمیوں میں ہمیشہ ظہر کے بعد سو رہتے۔ نماز عصر کے بعد کچھ دیر تک درس و تعلیم کا مشغلہ رہتا۔ باقی دوستوں سے ملنے ملانے۔ بیماروں کی عیادت۔ ماتم پرسی۔ غریبوں کی خبرگیری میں صرف ہوتا۔ مغرب کے بعد پھر درس کا سلسلہ شروع ہوتا اور عشا تک رہتا۔ نماز عشا پڑھ کر عبادت میں مشغول ہوتے اور اکثر رات رات بھر نہ سوتے۔ جاڑوں میں مغرب کے بعد مسجد ہی میں سو رہتے اور قریباً دس بجے اُٹھ کر نماز عشا پڑھتے۔ پھر تمام رات تہجد اور ورد و وظائف میں گذرتی۔ کبھی کبھی دوکان پر بیٹھے اور وہیں یہ تمام مشاغل انجام پاتے۔

ذہانت اور طباعی۔ فتوے اور مناظرات نصائح اور دلپذیر باتیں

جو چیز امام صاحب کی قوت۔ ایجاد۔ جدت طبع۔ دقت نظر۔ وسعت معلومات۔ غرض اُنکے تمام کمالات علمی کا آئینہ ہے۔ وہ علم فقہ ہے۔ جس کی ترتیب و تدوین میں اُنکو وہ پایہ حاصل ہے جو ارسطو کو منطق اور اقلیدس کو ہندسہ میں۔ لیکن اُسپر تفصیلی بحث کرنے کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ اسی ضرورت سے ہمنے اپنی کتاب کا دوسرا حصہ۔ اس بحث کے لئے خاص کردیا ہے اس موقع پر صرف وہ واقعات لکھتے ہیں جو امام صاحب کی علمی تاریخ کے عام واقعات ہیں لیکن غور سے دیکھو تو وہ بھی بجائے خود اصول ہیں جنپر سینکڑوں مسائل کی بنیاد قائم ہے۔

اس مقام پر یہ کہدینا ضرور ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مناظرات اور نکتہ آفرینیوں کے متعلق بہت بے سروپا افسانے شہرت پکڑ گئے ہیں اور طرہ یہ کہ بعض مشہور مصنفوں نے بغیر تحقیق و تنقید کے اُنکو اپنی تالیفات میں نقل کردیا جس سے عوام کو اپنے غلط خیالات کے لئے ایک دستاویز ہاتھ آگئی۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی فن میں کمال کے ساتھ شہرت عام حاصل کرتا ہے۔ اُس کی نسبت اچھی یا بُری سینکڑوں روائتیں خود بخود پیدا ہوجاتی ہیں اور بعض حالتوں میں اسقدر عام زبانوں پر قبضہ کرلیتی ہیں کہ خواص تک کو اُن پر تواتر کا دھوکا ہوتا ہے

لطف یہ کہ معتقدین - جوش اعتقاد میں ایسی باتیں بیان کر جاتے ہیں جسکو وہ مدح سمجھتے ہیں اور در اصل ذم ہوتی ہے - اسیطرح مخالف - عیب و منقصت کی مثالیں پیش کرتا ہے - حالانکہ غور سے دیکھئے - تو ان واقعات سے بجائے اسکے کہ اُس شخص کی بُرائی ثابت ہو مدح کا پہلو نکلتا ہے - امام ابو حنیفہ بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں - بعض مصنفوں نے اُنکی ذہانت اور طباعی کے ذیل میں بہت سے ایسے قصے لکھدیئے ہیں - جن کو خدا نخواستہ ہم سچ تسلیم کریں تو عیاذاً باللہ امام صاحب کو حیلہ جو چالاک - مُتفنی - سخن ساز - ماننا پڑیگا - لیکن وہ روائتیں تاریخی اصول سے ثابت نہیں اور اسی وجہ سے اہل تحقیق خصوصاً محدثین نے اُنکے لکھنے سے ہمیشہ پرہیز کیا ہے - ہم بھی اُنکو قلم انداز کرتے ہیں - اور انہیں روائتوں پر اکتفا کرتے ہیں - جو بظن غالب ثابت اور صحیح ہیں -

اِسمیں شبہہ نہیں کہ امام صاحب کو اور ائمہ کی نسبت مناظرہ اور مباحثہ کے موقعے زیادہ پیش آئے - اُنہوں نے علوم شرعیہ کے متعلق بہت سے ایسے نکتے ایجاد کیئے تھے - جو عام طبیعتوں کی دسترس سے باہر تھے - اسلیئے ظاہر بینوں کا ایک بڑا گروہ جنمیں بعض مقدس سادہ دل بھی شامل تھے اُنکا مخالف ہوگیا تھا - اور ہمیشہ اُن سے بحث و مناظرہ کے لئے طیار رہتا تھا - امام صاحب کو بھی مجبوراً اُنکے شبہات رفع کرنے پڑتے تھے - اس اتفاقی سبب سے مناظرہ اور مباحثہ کا ایک وسیع سلسلہ قائم کر دیا تھا - لیکن امام صاحب کے مناظرات اسی پر محدود نہیں - مناظرہ اُسوقت درس کا ایک خاص طریقہ تھا - اور امام صاحب نے اکثر اساتذہ سے اِسی طریقہ پر تعلیم پائی تھی - عیون والحدائق کے مصنف نے اُن کے تذکرہ میں لکھا ہے - کہ "اُنہوں نے شعبی - طاؤس - عطاء سے مناظرات کیئے" یہ لوگ امام صاحب کے اساتذۂ خاص ہیں اور وہ اُن لوگوں کا نہایت ادب کرتے تھے - اس مناظرہ سے مقصود وہی درس کا مخصوص طریقہ ہے - جو اس عہد میں عموماً مروج تھا۵

رفع یدین کے مسئلہ میں امام اوزاعی سے مناظرہ

امام اوزاعی کہ اقلیم شام کے امام اور فقہ میں مذہب مستقل کے بانی تھے - مکہ معظمہ میں امام ابو حنیفہ سے ملے - اور کہا کہ "عراق والوں سے نہایت تعجب ہے کہ رکوع میں اور رکوع سے سر اُٹھانے کے وقت رفع یدین کرتے تھے" حالانکہ میں نے زہری سے اُنہوں نے سالم بن عبداللہ سے - اُنہوں نے عبداللہ بن عمرؓ سے سُنا ہے - کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان موقعوں پر رفع یدین کرتے تھے" امام ابو حنیفہ نے اُسکے مقابلہ میں حماد و ابراہیم - نخعی - علقمہ - عبداللہ بن مسعود کے سلسلہ سے حدیث روایت کی کہ آنحضرت صلعم اِن موقعوں پر رفع یدین نہیں فرماتے تھے" امام اوزاعی نے کہا "سبحان اللہ" میں تو زہری

۵؎ امام صاحب کے بعض مناظرات خطیب نے تاریخ بغداد میں، اور امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں علم آدم الاسماء لکھا [illegible]

سالم عبداللہ کے ذریعے سے حدیث بیان کرتا ہوں۔ آپ اِسکے مقابلہ میں۔ حماد۔ نخعی علقمہ کا نام لیتے ہیں۔" امام ابوحنیفہ نے کہا۔ میری رواۃ آپ کی رواۃ سے زیادہ فقیہ ہیں۔ اور عبداللہ بن مسعود کا رتبہ تو معلوم ہی ہے۔ اس لئے اُنکی روایت کو ترجیح ہے۔"

امام رازی نے اُس مناظرہ کو مناقب الشافعی میں نقل کیا ہے[1] اور گو واقعہ کی صحت سے انکار نہیں کر سکتے تاہم یہ نکتہ چینی کی ہے کہ حسی واقعات میں تفقہ کو کیا دخل ہے۔

اس اصول پر مفصل بحث کتاب کے دوسرے حصہ میں ہوگی۔ یہاں امام رازی کے حوالہ سے یہ مقصود ہے کہ اصل واقعہ صحیح ہے جس سے شافعیوں کو بھی انکار نہیں۔ اس مسئلہ کے متعلق امام محمد نے کتاب الحجج میں ایک لطیف بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ کہ ہماری روایت عبداللہ بن مسعود تک منتہی ہوتی ہے۔ اور فریقِ مخالف کی عبداللہ بن عمر تک اسلئے بحث کا تمام تر مدار اسپر آجاتا ہے کہ اِن دونوں میں کسکی روایت ترجیح کے قابل ہے۔ عبداللہ بن مسعود آنحضرتؐ کے زمانہ میں پوری عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اور جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے جماعت کی صف اول میں جگہ پاتے تھے۔ بخلاف اسکے عبداللہ بن عمر کا محض آغاز تھا اور اُنکو دوسری تیسری صف میں کھڑا ہونا پڑتا تھا اسلئے آنحضرتؐ کے حرکات و سکنات سے واقف ہونے کے جو موقعے عبداللہ بن مسعود کو ملسکے۔ عبداللہ بن عمر کو کیونکر حاصل ہو سکتے تھے امام محمد کا یہ طرز استدلال حقیقت میں اصول درایت پر مبنی ہے۔ امام ابوحنیفہ صاحب نے اپنی تقریر میں عبداللہ بن مسعود کی عظمت وشان کا جو ذکر کیا اُس میں اسی کی طرف اشارہ ہے

قرات خلف الامام

ایک دن بہت سے لوگ جمع ہو کر آئے۔ کہ قرأۃ خلف الامام کے مسئلہ میں، امام صاحب سے گفتگو کریں۔ امام صاحب نے کہا "اتنے آدمیوں سے میں تنہا کیونکر بحث کر سکتا ہوں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اس مجمع میں سے کسی کو انتخاب کرلیں، جو سب کی طرف سے اِس خدمت کا کفیل ہو۔ اور اُسکی تقریر۔ پورے مجمع کی تقریر سمجھی جائے۔" لوگوں نے منظور کیا۔ امام صاحب نے کہا "آپ نے یہ تسلیم کیا۔ تو بحث کا خاتمہ بھی ہو گیا آپ نے جسطرح ایک شخص کو سب کی طرف سے بحث کا مختار کر دیا۔ اسیطرح امام نماز بھی، تمام مقتدیوں کیطرف سے قرأت کا کفیل ہے۔"

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ امام نے ایک شرعی مسئلہ کو صرف۔ عقلی طور پر طے کر دیا بلکہ حقیقت میں یہ اُس حدیث کی تشریح ہے جسکو خود امام صاحب نے بسند صحیح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا ہے کہ من صلی خلف الامام فقرأۃ الامام قرءۃ لہ یعنے جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے۔ تو امام کی قرأت بھی اُسکی قرأت ہے۔"

یہ امام صاحب کی مختصات میں ہے کہ وہ مشکل مسئلہ کو ایسے عام فہم طریقہ سے سمجھا دیتے تھے کہ مخاطب

ایک خارجی سے گفتگو

کے ذہن نشین ہوجاتا تھا۔ اور بحث نہایت جلد اور آسانی سے طے ہوجاتی تھی۔ ایک دفعہ ضحاک خارجی جو خارجیوں کا ایک مشہور سردار تھا اور بنو اُمیہ کے زمانہ میں کوفہ پر قابض ہوگیا تھا۔ امام صاحب کے پاس آیا۔ اور تلوار دکھا کر کہا کہ "توبہ کرو" اُنھوں نے پوچھا کس بات سے ضحاک نے کہا تمہارا عقیدہ ہے۔ کہ علی (علیہ السلام) نے معاویہ کے جھگڑے میں ثالثی مان لی تھی۔ حالانکہ جب وہ حق پر تھے تو ثالث ماننے کے کیا معنے"۔ امام صاحب نے فرمایا کہ "اگر میرا قتل مقصود ہے۔ تو اور بات ہے۔ ورنہ اگر تحقیقِ حق منظور ہے۔ تو مجھکو تقریر کی اجازت دو"۔ ضحاک نے کہا میں بھی مناظرہ ہی چاہتا ہوں۔ امام صاحب نے فرمایا۔ اگر بحث آپس میں نہ طے ہو۔ تو کیا علاج؟ ضحاک نے کہا ہم دونوں ایک شخص کو منصف قرار دیں۔ چنانچہ ضحاک ہی کے ساتھیوں میں سے ایک شخص انتخاب کیا گیا۔ کہ دونوں فریق کی صحت و غلطی کا تصفیہ کرے۔ امام صاحب نے فرمایا "یہی تو حضرت علی علیہ السلام نے بھی کیا تھا۔ پھر اُن پر کیا الزام ہے"۔ ضحاک دم بخود ہوگیا۔ اور چپکا اُٹھکر چلا آیا۔

اِسی ضحاک نے ایکبار کوفہ پہنچکر قتل عام کا حکم دیدیا۔ امام صاحب کو خبر ہوئی۔ دوڑے گئے اور پوچھا کہ "آخر ان لوگوں نے کیا جرم کیا ہے"۔ اُسنے کہا یہ سب مُرتد ہوگئے ہیں۔ امام صاحب نے فرمایا "پہلے ان لوگوں کا کچھ اور مذہب تھا جسکو انہوں نے چھوڑ دیا۔ یا ہمیشہ سے یہی مذہب رکھتے تھے جو اب رکھتے ہیں؟" ضحاک نے کہا۔ کیا کہا پھر کہنا! امام صاحب نے زیادہ وضاحت سے بیان کیا۔ ضحاک نے کہا۔ بے شبہہ میری خطا تھی۔ اُسیوقت حکم دیا۔ کہ "تلواریں نیام میں کرلیجائیں"۔

قتادہ بصری۔ جنکا مختصر حال امام صاحب کے اساتذہ کے ذکر میں ہم لکھ آئے ہیں۔ کوفہ میں آئے۔ اور اشتہار دیدیا کہ "مسائلِ فقہ میں جسکو جو پوچھنا ہو پوچھے۔ میں ہر مسئلہ کا جواب دونگا"۔ چونکہ وہ مشہور محدث اور امام تھے۔ بڑا مجمع ہوا۔ جوق جوق لوگ آتے تھے۔ اور مسئلے دریافت کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہ بھی موجود تھے کھڑے ہوکر پوچھا کہ "ایک شخص سفر میں گیا۔ برس دوبرس کے بعد اُسکے مرنے کی خبر آئی۔ اُسکی بیوی نے دوسرا نکاح کرلیا۔ اور اُس سے اولاد ہوئی۔ چند روز کے بعد وہ شخص واپس آیا۔ اولاد کی نسبت اُسکو انکار ہے کہ میری صلب سے نہیں ہے زوج ثانی دعویٰ کرتا ہے۔ کہ میری ہے تو آیا دونوں اُس عورت پر زنا کا الزام لگاتے ہیں یا صرف وہ شخص جو ولدیت سے انکار کرتا ہے"۔ قتادہ نے کہا "یہ صورت پیش بھی آئی ہے"۔ امام نے کہا نہیں۔ لیکن علما کو پہلے طیار رہنا چاہیئے کہ وقت پر تردد نہ ہو۔ قتادہ کو فقہ سے زیادہ تفسیر میں دعوےٰ تھا۔ بولے کہ ان مسائل کو رہنے دو۔ تفسیر کے متعلق جو پوچھنا ہو پوچھو۔ امام ابوحنیفہ نے کہا۔ اس آیت کے کیا معنے ہیں قال الذی عندہ علم من الکتاب انا اٰتیک بہ قبل ان یرتد الیک طرفک یہ وہ قصہ ہے

حضرت سلیمان علیہ السلام نے درباریوں سے بلقیس کے تخت لانے کی فرمائش کی۔ اور ایک شخص نے جو غالباً آصف بن برخیا۔ حضرت سلیمان کے وزیر تھے۔ دعوے کیا کہ میں لادونگا اہل کتاب کی روایت ہے کہ آصف بن برخیا اسم اعظم جانتے تھے۔ جسکی تاثیر سے ایک دم میں شام سے یمن پہنچکر تخت اُٹھا لائے۔ یہی روایت عام مسلمانوں میں پھیل گئی تھی۔ اور اُسی کے مطابق اس آیت کا مطلب لگایا جاتا تھا۔ قتادہ نے بھی یہی معنے بیان کئے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا حضرت سلیمان خود بھی اسم اعظم جانتے تھے یا نہیں؟ قتادہ نے کہا "نہیں"۔ امام صاحب نے کہا۔ کیا آپ اس بات کو جائز رکھتے ہیں۔ کہ نبی کے زمانہ میں ایسا شخص موجود ہو۔ خود نبی سے زیادہ علم رکھتا ہو؟ قتادہ کچھ جواب نہ دیسکے۔ اور کہا کہ عقاید کے متعلق پوچھو۔ امام صاحب نے کہا "آپ مومن ہیں" اکثر محدثین اپنے آپ کو مومن کہتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اور اسکو احتیاط میں داخل سمجھتے تھے۔ حسن البصری سے ایک شخص نے یہی سوال کیا تھا۔ جسکے جواب میں اُنہوں نے کہا کہ "انشاءاللہ" پوچھنے والے نے کہا کہ "انشاءاللہ" کا کیا محل ہے؟ فرمایا کہ "میں اپنے تئیں مومن تو کہوں مگر ڈرتا ہوں کہ خدا یہ نہ کہدے کہ تو جھوٹ کہتا ہے" قتادہ نے یہی امام ابوحنیفہ کے سوال کا یہی جواب دیا۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک قسم کی وہم پرستی ہے۔ ایمان اعتقاد کا نام ہے جو شخص خدا اور رسول پر اعتقاد رکھتا ہے وہ قطعاً مومن ہے اور اسکو سمجھنا چاہیئے کہ میں مومن ہوں۔ البتہ اگر اسمیں شک ہے تو قطعی کافر ہے۔ اور پھر انشاءاللہ کہنا بھی بیکار ہے۔ امام ابوحنیفہ نے اس عام غلطی کو مٹانا چاہا۔ قتادہ سے پوچھا آپ نے یہ قید کیوں لگائی۔ اُنہوں نے کہا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا۔ کہ "مجھکو اُمید ہے۔ کہ خدا قیامت کے دن میرے گناہوں کو معاف کردے"۔ امام ابوحنیفہ نے کہا خدا نے حضرت ابراہیم سے جب یہ سوال کیا کہ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ تو انہوں نے جواب میں "بلیٰ" کہا تھا۔ یعنی ہاں میں مومن ہوں۔ آپ نے حضرت ابراہیم کے اس قول کی کیوں تقلید نہ کی۔ قتادہ ناراض ہوکر اُٹھے اور گھر میں چلے گئے۔[1]

یحییٰ بن سعید الانصاری۔ کوفہ کے قاضی تھے۔ اور منصور عباسی کے دربار میں بڑا جاہ و اعتبار رکھتے تھے۔ تاہم کوفہ میں اُنکا وہ اثر قائم نہ ہو سکتا تھا جو امام ابوحنیفہ صاحب کا تھا۔ اس پر ان کو تعجب ہوتا تھا۔ اور لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ "کوفہ والے بھی عجب سادہ دل ہیں۔ تمام شہر ایک شخص کے اشاروں پر حرکت کرتا ہے"۔ امام ابوحنیفہ نے ابویوسف و زفر اور چند ممتاز شاگردوں کو بھیجا۔ کہ قاضی یحییٰ سے مناظرہ کریں۔ امام ابویوسف نے تقریر شروع کی مسئلہ یہ تھا۔ کہ یحییٰ ابن سعید سے مناظرہ

[1] اس مناظرہ کو خطیب نے تاریخ بغداد میں اور حافظ ابوالمحاسن نے عقود الجمان میں کسیقدر اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے ۱۲

ایک غلام اگر دو شخصوں میں مشترک ہو اور صرف ایک شخص آزاد کرنا چاہے تو کر سکتا ہے یا نہیں؟ قاضی یحییٰ نے کہا "نہیں کر سکتا۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے لا ضرر ولا ضرار یعنے وہ کام جس سے کسی کو ضرر پہنچے جائز نہیں۔ صورت زیر بحث میں چونکہ دوسرے شریک کا ضرر ہے۔ اسلئے شریک اول ایسے فعل کا مجاز نہیں ہو سکتا"۔ امام ابو یوسف نے کہا۔ اگر دوسرا شریک آزاد کرے؟ قاضی یحییٰ بولے۔ تب جائز ہے اور غلام آزاد ہو جائیگا۔ امام یوسف نے کہا "آپ نے خود اپنے قول کی مخالفت کی۔ کیونکہ آپ کے نزدیک ایک شریک کے آزاد کرنے سے غلام آزاد نہیں ہوتا۔ یعنے اُسیطرح غلام کا غلام رہتا ہے۔ صورت مذکور میں جب ایک شریک نے آزاد کیا۔ تو آپ کے نزدیک اُسکا یہ فعل بالکل بے اثر ہے یعنے وہ اسیطرح غلام باقی رہا جیسا پہلے تھا۔ اب صرف دوسرے شریک کے آزاد کرنے سے کیونکر آزاد ہو سکتا ہے"؟

قاضی ابن ابی لیلی کے فیصلہ پر نکتہ چینی

محمد بن عبد الرحمن جو زیادہ تر ابن ابی لیلےٰ کے لقب سے مشہور ہیں۔ بڑے مشہور فقیہ اور صاحب الرائے تھے۔ ۳۳ برس کوفہ میں منصب قضا پر مامور رہے۔ امام ابو حنیفہ اور اُن میں کسیقدر شکر رنجی تھی۔ جسکی وجہ یہ تھی۔ کہ فیصلوں میں وہ غلطی کرتے تھے تو امام صاحب اُسکی اصلاح کرنی چاہتے تھے۔ یہ اُنکو ناگوار معلوم ہوتا تھا۔ لیکن امام صاحب اظہار حق پر مجبور تھے قاضی صاحب مسجد میں بیٹھکر الفصال مقدمات کیا کرتے تھے ایک دن کام سے فارغ ہو کر مجلس قضا سے اُٹھے۔ راہ میں ایک عورت کو دیکھا کہ کسی سے جھگڑ رہی ہے کھڑے ہو گئے اثناء گفتگو میں عورت نے اُس شخص کو یا ابن الزانیین کہدیا یعنی "اے زانی او زانیہ کے بیٹے" قاضی صاحب نے حکم دیا کہ عورت گرفتار کر لیجائے۔ پھر مجلس قضا میں واپس آئے اور حکم دیا کہ عورت کو کھڑی کر کے درے لگائیں۔ اور دو حد ماریں۔ امام حنیفہ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ فرمایا کہ قاضی صاحب نے اس فیصلہ میں چند غلطیاں کیں۔ مجلس قضا سے اُٹھکر واپس آئے۔ اور دوبارہ اجلاس کیا۔ یہ آئین عدالت کے خلاف ہے مسجد میں حد مارنے کا حکم دیا۔ حالانکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے۔ عورت کو بٹھا کر حد مارنی چاہیئے۔ قاضی صاحب نے اِسکے خلاف کیا۔ ایک لفظ سے ایک ہی حد لازم آتی ہے۔ اور دو حدیں لازم بھی آئیں۔ تو ایک ساتھ دونوں کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔ ایک حد کے بعد مجرم کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ کہ زخم بالکل بھر جائیں۔ پھر دوسرے حد کی تعمیل ہو سکتی ہے جسکو گالی دی گئی۔ اُس نے جب دعوے نہیں کیا۔ تو قاضی صاحب کو مقدمہ قائم کرنے کا کیا اختیار تھا"۔ قاضی ابن ابی لیلی نہایت برہم ہوئے۔ اور گورنر کوفہ سے جا کر شکایت کی۔

کہ ابوحنیفہ نے مجھکو تنگ کر رکھا ہے۔ گورنر نے حکم بھیجدیا۔ کہ ابوحنیفہ فتوے نہ دینے پائیں۔ امام صاحب اگرچہ حق کے خلاف کسی حاکم و امیر کے حکم کی پروا نہیں کرتے تھے تاہم چونکہ فتوے دینا فرض کفایہ تھا اور کوفہ میں اور بہت سے علما موجود تھے۔ اسلئے حاکم وقت کی اطاعت کو مقدم رکھا اور بغیر کسی عذر کے حکم کی تعمیل کی۔ ایک دن گھر میں بیٹھے تھے۔ انکی لڑکی نے مسئلہ پوچھا کہ میں آج روزہ سے ہوں۔ دانتوں سے خون نکلا۔ اور تھوک کے ساتھ گلے سے اُتر گیا روزہ جاتا رہا یا باقی ہے؟" امام صاحب نے فرمایا کہ جان پدر۔ اپنے بھائی حماد سے پوچھ۔ میں فتوے دینے سے منع کر دیا گیا ہوں" مورخ ابن خلکان نے اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے۔ کہ" اطاعت حکم اور امانت کی۔ اس سے بڑھکر کیا مثال ہو سکتی ہے[1]" چند روز کے بعد گورنر کوفہ کو اتفاق سے فقہی مسائل میں مشکلات پیش آئیں۔ اور امام ابوحنیفہ کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ جسکی وجہ سے امام صاحب کو پھر فتوے دینے کی عام اجازت حاصل ہو گئی۔

امام صاحب کے مناظرات میں کہیں کہیں ہم اُس ادعا اور جوش مقابلہ کا اثر پاتے ہیں۔ جو بظاہر انکی تواضع اور بےنفسی کے خلاف ہے لیکن یہ انسانی جذبات ہیں جن سے کوئی شخص بری نہیں ہو سکتا۔ ہمنے امام شافعی۔ امام مالک۔ امام بخاری۔ امام مسلم اور بڑے بڑے ایمہ کے مناظرات کتابوں میں پڑے ہیں۔ اُن میں اس سے زیادہ ادعا اور حوصلہ مندی کا زور پایا جاتا ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ اگر اس قسم کی باتیں بزرگوں کے حالات میں مذکور نہ ہوتیں تو ہمکو شبہہ ہوتا کہ تذکرہ نویسوں نے اُن بزرگوں کی اصلی تصویر نہیں دکھائی ہے۔ بلکہ اپنی خوش اعتقادیوں کا خاکہ کھینچا ہے۔ ایک حکیم نے نہایت صحیح کہا ہے کہ"کسی نامور یا مقتدا کے حالات لکھو۔ تو اُسکے وہ خصائل بھی ضرور دکھاؤ جنمیں انسانی فطرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس سے لوگوں کو اچھے کاموں میں اُنکی تقلید کی خواہش پیدا ہوگی۔ بخلاف اِسکے اگر بالکل فرشتہ بنا کر پیش کروگے۔ تو لوگ شاید اُنکی پرستش کرنے پر آمادہ ہو جائیں لیکن اُنکی ریس کرنے کا خیال ہرگز نہ پیدا ہوگا۔ وہ سمجھیں گے کہ یہ شخص انسانی دائرہ سے باہر تھا ہم انسان ہو کر کیونکر اُسکی تقلید کر سکتے ہیں"

ایک دن حسن اتفاق سے۔ امام سفیان ثوری۔ قاضی ابن ابی لیلی۔ شریک۔ امام ابوحنیفہ ایک مجلس میں جمع تھے۔ شائقین علم کو اس سے عمدہ کیا موقع ملسکتا تھا۔ ایک شخص نے آکر مسئلہ پوچھا۔ کہ چند آدمی ایک جگہ مجتمع تھے۔ دفعتہً ایک سانپ نکلا۔ اور ایک شخص کے بدن پر چڑھنے لگا۔ اُس نے گھبرا کر پھینکدیا۔ وہ دوسرے شخص پر جا گرا۔ اُس نے بھی اضطراب میں

[1] ابن خلکان۔ ترجمہ محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلی۔

ایسا ہی کیا۔ یوں ہی ایک دوسرے پر پھینکتے رہے۔ یہانتک کہ اخیر شخص کو اُسنے کاٹا۔ اور وہ مرگیا دیت کس پر لازم آئیگی؟" یہ فقہ کا ایک دقیق مسئلہ تھا۔ سب کو تامل ہوا۔ کسی نے کہا سب کو دیت دینی ہوگی۔ بعضوں نے کہا صرف پہلا شخص ذمہ دار ہوگا۔ سب کے سب مختلف الرائے تھے۔ اور باوجود بحث کے کچھ تصفیہ نہیں ہوتا تھا۔ امام ابوحنیفہ چپ تھے۔ اور مسکراتے جاتے تھے۔ آخر سب نے انکی طرف خطاب کیا کہ آپ بھی تو اپنا خیال ظاہر کیجئے۔ امام صاحب نے فرمایا جب پہلے شخص نے دوسرے پر پھینکا۔ اور وہ محفوظ رہا۔ تو پہلا شخص بری الذمہ ہوچکا۔ اسی طرح دوسرا اور تیسرا بھی بحث الگ ہے۔ تو صرف اخیر شخص کی نسبت ہے۔ اُسکی دو حالتیں ہیں۔ اگر اُسکے پھینکے کے ساتھ ہی سانپ نے اُس شخص کو کاٹا۔ تو اسپر دیت لازم آئیگی۔ اور اگر کچھ وقفہ ہوا تو یہ شخص بھی بری الذمہ ہوچکا۔ اب اگر سانپ نے اسکو کاٹا۔ تو اُسکی خود غفلت ہے۔ کہ اُسنے اپنی حفاظت میں جلدی اور تیزدستی کیوں نہ کی"۔ اس رائے سے سب نے اتفاق کیا۔ اور امام کی جودت طبع کی تحسین کی۔

رائے و تدبیر۔ عقل و فراست۔ ذہانت و طباعی۔ امام صاحب کے وہ مشہور اوصاف ہیں جنکو موافق و مخالف سب نے تسلیم کیا ہے۔ محمد انصاری کہا کرتے تھے۔ کہ "امام ابوحنیفہ کی ایک ایک حرکت یہاں تک کہ بات چیت۔ اُٹھنے بیٹھنے۔ چلنے پھرنے میں دانشمندی کا اثر پایا جاتا تھا۔ علی بن عاصم کا قول تھا۔ کہ اگر آدھی دنیا کی عقل ایک پلہ میں اور ابوحنیفہ کی عقل دوسرے پلہ میں رکھی جاتی۔ تو ابوحنیفہ کا پلہ بھاری رہتا۔ خارجہ بن مصعب کہا کرتے تھے کہ "میں کم و بیش ایک ہزار عالموں سے ملا ہوں۔ جنمیں۔ عاقل صرف تین چار شخص دیکھے ایک انمیں ابوحنیفہ تھے"۔

رائے تدبیر و ذہانت و طباعی

ہمارے تذکروں اور رجال کی کتابوں میں علما کے وہ اوصاف جنکا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ تیزی ذہن۔ قوت حافظہ۔ بے نیازی۔ تواضع۔ قناعت۔ زہد۔ اتقا۔ غرض اس قسم کے اوصاف ہوتے ہیں۔ لیکن عقل و رائے۔ فراست و تدبیر۔ کا ذکر تک نہیں آتا۔ گویا یہ باتیں۔ دنیا داروں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اسی بات کو علامہ ابن خلدون نے اس پیرایہ میں لکھا ہے۔ کہ "علما کا گروہ انتظام اور ریاست سے بالکل مناسبت نہیں رکھتا" اور یہ بالکل سچ ہے۔ حالانکہ اگر سچ پوچھئے تو علما میں ان اوصاف کی زیادہ ضرورت ہے۔ اسلام بخلاف اور مذہبوں کے۔ دین کے ساتھ دنیوی انتظامات کا بھی متقنن ہے خلفائے اوّلین کے حالات پڑھو۔ سیاست اور انتظام ملکی کے لحاظ سے تمام دنیا کے سلاطین اور فرمانرواؤں میں کون شخص اُنکا ہمسر کہا جاسکتا ہے؟

بے شبہہ اس خصوصیت کے اعتبار سے امام حنیفہ تمام فرقۂ علما میں ممتاز ہیں کہ وہ مذہبی امور کے ساتھ دنیوی ضرورتوں کے بھی اندازہ دان تھے۔ یہی بات ہے۔ کہ اُن کا مذہب سلطنت وحکومت کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اسلام میں سلطنت وحکومت کے جو بڑے بڑے سلسلے قائم ہوئے۔ مذہباً اکثر حنفی ہی تھے۔

امام ابوحنیفہ اگرچہ شاہی تعلقات سے آزاد رہے لیکن قوم اور ملک کے ساتھ اُنکے جو تعلقات تھے وہ خود ایک ملکی حیثیت رکھتے تھے جسکے فرائض کو اُنہوں نے اس دانائی اور ہوشمندی کے ساتھ انجام دیا جو ایک مدبر سلطنت کے شایان تھا۔ وہ اپنے ہمعصروں کیطرح اپنے تلامذہ کو یہ نہیں سکھاتے تھے۔ کہ زندگی کی ضروریات میں امیروں اور رئیسوں کی فیاضیوں کا مُنہ تکتے رہیں۔ وہ خود کسی کے دست نگر نہیں ہوئے۔ اور شاگردوں کو بھی اسی کی تعلیم کی۔ ہم نے اُنکے شاگردوں کی مفصل فہرست دیکھی ہے۔ اُنمیں اکثر ایسے لوگ ہیں جو حلقۂ درس سے اُٹھکر۔ ملکی عہدوں پر پہنچے۔ اور نہایت قابلیت و دیانت سے اپنی خدمتوں کو انجام دیا۔ قاضی ابو یوسف صاحب۔ جو ہرون الرشید کے عہد میں صیغہ قضا کے وزیر تھے۔ اور جنکی حسن تدبیر و انتظام نے اس صیغہ کو اس قدر وسیع۔ باقاعدہ مرتب کر دیا۔ اُس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور زمانۂ مابعد میں بھی اُس سے بڑھکر نہ ہو سکا۔ یہ امام ابوحنیفہ ہی کی صحبت کا فیض تھا۔

یہ ضرور ہے کہ ملکی تعلقات کے ساتھ مذہب اور اخلاق کے فرائض کو سنبھالنا نہایت مشکل ہوتا ہے لیکن امام صاحب اِس سے بیخبر نہ تھے۔ وہ شاگردوں کو ہمیشہ ایسی ہدایتیں کرتے تھے۔ جنکی پابندی سے دنیا و دین دونوں حاصل ہوں۔ جو اس آیت کی تفسیر ہے آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ قاضی ابو یوسف کو امام صاحب کی زندگی میں اگرچہ دربار سے کوئی تعلق نہیں پیدا ہوا تھا۔ تاہم اُنکی قابلیت اور امام صاحب کی تعلیم نے جو لیاقت اُنمیں پیدا کر دی تھی۔ اُسکے جوہر صاف نظر آتے تھے۔ اسی لحاظ سے امام صاحب نے اُنکو کچھ ہدایتیں لکھکر دیں۔ جو تمام مہمات دینی اور دنیوی کے لئے دستور العمل تھیں۔ یہ تحریر[1] کتابوں میں منقول ہے افسوس ہے کہ تطویل کے لحاظ سے ہم اُسکو تمامہا نہیں نقل کر سکتے۔ تاہم موقع اور مقام کی رعایت سے اُس کا انتخاب دکھانا ضرور ہے۔

اس تحریر میں پہلے سلطان وقت کے تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ بادشاہ کے پاس بہت کم آمد و رفت رکھنا۔ اُس سے ہر وقت اِسطرح پُرخطر رہنا جیسا انسان آگ سے

[1] اشباہ والنظائر کے اخیر میں یہ وصیت تمامہا مذکور ہے۔ اور میں نے اُسی سے التقاط کیا ہے۔ ۱۲

احتیاط رکھتا ہے۔ جب تک کوئی خاص ضرورت نہ ہو دربار میں نہ جانا۔ کہ اپنا اعزاز و وقار قائم
رہے۔ اگر اتفاق سے دربار میں ایسے لوگ موجود ہیں جنسے تمکو واقفیت نہ ہو تو اور بھی پرہیز
کرنا کیونکہ جب اُنکا رتبہ معلوم نہیں تو ممکن ہے۔ کہ مخاطبت اور گفتگو میں اُن سے جو برتاؤ
کیا جاوے اُنکی شان کے مناسب نہ ہو۔ وہ اگر تمسے زیادہ بلند رتبہ ہیں۔ اور تمنے اس کا
لحاظ نہیں کیا۔ تو بے تمیزی سمجھی جائے گی۔ اگر معمولی آدمی ہیں۔ اور تم نے زیادہ تعظیم و تکریم
کی۔ تو بادشاہ کی آنکھ میں تمہاری ذلت ہوگی۔ بادشاہ اگر تمکو عہدۂ قضا پر مقرر کرنا چاہے
تو پہلے دریافت کر لینا کہ وہ تمہارے طریقۂ اجتہاد سے موافق ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ سلطنت
کے دباؤ سے تمکو اپنی رائے کے خلاف عمل کرنا پڑے جس عہدہ اور خدمت کی تم میں قابلیت
نہ ہو اُسکو ہرگز نہ قبول کرنا۔"

ان ہدایتوں میں اگرچہ بادشاہ کی حرمت و توقیر کی بہت تاکید کی ہے لیکن اظہار حق کے
موقع پر پوری آزادی سے کام لیا ہے چنانچہ اخیر میں لکھتے ہیں کہ "اگر کوئی شخص شریعت میں
کسی بدعت کا موجد ہو تو علانیہ اُسکی غلطی کا اظہار کرنا۔ کہ اور لوگوں کو اُسکی تقلید کی جرأت
نہ ہو۔ اسبات کی کچھ پروا نہ کرنا۔ کہ وہ شخص جاہ و حکومت رکھتا ہے۔ کیونکہ اظہار حق میں خدا
تمہارا مددگار رہوگا۔ اور وہ اپنے دین کا آپ محافظ و حامی ہے۔ خود بادشاہ سے اگر کوئی نامناسب
حرکت صادر ہو تو صاف کہدینا۔ کہ گو میں عہدہ و خدمت کے لحاظ سے آپ کا مطیع ہوں۔
تاہم آپ کو آپ کی غلطی پر مطلع کر دینا میرا فرض ہے۔ پھر بھی تمانے تو تنہائی میں سمجھانا کہ آپکا
یہ فعل قرآن مجید اور احادیث نبوی کے خلاف ہے۔ اگر سمجھ گیا۔ تو خیر ورنہ خدا سے دعا کرنا
کہ اُسکی شر سے تمکو محفوظ رکھے۔"

زندگی کے معمولی کاروبار کے متعلق بھی نہایت عمدہ ہدایتیں کیئں ہیں۔ چنانچہ تحریر فرماتے
ہیں کہ "تحصیل علم کو سب پر مقدم رکھنا اس سے فراغت ہو چکے۔ تو جائز ذریعوں سے دولت
حاصل کرنا کیونکہ ایک وقت علم و دولت دونوں کی تحصیل نہیں ہو سکتی۔ پھر نکاح کرنا لیکن اُسوقت
جب یہ یقین ہو کہ اہل و عیال کی تمام ذمہ داریاں اُٹھا سکو گے۔ ایسی عورت سے شادی نہ کرنا
جو دوسرے شوہر سے اولاد رکھتی ہو۔ عام آدمیوں اور خصوصاً دولتمندوں سے کم میل جول
رکھنا ورنہ انکو گمان ہوگا۔ کہ تم اُن سے کچھ توقع رکھتے ہو۔ اور اس خیال سے وہ رشوت
دینے پر آمادہ ہوں گے۔ بازار میں جانا۔ دوکانوں پر بیٹھنا۔ راستہ یا مسجد میں کوئی چیز کھا لینے
شکایات۔ یا سقاؤں کے ہاتھ سے پانی پی لینا۔ ان باتوں سے نہایت احتراز رہے۔ کوئی
شخص مسئلہ پوچھے۔ تو صرف سوال کا جواب دو۔ اپنی طرف سے کچھ نہ بڑھاؤ۔ عقائد کے

متعلق عوام سے گفتگو نہیں کرنی چاہیئے۔ شاگردوں کے ساتھ ایسے خلوص اور محبت سے پیش آؤ کہ کوئی غیر دیکھے۔ تو سمجھے۔ کہ تمہاری اولاد ہیں۔ عام اور معمولی رتبہ کے لوگ مناظرہ کرنا چاہیں۔ تو احتراز کرو۔ کسی شہر میں جانا ہو۔ تو وہاں کے علماء فضلا سے اسطرح ملو۔ کہ انکو رقابت کا خیال نہ ہو۔ علمی تذکرہ آئے تو جو بات کہو خوب سوچ سمجھکر کہو اور وہی کہو۔ جسکا کافی ثبوت دے سکتے ہو۔ مناظرہ کے وقت نہایت جرأت و استقلال سے کام لو۔ ورنہ ورنہ دل میں ذرا بھی خوف ہوگا۔ تو خیالات مجتمع نرہ سکینگے۔ اور زبان میں لغزش ہوگی۔ جو لوگ داب مناظرہ سے واقف نہیں۔ یا مکابرہ کرنا چاہتے ہیں۔ اُن سے ہرگز گفتگو نہیں کرنی چاہیئے۔ مناظرہ کے وقت غصہ نہ کرنا چاہیئے۔ ہنسنا کم چاہیئے۔ زیادہ ہنسی سے دل افسردہ ہوتا ہے۔ جو کام کرو اطمینان اور وقار کے ساتھ کرو۔ کوئی شخص جب تک سامنے سے نہ پکارے کبھی جواب نہ دو۔ کیونکہ پیچھے سے پکارنا جانوروں کے لئے مخصوص ہے۔ رستہ چلو تو دائیں بائیں نہ دیکھو۔ حمام میں جاؤ۔ تو عام آدمیوں کی بہ نسبت زیادہ اُجرت دو صبح اور دوپہر کے وقت حمام میں نہ جاؤ۔ گفتگو میں سختی نہ ہو اور آواز بلند نہ ہونے پائے۔ کوئی چیز خریدنی ہو تو خود بازار نہ جاؤ بلکہ نوکر کو بھیجکر منگوالو۔ خانگی کاروبار دیانتدار نوکروں کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیئے۔ کہ تمکو اپنے مشاغل کے لئے کافی وقت اور فرصت ہاتھ آئے بادشاہ کے قریب سکونت نہ اختیار کرو۔ ہر بات سے بے پروائی اور بے نیازی ظاہر ہو اور فقر کی حالت میں بھی وہی استغنا قائم رہے۔ عام آدمیوں میں بیٹھکر وعظ نہ کہو۔ کیونکہ ایسے موقع پر واعظ اکثر جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتا ہے۔ شاگردوں میں کسی کو فقہ کے درس کی اجازت دو۔ تو خود بھی اُسکی درسگاہ میں شریک ہو کہ اُسکے متعلق رائے قائم کرسکو۔ وہ اگر کبھی غلطی کر جائے۔ تو بتا دو۔ ورنہ تمہارے چپ رہنے سے لوگوں کو گمان ہوگا۔ کہ اُس نے جو کہا صحیح کہا۔ فقہ کے سوا اور علوم کی مجلس ہو تو خود نجاؤ بلکہ اپنے معتمد دوستوں یا شاگردوں کو بھیجدو کہ وہ آکر تم سے پورے حالات بیان کریں"۔

ہر بات میں تقوے اور امانت کو پیش نظر رکھو۔ خدا کے ساتھ دل سے وہی معاملہ رکھو جو لوگوں کے سامنے ظاہر کرتے ہو۔ جسوقت اذان کی آواز آئے۔ فوراً نماز کے لئے طیار ہو جاؤ۔ ہر مہینہ میں دو چار دن روزہ کے لئے مقرر کرلو۔ نماز کے بعد ہر روز کسی قدر وظیفہ پڑھا کرو۔ قرآن کی تلاوت قضا نہ ہونے پائے۔ دنیا پر بہت نہ مائل ہو۔ اکثر قبرستان میں نکل جایا کرو۔ لہو ولعب سے پرہیز رکھو۔ ہمسایہ کی کوئی بُرائی دیکھو تو پردہ پوشی کرو۔ اہل بدعت سے بچتے رہو۔ نماز میں جب تک تمکو لوگ خود امام نہ بنائیں امام نہ بنو۔ جو لوگ

تم سے ملنے آئیں۔ اُن کے سامنے علمی تذکرہ کرو۔ اگر وہ اہلِ علم ہونگے۔ تو فائدہ اُٹھائیں گے ورنہ کم از کم اُنکو تم سے محبت پیدا ہوگی۔"

عبدالعزیز بن رواد کو خلیفہ نے دربار میں بُلایا۔ وہ امام صاحب کے شاگرد تھے۔ مشورہ کے لئے اِن کے پاس آئے۔ اور کہا۔ کہ "خلیفہ نے طلب کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اُس کے سامنے وعظ کہوں۔ مگر کیا کہوں۔ اور کس طریقہ سے کہوں اس میں آپ کی ہدایت چاہتا ہوں۔"

امام صاحب نے فرمایا۔ یہ کہنا کہ "اے امیر المومنین دنیا کے طلب کرنے کی تین غرضیں ہوسکتی ہیں۔ عزت۔ ملک۔ مال یہ سب آپ کو حاصل ہیں۔ اب تقوے اور عمل صالح بھی اختیار کیجئے کہ دنیا و آخرت دونوں دولتیں حاصل ہوں۔"

اس موقع پر امام صاحب کے حکیمانہ مقولے بھی سننے اور یاد رکھنے کے قابل ہیں فرمایا کرتے تھے کہ جس "شخص کو علم نے بھی معاصی اور فواحش سے نہ باز رکھا اُس سے زیادہ زیان کار کون ہوگا۔" "جو شخص علم دین میں گفتگو کرے اور اُسکو یہ خیال نہ ہو کہ ان باتوں کی بازپرس ہوگی وہ مذہب اور خود اپنے نفس کی قدر نہیں جانتا۔" "اگر علما خدا کے دوست نہیں ہیں۔ تو عالم میں خدا کا کوئی دوست نہیں۔" "جو شخص قبل از وقت ریاست کی تمنا کرتا ہے ذلیل ہوتا ہے۔" "جو شخص علم کو دنیا کے لئے سیکھتا ہے۔ علم اُس کے دل میں جگہ نہیں پکڑتا۔" "سب سے بڑی عبادت ایمان اور سب سے بڑا گناہ کفر ہے پس جو شخص افضل ترین عبادت کا پابند۔ اور بدترین معاصی سے محترز رہے۔ اُسکی مغفرت کی ہر حال اُمید کیجا سکتی ہے۔" "جو شخص حدیث سیکھتا ہے اور اُس سے استنباط مسائل نہیں کرتا وہ ایک عطار ہے جسکے پاس دوائیں ہیں لیکن یہ نہیں جانتا کہ کون کس مرض کے لئے ہے۔" "جو شخص علم کا مذاق نہیں رکھتا۔ اُسکے آگے علمی گفتگو کرنی اُسکو اذیت دینی ہے۔" "اپنے دوست (نفس) کے لئے گناہ جمع کرنے اور دشمن (ورثا) کے لئے مال فراہم کرنا کیسی غلطی ہے۔"

ایک شخص نے پوچھا فقہ کے حاصل ہونے میں کیا چیز معین ہوسکتی ہے۔ امام صاحب نے فرمایا "دلجمعی۔" اُسنے عرض کی کہ دلجمعی کیونکر حاصل ہو۔ ارشاد ہوا کہ "تعلقات کم کئے جائیں" پوچھا کہ تعلقات کیونکر کم ہوں۔ جواب دیا کہ "انسان ضروری چیزیں لیلے۔ اور غیر ضروری چھوڑ دے۔" ایکبار کسی نے سوال کیا کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی لڑائیوں کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔ فرمایا کہ قیامت میں جن باتوں کی پرسش ہوگی مجھکو ان کا ڈر لگا رہتا ہے ان واقعات کو خدا مجھسے نہ پوچھیگا۔ اسی لئے اُسپر توجہ کرنی کی ضرورت نہیں۔"

اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیئے۔ کہ وہ اس بحث کے متعلق اپنی ذاتی رائے نہیں رکھتے تھے خود اُنہی کا قول ہے کہ حضرت علیؓ کی نظیر اگر ہمارے سامنے موجود نہ ہوتی۔ تو ہم نہ بتا سکتے کہ باغیوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے۔ امام شافعی کا بھی یہی قول ہے۔ البتہ ان باتوں کو اسلام کا ایک ضروری مسئلہ قرار دینا۔ اور اُسپر بحثوں کا دفتر طیار کرنا ایک فضول کام ہے۔ اور اسی کی طرف امام صاحب نے اشارہ کیا ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص تحصیل علم کی غرض سے امام صاحب کے پاس حاضر ہوا اور سفارشی خط پیش کیا۔ امام صاحب نے فرمایا "علم میں سعی سفارش کا کام نہیں۔ علما کا خود فرض ہے کہ اُنکو جو کچھ آتا ہو دوسروں کو بھی بتائیں۔ علم کے دربار میں خاص وعام کی کوئی تفریق نہیں"

ایک دن۔ گورنر کوفہ نے کہا آپ ہم سے کیوں الگ رہتے ہیں۔ فرمایا "روٹی کا ایک ٹکڑا اور معمولی کپڑا امن وعافیت سے ملا جائے تو اُس عیش سے بہتر ہے جسکے بعد ندامت اُٹھانی پڑے" اسی مضمون کو ایک شاعر نے نہایت خوبی اور سادگی سے ادا کیا ہے وہ کہتا ہے۔

دو قرص نان اگر گندم است یا از جو ٭ سہ تا ئے جامۂ اگر کہنہ است یا خود نو ٭ چہار گوشۂ دیوار خود بخاطر جمع کہ کس نگوید ازیں جا بخیر و آنجا رو ٭ ہزار بار فزوں تر بہ نزد ابن یمین ٭ ز فر مملکت کیقباد و کیخسرو ٭

امام صاحب کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ لیکن تشبیب وغزل کی حیثیت سے نہیں بلکہ واعظ وپند کے طور پر۔ چنانچہ فرماتے ہیں ٭

ومن المروۃ للفتی ٭ ما عاش دار فاخرۃ ٭ فاشکر اذا اوتیتھا ٭ واعمل لدار الاخرۃ

یعنی "انسان جب تک زندہ ہے عزت وآبرو کے لئے اُسکو اچھا مکان چاہیئے۔ ایسا مکان نصیب ہو تو شکر کرنا چاہیئے اور عاقبت کے مکان کے لئے کوشش کرنی چاہیئے"

امام صاحب کی ذہانت اور طباعی عموماً ضرب المثل ہے یہانتک کہ اُنکا اجمالی ذکر بھی کہیں آجاتا ہے۔ تو ساتھ ہی یہ صفت بھی ضرور بیان کیجاتی ہے علامہ ذہبی نے عبر فی اخبار من غبر میں اُنکا ترجمہ نہایت اختصار کیساتھ لکھا ہے۔ تاہم اس فقرہ کو نہ چھوڑ سکے کہ کان من اذکیا بنی آدم یعنی "اولاد آدم میں جو نہایت ذکی گزرے ہیں۔ امام ابوحنیفہ اُنمیں شمار کیے جاتے ہیں" مشکل سے مشکل مسئلوں میں اُنکا ذہن اس تیزی سے لڑتا تھا کہ لوگ حیران رہجاتے تھے۔ اکثر موقعوں پر اُنکے ہمعصر جو معلومات کے لحاظ سے اُنکے ہمسر تھے موجود ہوتے تھے۔ اُنکو اصل مسئلہ بھی معلوم ہوتا تھا لیکن جو واقعہ درپیش ہوتا تھا اُس سے مطابق کر کے فوراً جواب بتا دینا امام صاحب ہی کا کام تھا۔

ایک شخص کسی بات پر اپنی بیوی سے ناراض ہوا اور قسم کھا کر کہا کہ "جب تک تو مجھ سے بولیگی میں تجھ سے کبھی نہ بولونگا"۔ عورت تند مزاج تھی اُسنے بھی قسم کھالی اور وہی الفاظ دوہرائے جو شوہر نے کہے تھے۔ اُسوقت تو غصہ میں کچھ نہ سوجھا مگر پھر خیال آیا تو دونوں کو نہایت افسوس ہوا۔ شوہر۔ امام سفیان ثوری کے پاس گیا اور صورت واقعہ بیان کی۔ سفیان نے کہا "قسم کا کفارہ دینا ہوگا۔ اس سے چارہ نہیں" وہ مایوس ہوکر اُٹھا اور امام ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ للٰلہ آپ کوئی تدبیر بتائیے۔ امام صاحب نے فرمایا جاؤ شوق سے باتیں کرو۔ کسی پر کفارہ نہیں ہے۔ امام سفیان ثوری کو معلوم ہوا تو نہایت برہم ہوئے اور امام ابوحنیفہ سے جاکر کہا کہ آپ لوگوں کو غلط مسئلے بتا دیا کرتے ہیں۔ امام صاحب نے اُس شخص کو بلا بھیجا اور کہا کہ تم دوبارہ واقعہ کی صورت بیان کرجاؤ۔ اُس نے اعادہ کیا۔ امام صاحب سفیان کیطرف مخاطب ہوئے اور کہا کہ میں نے پہلے جو کہا تھا۔ اب بھی کہتا ہوں۔ سفیان نے کہا کیوں؟ فرمایا کہ "جب عورت نے شوہر کو مخاطب کرکے وہ الفاظ کہے تو عورت کیطرف سے بولنے کی ابتدا ہوچکی۔ پھر قسم کہاں باقی رہی"۔ سفیان نے کہا حقیقت میں آپ کو جو بات دقت پر سوجھ جاتی ہے۔ ہم لوگوں کا وہاں تک خیال بھی نہیں پہنچتا۔

کوفہ میں ایک شخص نے بڑی دھوم دھام سے۔ ایک ساتھ اپنے دو بیٹیوں کی شادی کی۔ ولیمہ کی دعوت میں شہر کے تمام اعیان و اکابر کو مدعو کیا۔ مسعر بن کدام۔ حسن بن صالح سفیان ثوری۔ امام ابوحنیفہ شریک دعوت تھے۔ لوگ بیٹھے کھانا کھارہے تھے۔ کہ دفعتہً صاحب خانہ بدحواس گھر سے نکلا۔ اور کہا "غضب ہوگیا! لوگوں نے کہا خیر ہے؟ بولا کہ زفاف کی رات عورتوں کی غلطی سے شوہر اور بیبیاں بدل گئیں۔ جو لڑکی جس کے پاس رہی وہ اُسکا شوہر نہ تھا۔ اب کیا کیا جائے۔ سفیان نے کہا امیر معاویہ کے زمانہ میں بھی ایسا ہی اتفاق ہوا تھا۔ اس سے نکاح میں کچھ فرق نہیں آتا۔ البتہ دونوں کو مہر دینا لازم ہوگا۔ مسعر بن کدام امام ابوحنیفہ کی طرف مخاطب ہوئے۔ کہ آپ کی کیا رائے ہے۔ امام صاحب نے کہا شوہر خود میرے سامنے آئیں۔ تو جواب دوں۔ لوگ جاکر بلا لائے۔ امام صاحب نے دونوں سے الگ الگ پوچھا کہ۔ رات جو عورت تمہارے ساتھ رہی وہی تمہارے نکاح میں رہے۔ تو تمکو پسند ہے۔ دونوں نے کہا "ہاں"۔ امام صاحب نے کہا تو اپنی بیبیوں کو جنسے تمہارا نکاح بندھا تھا طلاق دیدو۔ اور ہر شخص اُس عورت سے نکاح پڑھا لے جو اُسکے ساتھ ہم بستر رہ چکی"۔

سفیان نے جو جواب دیا اگرچہ فقہ کی رو سے وہ بھی صحیح تھا۔ کیونکہ یہ صورت وطی بالشبہہ کی ہے۔ جس سے نکاح نہیں ٹوٹتا۔ لیکن امام صاحب نے مصلحت کو پیش نظر رکھا وہ جانتے

تھے کہ موجودہ صورت میں نکاح کا قائم رہنا غیرت و حمیت کے خلاف ہوگا۔ کسی مجبوری سے زوجین نے تسلیم بھی کرلیا۔ تو دونوں میں وہ خلوص و اتحاد نہ پیدا ہوگا جو تزویج کا مقصود اصلی ہے۔ اسکے ساتھ مہر کی بھی تخفیف ہے کیونکہ خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دیجائے۔ تو صرف آدھا مہر لازم آتا ہے۔

لیث بن سعد جو مصر کے مشہور امام تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ میں ابوحنیفہ کا ذکر اکثر سُنا کرتا تھا اور اُنکے دیکھنے کا نہایت مشتاق تھا۔ حج کی تقریب سے مکہ معظمہ جانا ہوا۔ اتفاق سے ایک مجلس میں پہنچا۔ دیکھا تو بڑا ہجوم ہے۔ ایک شخص صدر کی جانب بیٹھا ہے اور لوگ اُس سے مسئلے پوچھ رہے ہیں۔ ایک شخص نے بڑھکر کہا "یا اباحنیفہ" (یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اُنکو پہچانا)، امام ابوحنیفہ۔ اُسکی طرف متوجہ ہوئے۔ اُسنے کہا "میرا ایک بدمزاج بیٹا ہے اُسکی شادی کردیتا ہوں۔ تو بیوی کو طلاق دیدیتا ہے۔ لونڈی خریدتا ہوں۔ تو آزاد کردیتا ہے فرمائیے کیا تدبیر کروں" امام ابوحنیفہ نے برجستہ کہا کہ "تم اُسکو ساتھ لیکر بازار میں جہاں لونڈیاں بکتی ہیں جاؤ اور جو لونڈی اُس کو پسند آئے خرید کر اُس کا نکاح پڑھا دو۔ اب اگر وہ آزاد کریگا۔ تو نہیں کرسکتا۔ کیونکہ لونڈی اُسکی ملک نہیں طلاق دیگا۔ تو تمہارا کچھ نقصان نہیں۔ تمہاری لونڈی کہیں نہیں گئی"۔ سعد کہتے ہیں۔ کہ مجھکو جواب پر تو کم لیکن حاضر جوابی پر بہت تعجب ہوا

ربیع جو خلیفہ منصور کا عرض بیگی تھا۔ امام ابوحنیفہ سے عداوت رکھتا تھا۔ ایک دن امام صاحب حسب الطلب دربار میں گئے۔ ربیع بھی حاضر تھا۔ منصور سے کہا کہ "حضور! یہ شخص امیر المومنین کے جد بزرگوار (عبداللہ بن عباس) کی مخالفت کرتا ہے۔ اُنکا قول ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات پر قسم کھائے اور دو ایک روز کے بعد انشاءاللہ کہہ لے۔ تو وہ قسم میں داخل سمجھا جائے گا۔ اور قسم کا پورا کرنا کچھ ضرور نہ ہوگا۔ ابوحنیفہ۔ اسکے خلاف فتوے دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ انشاءاللہ کا لفظ۔ قسم کے ساتھ ہو تو البتہ جزء قسم سمجھا جائیگا۔ ورنہ لغو اور بے اثر ہے" امام صاحب نے کہا امیر المومنین! ربیع کا خیال ہے کہ لوگوں پر آپکی بیعت کا کچھ اثر نہیں۔ منصور نے کہا۔ یہ کیونکر؟ امام صاحب نے کہا "انکا گمان ہے کہ جو لوگ دربار میں آپکے ہاتھ پر بیعت خلافت کرتے ہیں۔ اور قسم کھاتے ہیں۔ گھر پر جاکر انشاءاللہ کہہ لیا کرتے ہیں۔ جس سے قسم بے اثر ہوجاتی ہے۔ اور اُن پر شرعاً کچھ مواخذہ نہیں رہتا۔ منصور ہنس پڑا۔ اور ربیع سے کہا کہ تم ابوحنیفہ کو نہ چھیڑو۔ ان پر تمہارا داؤ نہیں چل سکتا"۔ امام صاحب دربار سے نکلے تو ربیع نے کہا۔ آج تو آپ میری جان ہی لے چکے تھے۔ فرمایا "یہ تو تمہارا ارادہ تھا۔ میں نے صرف مدافعت کی"

ایک دفعہ بہت سے خارجی۔ امام صاحب کے گھر پر چڑھ آئے۔ اور کہا کہ کفر سے توبہ کرو امام صاحب نے کہا "ہاں میں تمہارے کفر سے توبہ کرتا ہوں" خارجیوں کا اعتقاد ہے کہ گناہ کرنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے یعنی گناہ اور کفر ایک چیز ہے۔ امام صاحب کا مطلب یہ تھا کہ جس چیز کو تم کفر سمجھتے ہو۔ میں اُس سے توبہ کرتا ہوں۔ کسی نے اُن خارجیوں سے جا لگایا کہ ابوحنیفہ نے تم لوگوں کو دھوکہ دیا۔ اُنکا مطلب اور تھا۔ خارجیوں نے امام صاحب کو پکڑا کہ تمنے تاویل کیوں کی۔ امام نے کہا۔ تمکو یقین ہے یا محض گمان کی بنا پر میری نسبت ایسا خیال کرتے ہو۔ بولے کہ نہیں۔ گمان ہے۔" امام نے کہا تو تمکو خود توبہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے ان بعض الظن اثم۔

ایک دن مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ شاگردوں کا مجمع تھا۔ دفعتہً خارجیوں کا ایک گروہ مسجد میں گھس آیا لوگ بھاگ چلے۔ امام صاحب نے روکا اور تسلی دی کہ دور نہیں اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ ایک خارجی۔ جو سب کا سردار تھا۔ امام صاحب کے پاس آیا۔ اور کہا کہ تم کون لوگ ہو۔ امام صاحب نے فرمایا "مستجیر ہیں۔ اور خدا نے فرمایا ہے کہ وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتے یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ۔ یعنی "مشرکین میں سے کوئی شخص اگر پناہ چاہے تو اُسے پناہ دو تاکہ وہ خدا کا کلام سُنے۔ پھر اُسکو اُسکے امن تک پہنچا دو۔" خارجی اپنے سوا مسلمانوں کے تمام فرقوں کو مشرک اور کافر سمجھتے ہیں۔ اور واجب القتل جانتے ہیں۔ اس موقع پر وہ اسی نیت سے آئے تھے کہ امام ابوحنیفہ۔ اپنا عقیدہ بیان کریں تو کفر کا الزام لگا کے اُنکو قتل کر دیں۔ لیکن امام صاحب کے الزامی جواب نے اُنکو بالکل مجبور کر دیا۔ چنانچہ ایک سردار نے ساتھیوں سے کہا کہ "اُنکو قرآن پڑھکر سنا دو اور اُنکو اُنکے گھر پہنچا آؤ۔"

ابوالعباس۔ جو منصور کے دربار میں ایک معزز درجہ رکھتا تھا۔ امام صاحب کا دشمن تھا اور ہمیشہ اُن کو ضرر پہنچانے کی فکر میں رہتا تھا۔ ایک دن امام صاحب کسی ضرورت سے دربار میں گئے۔ اتفاق سے ابوالعباس بھی حاضر تھا۔ لوگوں نے کہا آج ابوحنیفہ میرے ہاتھ سے بچکر نہیں جا سکتے۔ امام صاحب کی طرف مخاطب ہوا اور کہا کہ ابوحنیفہ! امیرالمومنین کبھی کبھی ہم لوگوں کو بلا کر حکم دیتے ہیں کہ اس شخص کی گردن مارو۔ ہم کو مطلق معلوم نہیں ہوتا۔ کہ وہ شخص واقعی مجرم ہے یا نہیں۔ ایسی حالت میں ہمکو اس حکم کی تعمیل کرنی چاہیئے یا انکار کرنا چاہیئے۔" امام صاحب نے کہا "تمہارے نزدیک خلیفہ کے احکام حق ہوتے ہیں۔ یا باطل؟" منصور کے سامنے کسکی تاب تھی۔ کہ احکام خلافت کی نسبت ناجائز ہونے کا خیال ظاہر کر سکتا۔ ابوالعباس کو مجبوراً کہنا پڑا کہ حق ہوتے ہیں۔ امام صاحب نے فرمایا۔ پھر

حق کی تعمیل میں پوچھنا کیا؟

ایک شخص نے قسم کھائی کہ آج اگر میں غسل جنابت کروں۔ تو میری بیوی کو تین طلاق ہے تھوڑی دیر کے بعد کہا کہ آج کی کوئی نماز قضا ہو تو میری زوجہ مطلقہ ہے۔ پھر کہا کہ اگر آج میں اپنی بیوی کے ساتھ صحبت نہ کروں۔ تو اُسکو طلاق ہے" لوگوں نے امام صاحب سے آکر مسئلہ پوچھا۔ فرمایا کہ نماز عصر پڑھکر بیوی سے ہم صحبت ہو۔ اور غروب کے بعد غسل کر کے فوراً مغرب کی نماز پڑھ لے۔ اس صورت میں سب شرطیں پوری ہوگئیں۔ بیوی سے ہم صحبت بھی ہوا۔ نماز بھی قضا نہیں کی غسل جنابت کیا۔ تو اُسوقت کیا۔ دن گزر چکا تھا۔

ایک دفعہ ایک شخص امام صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ "مینے کچھ روپئے ایک جگہ احتیاط سے رکھدیئے تھے۔ اب یاد نہیں آتا کہ کہاں رکھے تھے۔ مجھکو سخت ضرورت درپیش ہے کوئی تدبیر بتائیے۔ امام نے فرمایا۔ بھائی! یہ مسئلہ تو فقہ میں کہیں مذکور نہیں۔ مجھ سے کیا پوچھنے آئے ہو" اُس نے زیادہ لجاجت کی۔ تو کہا کہ "آج ساری رات نماز پڑھو" اُس نے جاکر نماز پڑھنی شروع کی۔ اتفاق یہ کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد اُسکو یاد آگیا کہ روپیے فلاں جگہ رکھے تھے دوڑا ہوا امام صاحب کے پاس آیا۔ اور عرض کی۔ کہ آپ کی تدبیر راست آئی۔ فرمایا کہ "ہاں۔ شیطان۔ کب گوارا کرتا۔ کہ تم رات بھر نماز پڑھتے رہو۔ اسلیئے اُس نے جلد یاد دلادیا۔ تاہم تمکو مناسب تھا۔ کہ اسکے شکریہ میں شب بیداری کرتے اور نمازیں پڑھتے۔

ایک اور دن ایک شخص نے آکر کہا کہ "میں نے کچھ اسباب گھر کے کسی کونے میں گاڑ دیا تھا۔ اب یاد نہیں آتا کہ کہاں گاڑا تھا۔ کیا کروں" امام صاحب نے کہا "تمکو یاد نہیں۔ تو مجھ کو اور بھی نہ یاد ہونا چاہیئے" وہ رونے لگا۔ امام صاحب کو رحم آیا۔ چند شاگرد ساتھ لئے۔ اور اُسکے گھر پر گئے شاگردوں سے کہا "اگر یہ تمہارا گھر ہوتا۔ اور تم حفاظت کے لئے کوئی چیز چھپا کر رکھتے۔ تو کہاں رکھتے" سب نے اپنے اپنے قیاس سے مختلف موقعے بتائے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ "انہیں تین چار جگہوں میں سے کہیں نہ کہیں گاڑا ہوگا۔ اُن کے کھدوانے کا حکم دیا۔ خدا کی شان تیسری جگہ کھودی۔ تو اسباب بجنسہ مدفون ملا۔

امام صاحب اگرچہ نہایت ثقہ متین باوقار تھے۔ تاہم ذہانت کی شوخیاں کبھی کبھی ظرافت کا رنگ دکھاتی تھیں۔ ایک دن اصلاح بنوا رہے تھے۔ حجام سے کہا۔ کہ سفید بالوں کو چن لیا" اُس نے عرض کی کہ جو بال چنے جاتے ہیں۔ اور زیادہ نکلتے ہیں۔ امام صاحب نے کہا "یہ قاعدہ ہے۔ تو سیاہ بالوں کو چن لو کہ اور زیادہ نکلیں"۔ قاضی شریک نے یہ حکایت سُنی۔ تو کہا۔ کہ ابوحنیفہ نے حجام کے ساتھ بھی قیاس کو نہ چھوڑا۔"

امام صاحب کے محلہ میں آپ پنہارا رہتا تھا۔ جو نہایت متعصب شیعہ تھا۔ اُسکے پاس دو خچر تھے۔ تعصب سے ایک کا ابوبکرؓ اور دوسرے کا عمرؓ نام رکھا تھا۔ اتفاق سے ایک خچر نے لات ماری۔ کہ اُسکا سر پھٹ گیا۔ اور اُسی صدمہ سے مرگیا محلہ میں اسکا چرچا ہوا امام صاحب نے سُنا تو کہا۔ دیکھنا! اُسی خچر نے مارا ہوگا۔ جسکا نام اُس نے عمرؓ رکھا تھا لوگوں نے دریافت کیا۔ تو واقعی ایسا ہی ہوا تھا۔

کوفہ میں ایک غالی شیعی تھا۔ جو حضرت عثمانؓ کی نسبت کہا کرتا تھا کہ یہودی تھے۔" امام صاحب ایک دن اُسکے پاس گئے۔ اور کہا کہ تم اپنی بیٹی کی نسبت ڈھونڈھتے تھے۔ ایک شخص موجود ہے۔ جو شریف بھی ہے دولتمند بھی ہے۔ اسکے ساتھ پرہیزگار قائم اللیل حافظ قائم اللیل۔ حافظ قرآن ہے۔" شیعی نے کہا۔ تو اُس سے بڑھکر کون ملے گا۔ آپ ضرور شادی ٹھہرا دیجئے۔ امام صاحب نے کہا۔" صرف اتنی بات ہے کہ مذہباً یہودی ہے۔" وہ نہایت برہم ہوا اور کہا" سبحان اللہ آپ یہودی سے رشتہ داری کرنے کی رائے دیتے ہیں۔" امام صاحب نے فرمایا۔" کیا ہوا خود پیغمبر خدا نے جب یہودی کو دتمہارے اعتقاد کے موافق) داماد بنایا تو تمکو کیا عذر ہے۔" خدا کی قدرت۔ اتنی بات سے اُسکو تنبیہ ہوگئی۔ اور اپنے عقیدہ سے توبہ کی ؛

حصہ دوم

امام صاحب کی تصنیفات

فقہ اکبر

امام صاحبؒ کی طرف جو کتابیں منسوب ہیں اُنکے یہ نام ہیں۔ فقہ اکبر۔ العالم والمتعلم مسند فقہ اکبر۔ عقائد کا ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ مسائل اور ترتیب قریب قریب وہی ہے جو عقائد نسفی۔ وغیرہ کی ہے۔ یہ رسالہ چھپ گیا ہے اور ہر جگہ ملسکتا ہے۔ لوگوں نے اُسپر

شرحیں

شرحیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً محی الدین محمد بن بہاء الدین المتوفی ۹۵۲ھ۔ مولی الیاس بن ابراہیم السینوبی۔ مولی احمد بن محمد المغنیساوی۔ حکیم اسحٰق۔ شیخ اکمل الدین۔ ملا علی القاری۔ ملا علی قاری کی شرح متداول ہے بعض اور شرحوں کے نسخے بھی جا بجا قلمی پائے جاتے ہیں۔ حکیم اسحٰق کی شرح کو ابو البقاء احمدی نے ۹۱۸ھ میں نظم کیا۔ اور اصل کتاب کو ابراہیم بن حسام نے جو شریفی کے نام سے مشہور ہیں۔

العالم والمتعلم

العالم والمتعلم۔ سوال و جواب کے طور پر ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ لیکن ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

مسند

مسند کے متعدد نسخے ہیں جنکو ابو المؤید محمد بن محمود الخوارزمی المتوفی ۶۶۵ھ نے یکجا جمع کردیا ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "بلاد شام میں بعض جاہلوں کو میں نے یہ کہتے سنا کہ امام ابوحنیفہ کو فن حدیث میں چنداں دخل نہ تھا اور اسی وجہ سے حدیث میں انکی کوئی کتاب نہیں ہے۔ اسپر مجھکو حمیت مذہبی کا جوش ہوا اور میں نے چاہا کہ ان تمام مسندوں کو یکجا کردوں۔ جو علما نے امام ابوحنیفہ کی حدیثوں سے مرتب کئے ہیں" اور جنکی تفصیل حسب ذیل ہے (۱) مسند حافظ ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن یعقوب الحارثی البخاری المعروف بعبد اللہ الاستاد (۲) مسند امام ابو القاسم طلحہ بن محمد بن جعفر الشاہد (۳) مسند حافظ ابو الحسین محمد بن المظفر بن موسیٰ بن عیسیٰ (۴) مسند حافظ ابو نعیم الاصفہانی (۵) مسند شیخ ابو بکر محمد بن عبد الباقی محمد الانصاری (۶) مسند امام ابو احمد عبد اللہ بن عدی الجرجانی (۷) مسند امام حافظ عمر بن حسن الاشنانی (۸) مسند ابو بکر احمد بن محمد خالد الکلاعی (۹) مسند امام ابو یوسف قاضی (۱۰) مسند امام محمد (۱۱) مسند حماد بن امام ابوحنیفہ (۱۲) آثار امام محمد (۱۳) مسند امام ابو القاسم عبد اللہ بن العوام السعدی

ابو المؤید الخوارزمی نے جن مسندوں کے نام گئے ہیں۔ انکے سوا اور بھی مسانید ہیں۔ مثلاً مسند حافظ ابو عبد اللہ حسین بن محمد بن خسرو البلخی المتوفی ۵۲۲ھ۔ مسند حصکفی جسکی شرح ملا علی قاری نے لکھی۔ مسند ماوردی۔ مسند ابن البزازی المتوفی ۸۲۷ھ۔ ان مسندوں کی شرحیں بھی لکھی گئیں۔

جو لوگ امام صاحب کے سلسلہ کمالات میں تصنیف و تالیف کا وجود بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ انہیں مفصلہ بالا کتابوں کو شہادت میں پیش کرتے ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ ان تصنیفات کو امام صاحب کی طرف منسوب کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ امام صاحب کی زندگی میں ایک مجموعۂ فقہ مرتب ہوگیا تھا جسکے حوالے عقود الجمان وغیرہ میں جا بجا ملتے ہیں لیکن قیاس غالب یہ ہے کہ وہ نسخہ معدوم ہوگیا۔ اس زمانہ کی

ہزاروں تصنیفات کے نام۔ تراجم کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ لیکن دو تین کے سوا ایک کا بھی دنیا کے کسی کتب خانہ میں پتہ نہیں چلتا۔ خود امام صاحب کے ہمعصروں میں سے سفیان ثوری۔ امام اوزاعی۔ حماد بن سلمہ۔ ہشیم۔ معمر۔ جریر بن عبدالحمید۔ عبداللہ بن مبارک نے حدیث و فقہ میں بڑی بڑی کتابیں لکھیں۔ لیکن آج انکا نام ہی نام رہگیا ہے اور ایک کا بھی وجود نہیں۔ امام رازی نے مناقب الشافعی میں تصریح کی ہے کہ امام ابوحنیفہ کی کوئی تصنیف باقی نہیں رہی۔

مسند خوارزمی — مسند خوارزمی۔ کو امام صاحب کا مسند کہنا مجازی اطلاق ہے۔ خوارزمی۔ خود ساتویں صدی میں تھے۔ جن مسندوں کو جمع کیا ہے۔ وہ بھی اکثر تیسری چوتھی صدی یا اس سے بھی بعد کی ہیں۔ حماد۔ قاضی ابویوسف۔ البتہ امام صاحب کے ہمعصر ہیں اور انکا مسند بے شبہہ امام ابوحنیفہ کا مسند کہا جاسکتا تھا لیکن خوارزمی کے سوا اور کسی نے ان مسندوں کا نام نہیں لیا ہے۔ حالانکہ حدیث کی کتاب جب تک مشہور اور مستند روایتوں سے نہ ثابت ہو اسکا اعتبار نہیں کیا جاسکتا ہمارے نزدیک اس بحث میں شاہ ولی اللہ صاحب کا فیصلہ کافی ہے۔ وہ حجۃ اللہ البالغہ۔ میں فرماتے ہیں۔ کہ ”طبقہ رابعہ کی۔ وہ کتابیں ہیں۔ جن کے مصنفوں نے ایک مدت دراز کے بعد ان روایتوں کو جمع کرنا چاہا۔ جو دو پہلے طبقوں میں موجود نہ تھیں۔ اور گمنام مسندوں اور مجموعوں میں پائی جاتی تھیں۔ ان لوگوں نے انکو بلند نام کرنا چاہا۔ حالانکہ وہ حدیثیں ان لوگوں کی زبانوں پر تھیں۔ جنکا محدثین اعتبار نہیں کرتے شلاً زیادہ گو واعظین اور اہل بدعت اور ضعیف الرواتیہ۔ یا وہ صحابہؓ اور تابعین کے آثار یا بنی اسرائیل کے قصے تھے۔ یا حکما اور واعظین کے مقولے تھے جنکو راویوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے مخلوط کر دیا تھا۔ یا قرآن اور حدیث کے محتمل مضامین تھے۔ جنکو ان نیک آدمیوں نے بالمعنی روایت کیا جو فن روایت سے ناواقف تھے۔ ان لوگوں نے ان باتوں کو رسول اللہ کی طرف منسوب کر دیا۔ یا ایسے مضامین تھے۔ جو قرآن اور حدیث سے مستنبط ہوتے تھے۔ انکو قصداً حدیث نبوی بنا دیا۔ یا مختلف حدیثوں کے ٹکڑے تھے۔ جو ایک عبارت میں مرتب کر دئے گئے۔ اس قسم کی حدیثیں کتاب الضعفاء ابن حبان کامل ابن عدی۔ تصنیفات خطیب۔ و ابونعیم و جوزقانی۔ و ابن عساکر۔ و ابن النجار و دیلمی میں ملسکتی ہیں مسند خوارزمی بھی قریباً اسی طبقہ میں داخل ہے“

شاہ ولی اللہ صاحب نے ذرا سختی کی۔ بات اتنی ہے۔ کہ جن مسندوں کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ امام صاحب کے شاگردوں نے لکھے ان کا نہ تاریخوں سے ثبوت ملتا ہے

نہ وہ خود کہیں پائے جاتے ہیں۔ جو مسند۔ امام صاحب کے زمانہ سے بہت پیچھے لکھے گئے۔ وہ البتہ موجود ہیں۔ مسند خصفکی میں کئی روایتیں۔ امام صاحب تک بسند صحیح متصل پہنچنا نہایت مشتبہ ہے۔ اس سے بڑھکر یہ کہ بعض بعض مسانید میں بے اعتباری کی اندرونی شہادتیں موجود ہیں۔ مسند خصفکی میں کئی روایتیں۔ امام صاحب کی طرف منسوب ہیں۔ جنکو اُنہوں نے خود صحابہ رضی اللہ عنہم سے سُنا اور روایت کیا ہے۔ حالانکہ امام صاحب کا صحابہ سے روایت کرنا محدثانہ تحقیقات کی رو سے ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا۔ خوارزمی نے آثار امام محمد کو بھی امام۔ کی مسانید میں داخل کیا ہے۔ بے شبہ اس کتاب میں اکثر روایتیں امام صاحب ہی سے ہیں۔ اسلیئے ناظرین کو اختیار ہے کہ اُسکو امام ابو حنیفہ کا مسند۔ کہیں یا آثار امام محمد۔ کے نام سے پکاریں۔ لیکن یاد رہے کہ امام محمد نے اس کتاب میں بہت سے آثار اور محدثین دوسرے شیوخ سے بھی روایت کی ہیں۔ اس لحاظ سے اس مجموعہ کا انتساب۔ امام محمد کی طرف زیادہ موزون ہے۔

فقہ اکبر

فقہ اکبر۔ گو اگرچہ فخر الاسلام بزدوی۔ عبد العلی بحر العلوم۔ و شارحین فقہ اکبر نے امام صاحب کی طرف منسوب کیا ہے لیکن ہم مشکل سے اُسپر یقین کر سکتے ہیں یہ کتاب جس زمانہ کی تصنیف بیان کیجاتی ہے۔ اُسوقت تک یہ طرز تحریر پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ بطور ایک متن کے ہے اور اس اختصار و ترتیب کے ساتھ لکھی گئی ہے جو متاخرین کا خاص انداز ہے ایک جگہ اسمیں جوہر و عرض کا لفظ آیا ہے۔ حالانکہ یہ فلسفیانہ الفاظ۔ اُسوقت تک زبان میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ بے شبہ منصور عباسی کے زمانہ میں فلسفہ کی کتابیں یونانی زبان سے عربی میں ترجمہ کی گئیں تھیں۔ لیکن یہ زمانہ امام صاحب۔ کی آخر زندگی کا زمانہ ہے۔ کسیطرح قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ترجمہ ہوتے ہی یہ الفاظ اس قدر جلد شائع ہو جائیں۔ کہ عام تصنیفات میں اُنکا رواج ہو جائے۔ فلسفہ کے الفاظ نے مذہبی دائرہ میں اُسوقت بار پایا ہے۔ جب کثرت استعمال کی وجہ سے وہ زبان کا جزو بنگئے۔ اور عام بول چال میں بھی اُن کے استعمال۔ کے بغیر چارہ نہ رہا۔ لیکن یہ دور امام صاحب کے زمانہ کے بعد شروع ہوا ہے۔

یہ بحث تو درایت کی حیثیت سے تھی۔ اصول روایت کے لحاظ سے بھی یہ امر ثابت نہیں ہوتا۔ دوسری تیسری بلکہ چوتھی صدی کی تصنیفات میں اس کتاب کا پتہ نہیں چلتا۔ قدیم سی قدیم تصنیف جسمیں اس رسالہ کا ذکر کیا گیا ہے (جہانتک ہمکو معلوم ہے) فخر الاسلام۔ بزدوی کی کتاب الاصول ہے۔ جو پانچویں صدی کی تصنیف ہے۔ امام ابو حنیفہ۔ کے ہزاروں شاگرد تھے۔ جنمیں سے اکثر بجائے خود اُستاد تھے۔ اور واسطہ در واسطہ اُنکے ہزاروں لاکھوں شاگرد

ہوئے۔ نہایت خلاف قیاس ہے۔ کہ امام صاحب کی کوئی تصنیف موجود ہوتی۔ اور اتنے بڑے گروہ میں اسکا نام تک نہ لیا جاتا۔ علم عقائد۔ اور اُسکے متعلقات پر جو بڑی بڑی کتابیں مثلاً صحایف۔ شرح مقاصد۔ شرح مواقف۔ ملل و نحل وغیرہ تصنیف ہوئیں۔ اُنمیں کہیں اِسکا ذکر تک نہیں ہے۔ اِس کتاب کی جسقدر شرحیں ہوئیں۔ سب آٹھویں صدی میں یا اُسکے بعد ہوئیں۔ اسکے علاوہ ابو مطیع بلخی جو اس کتاب کے راوی ہیں حدیث و روایت میں چنداں مستند نہیں ہیں۔ کتب رجال میں اُنکی نسبت محدثین نے نہایت سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اگرچہ میں اُنکو کلیۃً تسلیم نہیں کرتا۔ تاہم ایک ایسی مشتبہ کتاب جسکا ثبوت صرف ابو مطیع بلخی۔ کی روایت پر منحصر ہو۔ محدثانہ اصول پر قابل تسلیم نہیں ہو سکتی۔

میرا خیال ہے کہ ابو مطیع بلخی۔ نے ایک سالہ میں بطور خود عقائد کے مسائل قلمبند کئے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ امام صاحب۔ کی طرف منسوب ہو گیا۔ اِس خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ علامہ ذہبی۔ نے عبر فی اخبار من عبر میں ابو مطیع کا جہاں ذکر کیا ہے۔ اِن لفظوں سے کیا ہے کہ "صاحب الفقہ الاکبر" جسکے متبادر معنی یہی ہیں۔ کہ خود ابو مطیع اُسکے مصنف ہیں۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ فقہ اکبر کی موجودہ ترتیب و عبارت۔ ابو مطیع کے زمانہ سے بھی بہت بعد کی ہے۔ اور یہ کچھ نئی بات نہیں ہے۔ جامع صغیر جو امام محمدؒ کی تالیف ہے۔ اُسکی موجودہ ترتیب۔ امام ابو طاہر دباس نے کی ہے۔ جو چوتھی صدی میں تھے۔ فرق یہ ہے کہ جامع صغیر کی عبارت وہی اصلی ہے۔ صرف ترتیب بدل دی گئی ہے برخلاف اِسکے فقہ اکبر کا انداز عبارت بھی زمانہ بعد کا معلوم ہوتا ہے۔

ہم نے اِس بحث میں اپنی رائے اور قیاسات کو بہت دخل دیا ہے لیکن تمام واقعات بھی لکھ دئے ہیں۔ ناظرین کو ہم اپنی رائے کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتے۔ اصلی واقعات اور ہماری رائیں دونوں اُنکے سامنے ہیں۔ وہ جو چاہیں خود فیصلہ کرلیں۔ بے شبہہ ہماری ذاتی رائے یہی ہے کہ آج۔ امام صاحب کی کوئی تصنیف موجود نہیں ہے۔ خدا خوب جانتا ہے

عقائد و کلام

امام صاحب ابتدائی تحصیل میں علم کلام۔ کی طرف زیادہ مائل تھے صحابہؓ کے اخیر زمانہ میں نئے نئے فرقے پیدا ہو چلے تھے۔ معبد جہنی نے جو صحابہؓ کا صحبت یافتہ تھا۔ مسئلہ قدر کو چھیڑا۔ واصل بن عطاء نے جو علوم عربیہ و علم کلام کا بہت بڑا عالم اور امام حسن بصری کا شاگرد تھا۔ اعتزال کی بنیاد قائم کی جہم بن صفوان۔ فرقہ جہمیہ کا بانی ہوا۔ خوارج کے متعدد

فرقے اس سے پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ امام ابو حنیفہ کے زمانہ میں ان مسائل کے جا بجا چرچے تھے۔ اور ہر جگہ بحث و مناظرہ کا بازار گرم تھا۔ امام صاحب کو بھی اُنکی رد و قدح کیطرف التفات ہؤا۔ اِسمیں کہ اُنکی بے نظیر ذہانت نے ان مسائل میں نہایت دقیق بحثیں پیدا ہونگی لیکن چونکہ یہ شغل تھوڑے زمانہ تک رہا۔ اور بالآخر وہ فقہ کے مہمات میں مصروف ہوئے اسلئے اُن مباحث کا آج پتہ نہیں ملتا۔ تاہم چند مسائل جو بتواتر اُنکی طرف منسوب ہیں۔ اُنکی دقت نظر۔ جدت ذہن۔ وسعت خیال کے شاہد عادل ہیں۔ اُن میں سے ہم بعض مسائل کا ذکر کرتے ہیں۔ جو محدثین کے نزدیک بڑے معرکۃ الآرا مسئلے ہیں۔

پہلا مسئلہ۔ یہ ہے۔ کہ امام صاحب۔ فرائض اور اعمال کو جزو ایمان نہیں سمجھتے آج تو اسکی نسبت بحث کرنی گویا تحصیل حاصل ہے۔ ایک معمولی سمجھ سکتا ہے۔ کہ ایمان اعتقاد۔ کا نام ہے۔ جو دل سے متعلق ہے۔ فرائض اور اعمال۔ جوارح کے کام ہیں۔ اسی لئے نہ اُن دونوں سے کوئی حقیقت مرکب ہوسکتی ہے۔ نہ انمیں سے ایک دوسرے کا جزو ہوسکتا ہے۔ لیکن اُس زمانہ میں یہ ایک بڑا بحث طلب مسئلہ تھا اور اکثر ارباب ظاہر بلکہ بعض مجتہدین بھی اِسکے خلاف تھے۔

صحابہؓ کے زمانہ تک اسلامی عقائد کی سطح۔ نہایت ہموار اور غیر متحرک رہی۔ اہل عرب کو اِن موشگافیوں اور باریک بینیوں سے سروکار نہ تھا۔ بنو امیہ کے وسط زمانہ میں جب فوجی قوت کو زوال ہؤا تو تمدن و معاشرت کی وسعت نے اور قسم کے اشغال پیدا کردئے۔ جبر و قدر تشبیہ و تنزیہ۔ عدل و جور کی بحثیں چھڑ گئیں۔ اِن بحثوں کی ابتدا اُن لوگوں نے کی۔ جو عجم کی خاک سے تھے۔ یا اُن پر عجم کا پرتو پڑا تھا۔ چونکہ یہ نامانوس صدائیں تھیں۔ اِن باتوں پر مذہبی گروہ میں۔ جو زیادہ تر عرب سے تعلق رکھتا تھا۔ سخت برہمی پیدا ہوگئی۔ اور محدثین و فقہا نہایت سختی سے بدعتیوں کے مقابلہ کو اُٹھے۔ اِس مقابلہ کی بنا پر اِن بزرگوں کو خود بھی اُن مسائل میں نفی یا اثبات کا پہلو اختیار کرنا پڑا۔ لیکن جوش مخالفت نے اکثر دِل کو اعتدال کی حد پر نہ رہنے دیا۔ معتزلہ کا مذہب تھا کہ قرآن مجید۔ خدا کا ایک جدید کلام ہے جو رسول اللہ کی نبوت کے ساتھ وجود میں آیا۔ لوگوں نے اسکی یہانتک مخالفت کی کہ بعض محدثین نے تلفظ بالقرآن۔ کو بھی قدیم ٹھہرا دیا۔ امام ذہلی۔ جو امام بخاریؒ کے اساتذہ میں سے تھے۔ اور صحیح بخاری میں اُنکی سند سے اکثر روایتیں ہیں۔ اسی بات پر امام بخاری سے ایسے ناراض ہوئے۔ کہ اُن کو حلقۂ درس سے نکلوا دیا اور عام حکم دیدیا کہ جو شخص بخاری کے پاس آمد و رفت رکھے وہ ہمارے حلقہ میں نہ آنے پائے۔ امام بخاری۔ خود قرآن۔ کے

قدیم کے قائل تھے لیکن قرأت قرآن کو حادث کہتے تھے دلی کو اصرار تھا۔ کہ یہ بھی قدیم ہیں اور مسائل میں بھی اس قسم کی بے اعتدالیاں ہوئیں۔ جنکی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ امام ابوحنیفہ نے ان تمام بحثوں میں وہی پہلو اختیار کیا جو مغز سخن تھا اور جو عقل کے ساتھ نقل کے بھی مطابق تھا۔ انہیں مسائل میں ایمان و عمل کا مسئلہ بھی تھا۔ مرجیہ کا مذہب ہے کہ "ایمان اور عمل دو مختلف چیزیں ہیں۔ اور ایمان اور تصدیق کامل ہو تو عمل کا نہ ہونا کچھ ضرر نہیں کرتا۔ ایک شخص اگر دل سے توحید و نبوت کا معترف ہے اور فرائض نہیں ادا کرتا۔ تو وہ مواخذہ سے بری ہے" اس رائے کا پہلا حصہ گو صحیح تھا۔ مگر محدثین نے کچھ تفریق نہ کی اور کلیتہً اس مذہب کے مخالف ہو گئے۔ چونکہ قرآن کی بعض آیتیں بھی بظاہر اسکے مؤید تھیں انکی رائے کو اور بھی قوت و شدت ہو گئی۔ یہ ایک اجتہادی رائے تھا اور یہیں تک رہتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ ان بزرگوں نے یہانتک شدت کی کہ جو شخص انکی رائے کے ساتھ متفق نہ ہوتا تھا۔ اسکو فاسق یا کافر سمجھے تھے۔ قاضی ابویوسف ایکبار شریک کی عدالت میں گواہ ہو کر گئے۔ تو انہوں نے کہا "میں اس شخص کی شہادت نہیں قبول کرتا۔ جس کا قول ہو کہ نماز جزو ایمان نہیں"

امام ابوحنیفہ کو اس سے کچھ بحث نہ تھی۔ کہ یہ مسئلہ فلاں شخص یا فلاں فرقہ کا ہے۔ وہ اصل حقیقت کو دیکھتے تھے اور مغز سخن کو پہنچتے تھے جب یہ بحث انکے سامنے پیش کی گئی۔ تو انہوں نے علانیہ کہا کہ "ایمان اور عمل دو جداگانہ چیزیں ہیں اور دونوں کا حکم مختلف ہے" اسپر بہت سے لوگوں نے انہیں بھی مرجیہ کہا لیکن وہ ایسا مرجیہ ہونا خود پسند کرتے تھے۔ محدثین اور فقہاء میں سے جو لوگ۔ امام صاحب کے ہمزبان تھے انکو بھی یہی خطاب عنایت ہوا۔ محدث ابن قتیبہ نے اپنی مشہور اور مستند کتاب المعارف میں مرجیہ کے عنوان سے بہت سے فقہاء اور محدثین کے نام گنائے ہیں جنمیں سے چند یہ ہیں ابراہیم تیمی۔ عمرو بن مرۃ طلق بن حبیب حماد بن سلیمان۔ عبد العزیز بن ابی رواد خارجہ بن مصعب۔ عمرو بن قیس الاصر۔ ابومعاویہ الضریر یحیی بن زکریا۔ مسعر بن کدام۔ حالانکہ انمیں سے اکثر۔ حدیث و روایت کے امام ہیں۔ اور صحیح بخاری و مسلم میں۔ ان لوگوں کی سینکڑوں روایتیں موجود ہیں۔ ہمارے زمانہ کے بعض کوتاہ بین جو اسپر خوش ہیں کہ امام صاحب کو بعض محدثین نے مرجیہ کہا ہے ابن قتیبہ کی فہرست دیکھتے۔ تو شاید انکو ندامت ہوتی۔ محدث ذہبی نے میزان الاعتدال میں مسعر بن کدام کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "ارجاء (مرجیہ ہونا) بہت سے علمائے کبار کا مذہب ہے اور اس مذہب کے قائل پر مواخذہ نہ کرنا چاہیئے"

ایمان اور عمل جداگانہ چیزیں ہیں

جو لوگ مرجیہ کہلائے

یہ اُسی ارجاء کیطرف اشارہ ہے جو امام ابو حنیفہ کا مذہب تھا۔

یہ مسئلہ اگرچہ بظاہر چنداں مہتم بالشان نہ تھا لیکن اُسکے نتائج بہت بڑا اثر رکھتے تھے۔ اسلئے لحاظ سے امام صاحب نے نہایت آزادی سے اُسکا اظہار کیا۔ عمل کو جزو ایمان قرار دینا اس بات کو مستلزم ہے کہ جو شخص اعمال کا پابند نہ ہو وہ مومن بھی نہ ہو جیسا کہ خارجیوں کا مذہب ہے جو مرتکب کبائر کو کافر سمجھتے ہیں۔ اگرچہ اکثر محدثین۔ ایسے شخص کو کافر نہیں سمجھتے تھے لیکن یہ نہ سمجھنا اس وجہ سے تھا کہ وہ لزوم سے ناواقف تھے۔ حالانکہ لزوم قطعی اور یقینی ہے۔ جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔

امام رازی نے جو۔ امام شافعی کے بہت بڑے حامی ہیں۔ کتاب مناقب الشافعی میں لکھا ہے کہ "لوگوں نے امام شافعی پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ متناقض باتوں کے قائل ہیں۔ کیونکہ ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ایمان تصدیق و عمل کے مجموعہ کا نام ہے ساتھ ہی اس بات کے بھی قائل ہیں۔ کہ "ترک عمل سے کوئی شخص کافر نہیں ہوتا" حالانکہ مرکب چیز کا جب ایک جزو نہ رہا تو مرکب بھی من حیث المرکب نہ رہا۔ اسی لئے معتزلہ جو اسبات کے قائل ہیں کہ عمل جزو ایمان ہے اسبات کے بھی قائل ہیں کہ عمل نہ ہو تو ایمان بھی نہیں لیکن امام شافعی کیطرف سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اصل ایمان اقرار اور اعتقاد کا نام ہے۔ باقی اعمال تو وہ ایمان کے ثمرات اور توابع ہیں لیکن چونکہ توابع پر بھی کبھی کبھی مجازاً اصل شے کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسلئے مجازاً اعمال پر بھی ایمان۔ کا اطلاق ہوا اور یہ مسلم ہے کہ توابع کے فوت ہونے سے اصل شے فوت نہیں ہوتی"

لیکن یہ جواب توجیہ القول بمالا یرضی بہ قائلہ ہے۔ اور خود امام رازی۔ کو اس کا اعتراف کرنا پڑا چنانچہ جواب کے بعد فرماتے ہیں کہ فیہ ترک اھل المذھب یعنی اس جواب سے یہ مذہب باطل ہوا جاتا ہے۔ امام رازی گو شافعی المذہب اور اپنے امام کے نہایت طرفدار ہیں لیکن چونکہ صاحب نظر اور نکتہ شناس ہیں۔ اُن کو تسلیم کرنا پڑا کہ یا عمل کو ایمان کے توابع سے شمار کرنا چاہیئے۔ یا مان لینا چاہیئے کہ جو شخص پابند عمل نہیں۔ مومن بھی نہیں۔

اس بحث کے متعلق امام ابو حنیفہ کی ایک تحریر موجود ہے جسکی طرز استدلال استنباط سے۔ امام صاحب کی دقت نظر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور اصل مسئلہ کی حقیقت کھلتی ہے اسلئے اس موقع پر ہم اُسکا حوالہ دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ تحریر عثمان بتی کے ایک خط کا جواب ہے جو اُنہوں نے امام صاحب کو لکھا تھا۔ عثمان اُس زمانہ کے ایک مشہور محدث تھے عام لوگوں میں جب امام ابو حنیفہ کے۔ ان خیالات کے چرچے ہوئے تو اُنہوں نے امام

صاحب کو ایک دوستانہ خط لکھا۔ جسکا مضمون یہ تھا کہ "لوگ آپ کو مرجیہ کہتے ہیں۔ اور بیان کرتے ہیں۔ کہ آپ مومن کا ضال "گمراہ" ہونا جائز قرار دیتے ہیں مجھکو ان باتوں کے سننے سے نہایت رنج ہوتا ہے۔ کیا یہ باتیں صحیح ہیں" اس خط کے جواب میں امام صاحب نے ایک طولانی خط لکھا ہے جسکے فقرے کہیں کہیں سے ہم انتخاب کرتے ہیں۔ حمد و نعت کے بعد عثمانؓ بتی کے دوستانہ نصیحت اور خیر خواہی کا شکریہ ادا کر کے اصل مضمون اس طرح شروع کیا ہے :"میں آپ کو بتاتا ہوں کہ رسول اللہ کے مبعوث ہونے سے پہلے تمام لوگ مشرک تھے رسول اللہ جب مبعوث ہوئے۔ تو لوگوں کو اس بات کی طرف دعوت کی کہ خدا کو ایک مانیں اور رسول اللہ جو کچھ لائے اسکو تسلیم کریں۔ پس جو شخص اسلام میں داخل ہوتا تھا۔ اور شرک چھوڑ دیتا تھا۔ اسکی جان اور مال حرام ہو جاتا تھا۔ پھر خاص ان لوگوں کے لیے جو ایمان لا چکے تھے۔ فرائض کے احکام آئے پس اس کا پابند ہونا۔ عمل ٹھہرا اور خدا نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ الذین امنوا وعملوا الصلحت ومن یومن باللہ ویعمل صالحا اس قسم کی اور آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عمل کے نہ ہونے سے ایمان جاتا نہیں رہتا۔ البتہ اگر تصدیق و اعتقاد نہ ہو تو مومن کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ عمل و تصدیق کا دو جداگانہ چیز ہونا اس سے بھی ظاہر ہے کہ تصدیق کے لحاظ سے سب مسلمان برابر ہیں لیکن اعمال کے لحاظ سے مراتب میں فرق ہوتا ہے۔ کیونکہ دین و مذہب کا ایک ہی ہے خدا نے خود کہا ہے شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصی بہ ابراھیم و موسیٰ و عیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ یعنے "تمہارے لئے اسی دین کو مشروع کیا۔ جسکی وصیت نوحؑ کو کی تھی۔ اور جو تجھ پر وحی بھیجی اور جسکی وصیت۔ ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ کو کی۔ وہ یہ ہے۔ کہ دین کو قائم رکھو۔ اور اس میں متفرق نہ ہو"

آپ کو جاننا چاہیئے کہ تصدیق میں ہدایت اور اعمال میں ہدایت یہ دونوں دو چیزیں ہیں آپ ایک شخص کو جو فرائض سے ناواقف ہو۔ مومن کہہ سکتے ہیں۔ پس ایسا شخص فرائض کے لحاظ سے جاہل اور تصدیق کے لحاظ سے مومن ہے۔ خود خدا نے قرآن میں اطلاقات کیئے ہیں۔ کیا آپ اس شخص کو جو خدا اور رسولؐ خدا کے پہچاننے میں گمراہ ہو اس شخص کے برابر قرار دینگے۔ جو مومن ہو لیکن اعمال سے ناواقف ہو۔ خدا نے جہاں فرائض بتائے ہیں اس موقع پر ارشاد فرمایا ہے کہ یبین اللہ لکم ان تضلوا یعنی خدا نے اسلیئے بیان کیا کہ تم گمراہ نہ ہو۔ دوسری آیت میں ہے ان تضل احدھما فتذکر احدھما الاخری یعنی ایک

گمراہ ہو تو وہ سرا پا دوزخ ہے۔ حضرت موسیٰ کی زبان سے فرمایا۔ فعلتها اذا وانا من الضالین (یعنی جب میں نے وہ کام کیا تب میں گمراہ تھا) ان آیتوں کے علاوہ اور بہت سی آیتیں ہیں۔ جو اس دعوے کے ثبوت کے لیئے دلائل قاطعہ ہیں اور حدیثیں تو اور بھی واضح اور صاف ہیں۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ امیر المومنین کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ تو کیا اس کے یہ معنے تھے کہ وہ صرف اُن لوگوں کے امیر تھے جو فرائض اور اعمال کے پابند تھے۔

حضرت علیؓ نے شام والوں کو جو اُن سے لڑتے تھے مومن کہا کیا قتل سے بڑھکر کوئی گناہ ہے۔ پھر جو لوگ قتل کے مرتکب ہوئے کیا آپ قاتلین اور مقتولین۔ دونوں کو برسر حق قرار دیتے ہیں۔ اگر آپ صرف ایک گروہ یعنی حضرت علیؓ اور طرفداران علیؓ برسر حق تسلیم کرینگے تو دوسرے فریق کو کیا کہیں گے۔ اسکو خوب سمجھ لیجئے۔ اور غور کیجئے۔

میرا یہ قول ہے کہ اہل قبلہ سب مومن ہیں۔ اور فرائض کے ترک سے کافر نہیں ہو سکتے جو شخص ایمان کے ساتھ تمام فرائض بجا لاتا ہے۔ وہ مومن اور جنتی ہے۔ جو ایمان اور اعمال دونوں کا تارک ہے وہ کافر اور دوزخی ہے۔ جو شخص ایمان رکھتا ہے اور فرائض اس سے ترک ہو جاتے ہیں۔ وہ مسلمان ضرور ہے۔ لیکن گنہگار مسلمان ہے خدا کو اختیار ہے۔ اُسپر عذاب کرے یا معاف کر دے۔

امام صاحب نے جس خوبی سے اس دعوے کو ثابت کیا ہے۔ انصاف یہ ہے کہ اُس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ فرائض اور ایمان کے باہمی امتیاز کی اس سے عمدہ تر کیا دلیل ہوگی۔ کہ آغاز اسلام میں ایمان کی دعوت ہوتی تھی۔ اور فرائض کا وجود نہ تھا۔ امام صاحب نے قرآن کی جو آیتیں استدلال میں پیش کی ہیں اُن سے بداہتہً ثابت ہوتا ہے۔ کہ دونوں دو چیزیں ہیں۔ کیونکہ ان تمام آیتوں میں عمل کو ایمان پر معطوف کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جزو کل پر معطوف نہیں ہو سکتا۔ من یومن باللہ فیعمل صالحا میں حرف تعقیب آیا ہے۔ جس سے اس بحث کا قطعی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ ان دلائل قاطعہ کے مقابلہ میں دوسری طرف۔ بعض آیتیں اور حدیثیں ہیں لیکن انمیں سے کوئی اثبات مدعا کے لیئے کافی نہیں۔ بڑا استدلال اس حدیث پر ہے کہ مومن۔ مومن ہو کر زنا اور چوری نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ کلام کے زور دینے کا ایک پیرایہ ہے۔ ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں۔ کہ بھلا آدمی ہو کر تو ایسا کام نہیں کر سکتا۔ جس کا صرف یہ مطلب ہوتا ہے۔ کہ وہ کام شان و شرافت کے خلاف ہے۔ بے شبہ زنا اور سرقہ بھی ایمان کی شان کے خلاف ہیں۔ اور حدیث کا منشاء اسی قدر ہے۔ ورنہ ابو ذر کی حدیث میں صاف یہ الفاظ موجود ہیں۔ کہ جو شخص لا الہ الا اللہ ۔۔۔۔ کا قائل ہے وہ جنت میں جائیگا

گو زانی - اور چور ہو"

ایمان کم و زیادہ نہیں ہوتا

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ الایمان لا یزید ولا ینقص یعنی ایمان کم و بیش نہیں ہو سکتا بے شبہہ یہ امام صاحب کا قول ہے لیکن اسکی تعبیر میں لوگوں نے غلطی کی ہے محدثین اور شافعیہ نے بلکہ خود احناف نے بھی۔ ایمان کی کمی و زیادتی دو لحاظ سے ہو سکتی ہے۔ ایک اس اعتبار سے کہ وہ مقولۂ کیف سے ہے جسمیں شدت و ضعف ممکن ہے۔ یا دوسرے کے لفظوں میں یوں کہا جائے۔ کہ ایمان یقین کا نام ہے۔ اور یقین کے مراتب متفاوت ہوتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب خدا سے کہا کہ اے خدا تو مردوں کو کیونکر جلاتا ہے تو ارشاد ہوا کہ او لم تومن یعنی کیا اب تک تجھکو یقین نہیں آیا۔ عرض کی۔ کہ یقین ضرور ہے لیکن لیطمئن قلبی یعنے اور زیادہ اطمینان خاطر چاہتا ہوں" خدا نے متعدد آیتوں میں صاف تصریح کردی ہے کہ ایمان میں ترقی ہوتی ہے زادتھم ایمانا اس مسئلہ میں نص صریح ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہ کو بلحاظ اس معنی کے نہ انکار ہے نہ یہ امر اسوقت زیر بحث تھا۔ امام صاحب کے دعوے کا اور منشا ہے۔ اور وہ بالکل صحیح ہے۔ جن لوگوں نے عمل کو جزو ایمان قرار دیا۔ انکا مذہب ہے کہ ایمان بلحاظ مقدار کے زیادہ و کم ہوتا ہے۔ جو شخص اعمال کا زیادہ پابند ہے۔ وہ زیادہ مومن ہے۔ جو گنہگار ہے وہ کم مومن ہے۔ محدثین بھی اسی کے مدعی ہیں۔ اور اسپر دلیلیں لاتے ہیں۔ علامہ قسطلانی۔ صحیح بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں۔ فاعلم ان الایمان یزید بالطاعات و ینقص بالمعصیۃ یعنے "ایمان ثواب کے کام کرنے سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور گناہ کرنے سے گھٹ جاتا ہے" اور محدثین نے بھی جا بجا اسکی تصریح کی ہے۔ امام ابو حنیفہ اس اعتبار سے۔ ایمان کی زیادت و نقصان کے منکر تھے۔ انکے نزدیک جب اعمال جزو ایمان نہیں۔ تو اعمال کی کمی بیشی سے ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اور یہ بالکل صحیح ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ "ابو بکر کو تم لوگوں پر جو ترجیح ہے۔ وہ کثرت صوم و صلوٰۃ کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اس چیز کی وجہ سے ہے جو اُسکے دل میں ہے" غرض امام صاحب کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ایمان بلحاظ کیفیت یعنی شدت و ضعف کے زیادہ و کم نہیں ہو سکتا بلکہ انکا یہ دعوی نہیں ہے کہ ایمان مقدار کے اعتبار سے کم و بیش نہیں ہوتا۔ یہ دعویٰ اسبات کی فرع ہے کہ اعمال جزو ایمان نہیں۔ اور اس کو ہم ابھی ثابت کر چکے ہیں۔

متعلق ایمان میں سب برابر ہیں

امام صاحب۔ اسبات کے بھی قائل تھے کہ متعلق ایمان میں کچھ تفاوت نہیں ہے یعنی معتقدات کے لحاظ سے سب مسلمان برابر ہیں۔ ایمان کے لئے جن مسائل پر اعتقاد رکھنا ضروری

ہے وہ سب کے لئے یکساں ہیں۔ صحابہ اور عام مسلمان اس لحاظ سے برابر ہیں۔ کہ دونوں ایک ہی چیز یعنے توحید و نبوت کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ فرق ہے۔ تو اعتقاد کی شدت و ضعف میں ہے۔ اسی مطلب کو امام صاحب نے۔ عثمان بتی کے جواب میں ان الفاظ سے بیان کیا ہے کہ دین اھل السماء والارض واحد یعنے آسمان اور زمین والوں کا ایک ہی دین ہے۔ پھر اس دعویٰ پر آیت قرآنی سے استدلال کیا ہے۔ شرع لکم من الدین ما وصیٰ بہ نوحا یعنے ہم نے تمہارے لئے وہی دین مشروع کیا جسکی وصیت نوحؑ کو کی تھی۔" مخالفین نے بڑے زور شور سے امام صاحب پر یہ الزام لگایا ہے۔ کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ میرا ایمان اور ابوبکر صدیقؓ کا ایمان برابر ہے۔" اگرچہ امام صاحب کیطرف اس قول کی اسناد ثابت نہیں لیکن اگر ثابت ہو تو کیا نقصان ہے۔ جس اعتبار سے وہ مساوات کے مدعی ہیں۔ اُس سے کسکو انکار ہو سکتا ہے۔ تعجب اور سخت تعجب ہے کہ ایسا صاف مسئلہ معترضوں کی سمجھ میں نہ آیا۔ خطیب بغدادی نے صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے۔ اور یہ نہ سمجھ سکے کہ امام صاحب کا دعویٰ کیا ہے۔ اُنکو یہ الفاظ نہایت گراں گذرتے ہیں۔ کہ "ہمارا اور صحابہ کا ایمان برابر ہے" وہ یہ نہیں سمجھتے کہ بہت سی چیزوں میں ہم اور صحابہؓ برابر ہیں۔ تاہم ہم میں اور صحابہؓ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اگرچہ اس قسم کے تمام مسائل میں امام صاحب اپنی خاص رائیں رکھتے تھے لیکن وہ مخالف رایوں پر کفر و فسق کا الزام نہیں لگاتے تھے۔ یہ فیاض دلی امام صاحب کا خاصہ ہے اور قرن اول کے بعد اسلام میں اسکی بہت کم نظیریں ملتی ہیں۔ اسلام کو کسی چیز نے ان جرات سے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا۔ جو اختلاف آراء کی بنا پر قائم ہو گئی۔ ان اختلافات کی بنیاد اگرچہ خود صحابہ کے زمانہ میں شروع ہو چکی تھی۔ عبداللہ بن عباسؓ اور بہت سے صحابہؓ کا اعتقاد تھا کہ رسول اللہ نے معراج میں خدا کو آنکھوں سے دیکھا۔ حضرت عائشہؓ نہایت اصرار سے اسکی مخالف تھیں۔ امیر معاویہ کو معراج جسمانی سے انکار تھا۔ حضرت عائشہ سماع موتی کی قائل نہ تھیں۔ لیکن اس زمانہ تک ان اختلافات پر ہدایت و گمراہی کا مدار نہ تھا۔ جو لوگ مختلف رائیں رکھتے تھے انہیں کبھی کسی نے کسی کی تکفیر یا تفسیق نہیں کی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایک شخص نے پوچھا۔ کہ کچھ لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ جو قرآن کی غلط تاویل کرتے ہیں اور ہم کو کافر قرار دیتے ہیں۔ وہ خود کافر ہیں یا نہیں۔" حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ اس وقت تک کوئی شخص کافر نہیں ہو سکتا۔ جب تک خدا کو دو نہ کہے۔ صحابہ کے بعد یہ اختلاف زور پکڑتے گئے۔ اور رفتہ رفتہ مستقل فرقے قائم ہو گئے۔ اعتقادی اور فقہی مسائل اکثر ایسے ہیں جنمیں نص قاطع موجود نہیں۔ اور ہیں تو متعارض ہیں۔ اسلئے استنباط

لہ [illegible] امام محمد صفحہ ۳۷۵

رفع تعارض کی ضرورت نے اجتہاد کو بہت وسعت دی۔ اور سینکڑوں رائیں قائم ہوگئیں بیشبہ انمیں بہت سی رائیں صحیح نہیں۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ وہ سب کفر ہوں۔

افسوس ہے کہ سرگرم طبعتیں۔ جو مذہبی جوش اور تقدس کے نشہ میں سرشار تھیں اختلاف رائے کے صدمہ کی تاب نہ لاسکیں۔ اور نہایت بے صبری سے مخالفت پر آمادہ ہوگئیں۔ بات بات پر کفر کے فتوے ہونے لگے۔ جو لوگ جسقدر زیادہ مذہبی حرارت رکھتے تھے اُسیقدر کفر کے اطلاق میں کم احتیاط کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہانتک نوبت پہنچی۔ کہ ہر فریق نے دوسرے کی ضلالت و گمراہی ثابت کرنیکے لئے۔ موضوع روایتوں نے اعانت کی۔ اور اس قسم کی حدیثیں ایجاد ہونے لگیں۔ کہ میری اُمت میں ۷۳ فرقے پیدا ہونگے جنمیں صرف ایک جنتی ہوگا۔ باقی سب دوزخی۔ اس فرضی تعداد کو پورا کرنا بھی ضرور تھا۔ اسلئے کھینچ تان کر ۷۳ فرقے قرار دئے ہیں۔ اور سب کے الگ الگ نام رکھے۔ اسپر بھی تسکین نہ ہوئی۔ تو ہر ہر فرقہ کے لئے جُدا جُدا روایتیں گڑھیں مثلاً القدریۃ مجوس ھذہ الامۃ وغیرہ وغیرہ

ان تعصبات اور جھگڑوں نے جماعت اسلامی کے تمام اجزا پراگندہ کردیئے۔ اور مذہب اخلاق حکومت۔ تمدن۔ معاشرت۔ سب کا نقشہ بگڑ گیا۔ اس عالمگیر آشوب میں صرف ایک امام ابوحنیفہ تھے۔ جنکی صدا سب سے الگ تھی۔ اور جو پکار کر کہتے تھے لا نکفر احدا من اھل القبلۃ یعنے "اہل قبلہ میں سے ہم کسی کو کافر نہیں سمجھتے"۔ اُسوقت، تو اس صدا پر چنداں توجہ نہیں ہوئی۔ لیکن زمانہ جسقدر ترقی کرتا گیا۔ اس جملہ کی قدر بڑھتی گئی۔ یہانتک کہ وہ علم کلام کا ایک بیش بہا اصول بنگیا۔ اگرچہ افسوس ہے۔ کہ اُسپر عمل کم کیا گیا۔ اور تکفیر کے شعلے اب بھی پست نہ ہوئے۔

امام صاحب کی یہ رائے نہایت غور و تحقیق و تجربہ کے بعد قائم ہوئی تھی۔ بڑے بڑے مشہور بانیان مذہب انہیں کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اور امام صاحب کو ان سے ملنے کا موقع حاصل ہوا۔ خارجیوں کا صدر مقام بصرہ تھا۔ جو امام صاحب کے شہر سے نہایت قریب تھا۔ واصل بن عطاء و عمر بن عبید جو مذہب اعتزال کے بانی اور مروج تھے۔ بصرہ ہی کے رہنے والے اور امام صاحب کے ہمعصر تھے۔ جہم بن صفوان۔ جسکے نام سے فرقہ جہمیہ مشہور ہے۔ اسی زمانہ میں تھا۔ امام صاحب ان میں سے اکثروں سے ملے۔ اور ان کے خیالات سے مطلع ہوئے تھے۔ ان فرقوں کی نسبت جو اقوال مشہور تھے کچھ تو سرے سے غلط اور افترا تھے۔ بعض کی تعبیر غلط طور پہ کیگئی تھی۔ بعض در اصل لغو و باطل تھے لیکن کفر کی حد تک نہ پہنچے تھے۔ اسی لئے امام ابوحنیفہ نے یہ عام حکم دیا کہ "اہل قبلہ سب مومن ہیں"

وہ دیکھ رہے تھے کہ جن مسائل پر دنیا ستیں برپا ہیں۔ جو کفر و اسلام کی معیار قرار دی گئی ہیں۔ وہ صرف لفظی بحثیں۔ اور فرضی اصطلاحیں ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ قدم قرآن کا تھا۔ جسکو لوگوں نے قریباً کلمۂ توحید کے برابر قرار دیا تھا۔ بڑے بڑے علما کا قول ہے۔ کہ اسلام کو دو شخصوں نے نہایت نازک وقتوں میں محفوظ رکھا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ جنہوں نے رسول اللہؐ کی وفات کے بعد مرتدین عرب کا استیصال کیا۔ اور امام احمد حنبلؒ جو مامون رشید کے زمانہ میں حدوث قرآن کے منکر رہے۔ بلکہ ایک اعتبار سے امام حنبل کو ترجیح ہے کیونکہ صحابہ حضرت ابو بکرؓ کے معاونؑ اور انصار تھے۔ لیکن امام حنبل کا کوئی مددگار نہ تھا۔ رجال کی کتابوں میں جب کسی شخص کو ثقہ اور مستند ثابت کیا جاتا ہے تو سب سے بڑی دلیل یہ پیش کیجاتی ہے کہ وہ حدوث قرآن کو کفر سمجھتا تھا: حالانکہ یہ صرف ایک لفظی بحث ہے۔ جو لوگ قرآن کو حادث کہتے تھے انکی غرض۔ ان الفاظ اور اصوات سے تھی۔ جس کا ظہور رسول اللہؐ کی زبان سے ہوا یا۔ جسپر عام طور سے قرآن کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ جو قدیم مانتے تھے وہ کلام سے کلام نفسی کو مراد لیتے تھے۔ جو خدا کی صفات میں سے ہے۔ امام ابو حنیفہ سے اس بارہ میں مختلف اقوال ہیں۔ اور وہ اسی تفصیل کی بنا پر ہیں۔ ایک شخص نے اُن سے پوچھا کہ قرآن حادث ہے یا قدیم فرمایا کہ "حادث۔ کیونکہ قرآن خدا نہیں۔ اور جو خدا نہیں وہ حادث ہے"۔[1]

غرض اس قسم کے مسائل نفیاً یا اثباتاً۔ نصی نہیں ہیں۔ اور اس وجہ سے وہ کفر و اسلام کے معیار نہیں ہو سکتے۔ امام ابو حنیفہ کی نکتہ شناسی کی بڑی دلیل یہ ہے۔ کہ اُنہوں نے اسلام کے دائرہ کو من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ کی وسعت رکھنا تھا اصلی وسعت پر قائم رکھا۔ افسوس ہے کہ انکی اس رائے پر بہت کم لحاظ کیا گیا۔ ورنہ امام غزالی محی الدین عربی۔ حضرت غوث الاعظم۔ ابن تیمیہ۔ ابو طالب مکی۔ کو ہم فقہا کی زبان سے کافر نہ سنتے

حدیث۔ اور اصول حدیث

یہ خیال اگرچہ غلط اور بالکل غلط ہے۔ کہ امام ابو حنیفہ۔ علم حدیث میں کم مایہ تھے تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ عام طور پر وہ محدث کے لقب سے مشہور نہیں۔ بزرگان سلف میں سینکڑوں ایسے گزرے ہیں۔ جو اجتہاد و روایت دونوں کے جامع تھے لیکن شہرت اسی صفت کے ساتھ ہوئی۔ جو انکا کمال غالب تھا۔ امام ابو حنیفہ کی تو حدیث میں کوئی تصنیف نہیں تعجب ہے کہ امام مالکؒ و امام شافعیؒ۔ بھی اس لقب کے ساتھ مشہور نہ ہوئے۔ نہ اُن کی

[1] کتاب الاوائل ابو ہلال عسکری ۱۲۱

تصنیفوں کو وہ قبول عام حاصل ہوا جو صحاح ستہ کو ہوا امام احمد بن حنبل۔ ان لوگوں کی نسبت علم حدیث میں زیادہ نام آور ہیں۔ انکی مسند کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ صحیح حدیثوں کا اتنا بڑا مجموعہ اور کوئی نہیں ملسکتا۔ لیکن جسقدر حدیث و روایت میں انکا زیادہ اعتبار ہے اسیقدر استنباط اور اجتہاد میں انکی نام آوری کم ہے۔ علامہ طبری نے جو خود بھی محدث اور مجتہد تھے۔ مجتہدین میں انکا شمار نہیں کیا[1] قاضی ابن عبد البر نے کتاب الانتہا فی الثلثہ الفقہا میں جو مجتہدین کے حالات میں ہے۔ امام ابو حنیفہ و امام مالک و امام شافعی پر اکتفا کی امام رازی۔ مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں کہ امام شافعی کے بعد کوئی مجتہد مطلق پیدا نہیں ہوا اگرچہ امام احمد حنبل کی نسبت گروہ کثیر علما کی یہی رائے تھی کہ وہ اجتہاد کامل کا منصب رکھتے تھے۔ تاہم انکے اجتہاد پر اتفاق عام نہ ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ مجتہد و محدث کی حیثیتیں الگ الگ ہیں۔ محدث۔ مواعظ۔ قصص۔ فضائل سیر۔ ہر ایک قسم کی روایتوں کا استقصا کرتا ہے بخلاف اسکے مجتہد کو زیادہ تر صرف ان احادیث سے غرض ہوتی ہے جن سے کوئی حکم شرعی مستنبط ہوتا ہے یہی سبب ہے کہ محدثین کی نسبت مجتہدین ہمیشہ قلیل الروایۃ ہوئے۔ موطا میں جو امام مالک کی تمام روایتوں کا مجموعہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہزار حدیثیں ہیں۔ جنمیں صحابہ اور تابعین کے اقوال بھی شامل ہیں۔ امام شافعی نے امام احمد حنبل کے سامنے اکثر اعتراف کیا ہے۔ کہ تم لوگ بہ نسبت ہمارے احادیث سے زیادہ واقف ہو۔ قاضی یحیی بن اکثم جو ترمذی کے شیخ ہیں حسرت سے کہا کرتے تھے کہ اگر امام شافعی نے علم حدیث کی طرف پوری توجہ کی ہوتی۔ تو ہم لوگوں کو سب سے بے نیاز کر دیا ہوتا۔ حافظ ابن حجر نے توالی التاسیس میں جو امام شافعی کے حالات میں ایک مختصر اور مفید رسالہ ہے جہاں امام شافعی کے شیوخ حدیث سے بحث کی ہے خاتمہ پر لکھا ہے کہ ولم یکثر من الشیوخ کعادۃ اہل الحدیث لقلۃ تبالہ علی الاشتغال بالفقہ" یعنے وہ بہت سے شیوخ سے نہیں ملے۔ جیسا کہ اہل حدیث کی عادت ہے۔ کیونکہ انکو فقہ کا شغل رہتا تھا[2]۔ حافظ ابن حجر نے امام شافعی کی نسبت قلت شیوخ کا جو سبب بیان کیا۔ امام ابو حنیفہ کی قلت روایت کا بھی وہی سبب ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ بعض لوگوں نے اس دائرہ کو زیادہ وسیع کیا۔ اور عموماً ان کی قلت روایت کے قائل ہوئے۔ یہ خیال کچھ نیا نہیں ہے۔ اگلے زمانہ میں بھی بعض بعض لوگوں کی یہ رائے تھی اور وہی غلط فہمی آجتک چلی آتی ہے۔

---

[1] طبقات المفسرین حافظ جلال الدین سیوطی ترجمہ علامہ طبری [2] توالی التاسیس لحافظ ابن حجر صفحہ ۸۰ و ۱۲

اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ امام ابو حنیفہ کے وہ واقعات جو منظرِ عام پر نمایاں ہیں اُن سے ایک ظاہر بیں شخص ایسی ہی رائے قائم کر سکتا ہے۔ حدیث میں اُن کی کوئی تصنیف موجود نہیں صحاح میں بجز ایک دو روایت کے اُنکا نام تک نہیں پایا جاتا۔ سب سے زیادہ یہ کہ اُنکی شہرت اہل الرائے لقب سے ہے جس کے تبادر ہوتا ہے۔ کہ حدیث سے اُنکو کم تعلق تھا۔

اس قدر ہم بھی تسلیم کرتے ہیں۔ کہ مغازی قصص سیر وغیرہ میں اُنکی نظر چنداں وسیع نہ تھی امام مالک و امام شافعی۔ کا بھی یہی حال تھا۔ لیکن احکام و عقائد کے متعلق امام ابو حنیفہ کو جو واقفیت اور تحقیق حاصل تھی۔ اس سے انکار کرنا۔ صرف کم نظری اور ظاہر بینی کا نتیجہ ہے۔ اُنکی تصنیف یا روائیتوں کا مدون نہ ہونا۔ قلتِ نظر کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابو بکر صدیق رض سے زیادہ کسی صحابی کو رسول اللہ کے ساتھ جلوت و خلوت میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ رسول اللہ کے اقوال و افعال سے جسقدر وہ واقف تھے۔ اور کون ہو سکتا تھا۔ لیکن حدیث کی تمام کتابوں میں اُنکی روایت سے جسقدر صحیح حدیثیں ہیں۔ اُنکی تعداد سترہ سے زیادہ نہیں۔ کون شخص کہہ سکتا ہے کہ اُنکو صرف اسیقدر حدیثیں معلوم تھیں۔ حضرت ابو بکر کے بعد عمر فاروق کا درجہ ہے۔ اُن سے بھی صرف پچاس حدیثیں مروی ہیں۔ جن میں سے بعض کا کافی ثبوت نہیں۔ حضرت عثمان رض۔ اور جناب امیر کا بھی یہی حال ہے۔ بخلاف انکے حضرت ابو ہریرہ رض سے ۵۳۷۴۔ انس رض سے ۲۲۸۶۔ عبداللہ بن عباس رض سے ۲۶۶۰۔ جابر سے ۱۵۴۰۔ عبداللہ بن عمر رض سے جو رسول اللہ کے زمانہ میں نوجوان تھے ۲۶۳۰ حدیثیں مروی ہیں۔ اگر روایتوں کا موجود ہونا ہی معیار ہے۔ تو خلفائے اربعہ کی نسبت تسلیم کرنا پڑیگا کہ یا اُن کا حافظہ ضعیف اور نہایت ضعیف تھا۔ یا دانستہ اُن کو رسول اللہ کے اقوال و افعال کیطرف التفات اور توجہ نہ تھی۔ وحاشاہم عن ذلک

یہ سچ ہے۔ کہ صحاح ستہ کے مصنفین نے امام صاحب سے روایت نہیں کی ۱دو ایک روایتیں مستثنٰی ہیں۔ لیکن اس الزام میں اور ائمہ بھی اُنکے شریک ہیں۔ امام شافعی جنکو بڑے بڑے محدثین مثلاً امام احمد حنبل۔ اسحاق بن راہویہ۔ ابو ثور۔ حمیدی۔ ابو زرعۃ الرازی ابو حاتم نے حدیث و روایت کا مخزن تسلیم کیا ہے۔ اُنکی مسند سے صحیحین میں ایک بھی

خلفائے اربعہ کی قلت روایت

بخاری و مسلم و امام شافعی کے واسطے سے کوئی حدیث روایت نہیں

۱؎ مناقب الشافعی للامام الرازی خلفائے اربعہ کی نسبت یہ تعداد میں نے امام شافعی کے قول کے موافق لکھی ہے۔ اور محدثین کے نزدیک اس سے زیادہ حدیثیں اُن لوگوں سے مروی ہیں۔ تاہم اسقدر تعداد نہیں پہنچتی۔ جسپر کثرتِ روایت کا اطلاق کیا جائے۔

روایت موجود نہیں۔ بلکہ بخاری و مسلم نے کسی اور تصنیف میں بھی امام شافعی کی سند سے کوئی روایت نہیں کی۔ امام رازی نے بخاری و مسلم کی اِس بے اعتنائی کی بہت سی تاویلیں کی ہیں۔ مگر کوئی معقول بات نہیں بتا سکے ہیں۔ پر موقوف نہیں ترمذی ابوداؤد ابن ماجہ۔ نسائی میں بھی بہت کم ایسی حدیثیں ہیں جنکے سلسلہ رواۃ میں امام شافعی کا نام آیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض محدثین نے۔ اعتماد اور استناد کا جو معیار قرار دیا تھا اُسمیں اہل نظر۔ بلکہ اکثر لوگوں کے لئے کم گنجائش تھی۔ علامہ قسطلانی نے شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے۔ کہ امام بخاری فرمایا کرتے تھے۔ کہ میں نے کسی ایسے شخص سے حدیث نہیں لکھی۔ جسکا یہ قول نہ تھا۔ کہ الا یمان قول و عمل[1] اگر یہ صحیح ہے تو امام ابوحنیفہ کو اُنکے دربار میں پہنچنے کی کیونکر اُمید ہو سکتی تھی۔

جو شخص عمل کو ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں سمجھتا تھا امام بخاری اُس سے روایت نہیں کرتے تھے

امام بخاری نے تاریخ کبیر میں امام شافعی کا ذکر کیا ہے لیکن جس بے پرواہی سے کیا ہے اُسکے لحاظ سے امام رازی نے یہی غنیمت سمجھا کہ تصنیف نہیں کی۔ چنانچہ امام شافعی کے فضائل میں فرماتے ہیں۔ واما الامام محمد بن اسمعیل البخاری فقد ذکر الشافعی فی تاریخه الکبیر وقال فی باب محمد بن ادریس بن عبد الله محمد الشافعی القرشی مات سنة اربع ومائتین ثم انه ما ذکره فی باب الضعفاء مع علمه بانه کان قد روی شیئا کثیرا من الحدیث ولو کان من الضعفاء فی هذا الباب لذکره[2]

یعنی امام بخاری نے شافعی کا ذکر تاریخ کبیر میں کیا ہے۔ چنانچہ فلاں باب میں لکھا ہے کہ محمد بن ادریس بن عبد اللہ محمد الشافعی القرشی نے ۲۰۴ھ میں وفات پائی لیکن اُنکو ضعفاء کے باب میں ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ امام بخاری جانتے تھے کہ شافعی نے بہت سی حدیثیں روایت کی ہیں۔ اور اگر وہ اس باب میں ضعیف ہوتے تو امام بخاری ضرور اُنکو ضعیف لکھتے۔

امام اوزاعی۔ جو محدث اور مجتہد مستقل تھے۔ اور بلاد شام میں اُنکا وہی اعزاز و اعتبار تھا جو عرب و عراق میں۔ امام مالک۔ و شافعی کا اُنکی نسبت کسی نے امام احمد حنبل سے رائے پوچھی۔ فرمایا کہ حدیث ضعیف و رائے ضعیف۔

لطف یہ ہے کہ مجتہدین۔ جس چیز پر فخر کر سکتے ہیں۔ وہ وقت نظر۔ قوت استنباط۔ استخراج مسائل۔ تفریع احکام ہے۔ لیکن محدثین کے ایک گروہ کے نزدیک یہی باتیں عیب و نقص میں داخل ہیں علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری۔ قاضی ابویوسف کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ اہل حدیث

[1] حافظ ابن حجر نے فتح الباری کے مقدمہ میں امام بخاری کا یہ قول نقل کیا ہے ۱۲

[2] مناقب الشافعی امام الرازی۔ باب ۷ ۱۲

میں سے ایک گروہ نے انکی روایت سے اس بنا پر احتراز کیا ہے۔ کہ ان پر رائے غالب تھی اور فروعِ احکام کی تفریع کرتے تھے۔ اِن باتوں کے ساتھ بادشاہ کی صحبت میں رہتے تھے۔ اور منصب قضا پر مامور تھے؛ اگر فروع اور احکام کا استنباط بھی جرم ہے تو بے شبہہ امام ابوحنیفہ قاضی ابویوسف سب سے زیادہ مجرم ہیں۔

البتہ یہ بات غور کے قابل ہے کہ امام ابوحنیفہ۔ اور انکے اتباع کو کیوں اہل الرائے کہا جاتا تھا۔ اس باب میں اکثر لوگوں نے غلطی کی ہے۔ جسکی وجہ یہ ہے۔ کہ انہوں نے شہرت عام کے مقابلہ میں تحقیق کی پروا نہ کی۔

اہل الرائے کی تحقیق وربیعۃ الرائے

اس بحث کے تصفیہ کیلئے سب سے پہلے یہ پتہ لگانا چاہیے کہ یہ لقب کب ایجاد ہوا۔ اور کن لوگوں پر اطلاق کیا گیا۔ جہانتک ہمکو معلوم ہے اس لقب کے ساتھ اول جسکو یہ امتیاز حاصل ہے۔ وہ ربیعۃ الرائے ہیں جو امام مالکؒ کے استاد اور شیخ الحدیث تھے۔ رائے کا لفظ انکے نام کا جزو بنگیا ہے اور تاریخ و اسماء الرجال میں ہمیشہ انکا نام ربیعۃ الرائے لکھا جاتا ہے یہ مشہور محدث اور فقیہ تھے۔ اور بہت سے صحابہؓ سے ملے تھے۔ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں انکا ذکر ان لفظوں سے کیا ہے۔ "تمام اصحاب کتب (یعنی صحاح ستہ) نے ان سے احتجاج کیا ہے۔ عبدالعزیز ماجشون کا قول ہے۔ کہ واللہ میں نے ربیعہ سے زیادہ کسی کو حافظ الحدیث نہیں دیکھا"؛

جو لوگ اہل الرائے کے لقب سے مشہور تھے

اسی زمانہ میں اور اسکے بعد اور لوگ بھی اس لقب سے پکارے گئے محدث بن قتیبہ نے کتاب المعارف میں اہل الرائے کی سُرخی سے ایک باب باندھا ہے اور عنوان کے نیچے یہ نام لکھے ہیں۔ ابن ابی لیلیٰ۔ ابوحنیفہ۔ ربیعۃ الرائے۔ زفر۔ اوزاعی۔ سفیان ثوریؒ۔ مالک بن انسؒ۔ ابویوسف قاضی۔ محمد بن حسن"۔ ابن قتیبہ نے ۲۷۶ھ میں وفات پائی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم تیسری صدی تک مذکورۂ بالا لوگ اہل الرائے کے لقب سے مشہور تھے۔ اگرچہ یہ سب لوگ درحقیقت (زفر کے سوا) محدث ہیں۔ لیکن امام مالک۔ سفیان۔ ثوری۔ امام اوزاعی کی شہرت تو محتاج بیان نہیں۔

محدثین کے دو گروہ تھے

اصل یہ ہے کہ جو لوگ علم حدیث کی درس و تدریس میں مشغول تھے انمیں دو فرقے قائم ہو گئے تھے۔ ایک وہ جنکا کام صرف حدیثوں اور روایتوں کا جمع کرنا تھا۔ وہ حدیث سے صرف من حیث الروایۃ بحث کرتے تھے۔ یہانتک کہ انکو ناسخ و منسوخ سے بھی کچھ سروکار نہ تھا۔ دوسرا فرقہ حدیثوں کو استنباطِ احکام اور استخراج مسائل کے لحاظ سے دیکھتا تھا اور اگر کوئی نص صریح نہیں ملتی تھی۔ تو قیاس سے کام لیتا تھا۔ اگرچہ یہ دونو حیثیتیں دونوں

فریق میں کسی قدر مشترک تھیں۔ لیکن وصفِ غالب کے لحاظ سے ایکدوسرے سے ممتاز تھا۔ پہلا فرقہ اہل الروایۃ اور اہل الحدیث اور دوسرا فرقہ مجتہد اور اہل الرائے کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ، اوزاعیؒ۔ اسلئے اہل الرائے کہلائے کہ وہ محدث ہونے کے ساتھ مجتہد مستقل اور بانی مذہب تھے لیکن چونکہ ان لوگوں میں بھی معلوماتِ حدیث اور قوت اجتہاد کے لحاظ سے۔ اختلاف مراتب تھا۔ اسلئے اضافی طور پر کبھی کبھی اس فرقہ میں سے ایک کو اہل الرائے اور دوسرے کو اہل حدیث کہتے تھے۔ مثلاً امام مالکؒ کی بہ نسبت امام ابوحنیفہ پر مجتہد اور اہل الرائے کا لقب زیادہ موزوں تھا۔ امام احمد حنبلؒ سے ایک بار نضر بن یحییٰؒ نے پوچھا کہ آپ لوگوں کو ابوحنیفہ پر کیا اعتراض ہے"؟ انہوں نے جواب دیا کہ "رائے" نضر نے کہا کہ کیا امام مالک رائے پر نہیں عمل کرتے۔ امام احمد بن حنبلؒ بولے کہ ہاں لیکن ابوحنیفہ رائے کو زیادہ دخل دیتے ہیں۔ نضر نے کہا تو حصہ رسدی کے موافق دونوں پر الزام آنا چاہئے نہ صرف ایک پر امام احمد حنبلؒ کچھ جواب نہ دیسکے اور چپ ہو گئے۔[1]

امام صاحب کے اہل الرائے کے لقب سے مشہور ہونے کی وجہ

امام ابوحنیفہ سے پہلے فقہ۔ کوئی مستقل اور مرتب فن نہ تھا۔ امام صاحب نے جب اسکی تدوین کیطرف توجہ کی تو ہزاروں مسئلے ایسے پیش آئے جنمیں کوئی حدیث صحیح۔ بلکہ صحابہ کا قول بھی موجود نہ تھا۔ اس لئے انکو قیاس سے کام لینا پڑا۔ قیاس پر گو پہلے بھی عمل تھا۔ خود صحابہؓ قیاس کرتے تھے۔ اور اسکے مطابق فتوے دیتے تھے (اسکا مفصل بیان آگے آئیگا) لیکن اسوقت تک تمدن کو چنداں وسعت حاصل نہ تھی۔ اسلئے نہ کثرت سے واقعات پیش آتے تھے۔ نہ چنداں قیاس کی ضرورت پڑتی تھی۔ امام صاحب نے فقہ کو مستقل فن بنانا چاہا۔ تو قیاس کی کثرت استعمال کے ساتھ اسکے اصول و قواعد بھی مرتب کرنے پڑے۔ اس بات نے انکو رائے اور قیاس کے انتساب سے زیادہ شہرت دی۔ چنانچہ تاریخوں میں جہاں انکا نام لکھا جاتا ہے۔ امام اہل الرائے لکھا جاتا ہے۔

ایک اور وجہ

اس شہرت کی ایک اور وجہ ہوئی۔ عام محدثین نے حدیث و روایت میں درایت سے بالکل کام نہیں لیتے تھے۔ امام ابوحنیفہ نے اسکی ابتدا کی۔ اور اسکے اصول و قواعد منضبط کیے۔ انہوں نے بہت سی حدیثیں اس بنا پر قبول نہیں کیں کہ اصولِ درایت کے موافق ثابت نہ تھیں۔ اسلئے اس لقب کو زیادہ شہرت ہوئی کیونکہ درایت۔ اور رائے مترادف سے الفاظ ہیں۔ اور کم از کم یہ کہ عام لوگ ان دونوں میں فرق نہیں کر سکتے تھے۔

امام ابوحنیفہ کا محدث اور حافظ الحدیث ہونا

ان عارضی بحثوں کے بعد ہم اصل مسئلہ پر متوجہ ہوتے ہیں یعنی یہ کہ امام ابوحنیفہ کو فن حدیث میں کیا رتبہ حاصل تھا۔ اس بحث کے فیصلے کے لئے امام کی علمی زندگی کے ان واقعات پر نظر ڈالنی چاہیے جو نہایت صحیح اور مستند روایتوں سے ثابت ہیں۔ اس کتاب کے پہلے حصہ میں ہم امام ابوحنیفہ کی تحصیل حدیث کے حالات۔ ان کتابوں کی سند سے لکھ آئے ہیں۔ جن پر

[1] عقود الجمان۔ خاتمہ۔ فصل اول ۱۲

فن رجال کا دار و مدار ہے۔ اب غور کرو کہ جس شخص نے بیس برس کی عمر سے جو فہم کی درستی اور پختگی کا زمانہ ہے۔ علم حدیث پر توجہ کی ہو۔ اور ایک مدت تک اس شغل میں مصروف رہا ہو جس نے کوفہ کے مشہور شیوخ حدیث سے حدیثیں سیکھی ہوں۔ جو حرم محترم کی درسگاہوں میں برسوں تحصیل حدیث کرتا رہا ہو۔ جسکو مدینہ منورہ کے شیوخ نے سند فضیلت دی ہو۔ جسکے اساتذہ حدیث عطا بن ابی رباح۔ نافع بن عمر۔ عمر بن دینار۔ محارب بن دثار۔ اعمش کوفی۔ امام باقر۔ علقمہ بن مرثد۔ مکحول شامی۔ امام اوزاعی۔ محمد بن مسلم الزہری۔ ابو اسحٰق السبیعی۔ سلیمان بن یسار۔ عبد الرحمن بن ہرمز الاعرج۔ منصور المعتمر۔ ہشام بن عروہ۔ وغیرہ ہوں۔ جو فن روایت کے ارکان ہیں اور جنکی روایتوں سے بخاری و مسلم مالامال ہیں۔ وہ حدیث میں کس رتبہ کا شخص ہوگا؟

[1] اسکے ساتھ۔ امام صاحب کے شاگردوں پر لحاظ کرو۔[2] یحیٰی بن سعید القطان جو فن جرح و تعدیل کے امام ہیں۔ عبد الرزاق بن ہمام جنکے جامع کبیر سے امام بخاری نے فائدہ اٹھایا ہے۔ یزید بن ہارون۔ جو امام احمد حنبل کے استاد تھے۔ وکیع بن الجراح جنکی نسبت امام احمد حنبل کہا کرتے تھے کہ حفظ اسناد روایت میں میں نے انکا ہمسر کسی کو نہیں دیکھا۔ عبد اللہ بن المبارک جو فن حدیث میں امیر المومنین تسلیم کئے گئے ہیں۔ یحیٰی بن زکریا بن ابی زائدہ جنکو علی بن المدینی (استاد بخاری) منتہائے علم کہلاتے تھے۔ یہ لوگ برائے نام امام صاحب کے شاگرد نہ تھے بلکہ برسوں انکے دامن فیض میں تعلیم پائی تھی۔ اور اس انتساب پر انکو فخر و ناز تھا۔ عبد اللہ بن المبارک کہا کرتے تھے۔ کہ اگر خدا نے ابو حنیفہ و سفیان ثوری سے میری مدد نہ کی ہوتی۔ تو میں ایک معمولی آدمی ہوتا۔ وکیع۔ اور یحیٰی بن ابی زائدہ۔ امام صاحب کی صحبت میں اتنی مدت تک رہے تھے کہ صاحب ابی حنیفہ کہلاتے تھے کیا اس رتبہ کے لوگ جو خود حدیث و روایت کے پیشوا اور مقتدا تھے۔ کسی معمولی شخص کے سامنے سر جھکا سکتے تھے؟

اجتہاد کے شرط اور امام ابو حنیفہ کا مجتہد مطلق ہونا

ان باتوں کے علاوہ امام ابو حنیفہ۔ کا مجتہد مطلق ہونا ایک ایسا مسلم مسئلہ ہے جس سے بارہ سو برس کی مدت میں شاید ایک آدھ ہی شخص نے انکار کیا ہو۔ اجتہاد کی تعریف: علمائے حدیث مثلاً۔ بغوی۔ رافعی۔ علامہ نووی وغیرہ نے ان لفظوں میں کی ہے[3] "مجتہد وہ شخص ہے جو قرآن۔ حدیث۔ مذاہب سلف۔ لغت۔ قیاس۔ ان پانچ چیزوں میں کافی دستگاہ رکھتا ہو۔ یعنے مسائل شرعیہ کے متعلق جسقدر قرآن میں آیتیں ہیں۔ جو حدیثیں رسول اللہ سے ثابت ہیں۔ جسقدر علم لغت درکار ہے سلف کے جو اقوال ہیں۔ قیاس کے جو طریقے ہیں۔ قریب کل کے جانتا ہو۔ اگر انمیں سے کسی میں کمی ہے۔ تو وہ مجتہد نہیں ہے اور اس کو تقلید کرنی چاہئے

[1] ان لوگوں کا تذکرہ اس کتاب کے خاتمہ میں کسیقدر تفصیل کے ساتھ مذکور ہے ۱۲۔ [2] تہذیب التہذیب ترجمہ امام ابو حنیفہ ۱۲
[3] عقد الجید شاہ ولی اللہ صاحب بحث حقیقت اجتہاد ۱۲۔

اسی بنا بر علامہ ابن خلدون نے فصل علوم الحدیث میں مجتہدین کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ "بعض نا انصاف مخالفین کا قول ہے کہ ان مجتہدوں میں سے بعض، فن حدیث میں کم مایہ تھے۔ اسلئے انکی روایتیں کم ہیں لیکن یہ خیال غلط ہے۔ ائمہ کبار کی نسبت یہ گمان نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ شریعت۔ قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے۔ پس جو شخص حدیث میں کم مایہ ہے۔ اسکو تلاش اور کوشش کرنی چاہیئے۔ تاکہ دین کو اصول صحیحہ سے اخذ کر سکے۔" اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ "فن حدیث میں امام ابو حنیفہ کا کبار مجتہدین میں ہونا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کا مذہب محدثین میں معتبر خیال کیا جاتا ہے۔ اور رداً و قبولاً اُس سے بحث کیجاتی ہے"[1] علامہ موصوف نے اسکا سبب بھی بتایا ہے کہ امام ابو حنیفہ کی روایتیں کم کیوں ہیں۔ ہم خود اسکو مفصل لکھینگے۔

محدثین میں بھی اکثروں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ علامہ ذہبی نے جو زمانہ مابعد کے تمام محدثین کے پیشوا اور امام ہیں۔ حفاظ حدیث کے حالات میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ کہ "یہ اُن لوگوں کا تذکرہ ہے جو علم نبوی کے حامل ہیں اور جنکے اجتہاد پر توثیق اور تصنیف تصحیح و تزئیف میں رجوع کیا جاتا ہے" علامہ موصوف نے تمام کتاب میں اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور کسی ایسے شخص کا حال نہیں۔ جو علم حدیث کا بڑا ماہر ہوا چنانچہ خارجہ بن زید بن ثابت۔ کا ضمناً ایک موقع پر ذکر آگیا ہے۔ تو لکھتے ہیں۔ کہ "میں نے انکو حفاظ حدیث میں اسلئے ذکر نہیں کیا کہ وہ قلیل الحدیث تھے"۔ امام ابو حنیفہ کے محدث ہونیکا اس سے زیادہ کیا ثبوت درکار ہے کہ علامہ ذہبی نے اس کتاب میں انکا ترجمہ لکھا ہے اور انکو حفاظ حدیث سے شمار کیا ہے۔

حافظ ابو المحاسن دمشقی شافعی نے عقود الجمان میں ایک خاص باب باندھا ہے جسکے یہ الفاظ ہیں۔ الباب الثالث والعشرون۔ فی بیان کثرۃ حدیثہ وکونہ من اعیان الحفاظ المحدثین یعنی تیئسواں باب اس بیان میں کہ وہ (امام ابو حنیفہ) کثیر الحدیث اور اعیان الحفاظ سے تھے"۔ قاضی ابو یوسف صاحب جنکو یحیی بن معین۔ صاحب الحدیث کہتے تھے۔ اور علامہ ذہبی نے انکو حفاظ حدیث میں محسوب کیا ہے۔ انکا بیان ہے کہ "ہم لوگ امام ابو حنیفہ سے مسائل میں بحث کرتے ہوتے تھے۔ جب انکی رائے قائم ہو جاتی تھی۔ تو میں حلقۂ درس

[1] تعجب ہے کہ اس تصریح کے ہوتے ہوئے بعض کوتاہ بینوں نے امام صاحب کی ناواقفیت حدیث پر ابن خلدون کے ایک ضمنی قول سے استدلال کیا ہے جسکو خود ابن خلدون نے ایسے لفظوں سے بیان کیا ہے جو ضعف اور عدم وثوق پر دلالت کرتا ہے ۱۲

سے اُٹھکر کوفہ کے محدثین کے پاس جاتا تھا۔ اور ان سے اُس مسئلہ کے متعلق حدیثیں دریافت کرکے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔

امام صاحب اُن حدیثوں میں سے بعض کو قبول کرتے تھے۔ بعض کو فرماتے تھے کہ صحیح نہیں۔ میں پوچھتا کہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا۔ فرماتے کہ کوفہ میں جو علم ہے۔ میں اُسکا عالم ہوں۔ یہ تمام باتیں اس بات کی شاہد ہیں کہ علم حدیث میں امام ابوحنیفہ کا کیا پایہ تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں نے امام ابوحنیفہ کو امام ابوحنیفہ نہیں بنایا۔ اگر وہ حافظ الحدیث تھے۔ تو اور لوگ بھی تھے۔ اگر اُنکے شیوخ حدیث کئی سو تھے تو بعض ائمہ سلف کے شیوخ کئی کئی ہزار تھے۔ اگر اُنہوں نے کوفہ و حرمین کی درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی۔ تو اوروں نے بھی یہ شرف حاصل کیا تھا۔ امام ابوحنیفہ کو جس بات نے تمام ہمعصروں میں امتیاز دیا وہ اور چیز ہے جو ان سب باتوں سے بالاتر ہے۔ یعنی احادیث کی تنقید اور بلحاظ ثبوت احکام۔ اُنکے مراتب کی تفریق امام ابوحنیفہ کے بعد علم حدیث کو بہت ترقی ہوئی غیر مرتب اور پریشان حدیثیں یکجا کی گئیں۔ صحاح کا التزام کیا گیا۔ اصول حدیث کا مستقل فن قائم ہو گیا۔ جسکے متعلق سینکڑوں بیش بہا کتابیں تصنیف ہوئیں۔ زمانہ اسقدر ترقی کر گیا ہے۔ باریک بینی اور دقت آفرینی کی کوئی حد نہیں رہی تجربہ اور دقت نظر نے سینکڑوں نئے نکتے ایجاد کئے۔ لیکن تنقید احادیث اصول درایت امتیاز مراتب میں امام ابوحنیفہ کی تحقیق کی جو حد ہے آج بھی ترقی کا قدم اُس سے آگے نہیں بڑھتا۔

اس اجمال کی تفصیل اُسوقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ فن حدیث کی آغاز اور طرز ترقی کا اجمالی نقشہ کھینچا جائے جس سے ظاہر ہو کہ روایتوں کا سلسلہ کیونکر پیدا ہوا۔ اور کس کس دور میں اُسکی کیا کیا حالتیں بدلیں۔ اسی سے اسبات کا اندازہ ہو سکے گا کہ احادیث کی تنقید میں اجتہاد و رائے کا کس قدر کام ہے۔ اور امام ابوحنیفہ کو اس لحاظ سے اپنے تمام ہمفنوں میں کیا خاص امتیاز حاصل ہے۔

سلسلہ ... مختصر تاری...

اسناد و روایت کا سلسلہ اگرچہ رسول اللہ کے عہد مبارک ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ لیکن اُسوقت تک جسقدر تھا۔ نہایت سادہ اور قدرتی صورت میں تھا۔ آغاز نبوت سے تیرہ برس کا زمانہ تو ایسا پُر آشوب زمانہ تھا کہ صحابہ کو اپنی جان کی پڑی تھی۔ اسناد و روایت کا کہاں موقع تھا۔ اسی ضرورت سے احکام و فرائض بھی کم تھے۔ یعنی نماز کے سوا اور کچھ فرض نہ ہوا تھا کیونکہ اس جمعیت میں اور فرائض کی تکلیف۔ تکلیف مالایطاق سے کم نہ تھی۔ نمازیں بھی مختصر تھیں۔ یعنی ظہر عصر۔ عشا سب میں صرف دو دو رکعتیں فرض تھیں۔ جمعہ و عیدین سے کے سے مامور بہ نہ تھے سنہ ۲ ہجری میں یعنی نبوت سے تیرھویں برس روزے فرض ہوئے۔ زکوٰۃ کی نسبت

اختلاف ہے علامہ ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ ۹ھ میں فرض ہوئی"۔ حج کا حکم بھی اسی سنہ میں ہوا۔ غرض آغاز نبوت سے ایک مدت تک نماز کے سوا نہ اور احکام صادر ہوئے تھے۔ نہ اُنکے متعلق حدیثیں اور روایتیں پیدا ہوئی تھیں۔ صحابہؓ۔ مسائل و احکام نئے جلتی زیادہ پرس و جو نہیں کرتے تھے۔ خود قرآن میں حکم آچکا تھا لا تسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسؤکم۔ عبداللہ بن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے رسول اللہؐ کے اصحابؓ سے کسی قوم کو بہتر نہیں دیکھا۔ تمام زمانہ نبوتؐ میں صرف ۱۳ مسئلے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھے جو سب قرآن میں مذکور ہیں[1]"۔ اور صحابہؓ سے بھی اسی قسم کے اقوال منقول ہیں۔

جو احکام اور واقعات پیش آتے تھے انھیں بھی روایت کا سلسلہ کم جاری ہوا تھا۔ صحابہؓ خود رسول اللہؐ سے پوچھ لیا کرتے تھے۔ اور واسطہ و روایت کی کم ضرورت پڑتی تھی۔ حدیثوںؐ کی قلم بند کرنے کی اجازت نہ تھی۔ صحیح مسلم میں روایت ہے کہ لا تکتبوا عنی شیئا الا القرآن ومن کتب عنی شیئا غیر القرآن فلیمحہ۔ رسولؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت شروع ہوئی ابتداء ہی میں عرب کی بغاوت عام کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس سے فارغ ہو کر روم و ایران کی مہمیں شروع ہو گئیں۔ اور اُنکی مختصر خلافت میں حدیثوںؐ کی چنداں اشاعت نہ ہو سکی۔ حضرت عمرؓ نے سات برس خلافت کی۔ اور ملک میں نہایت امن و امان رہا۔ لیکن وہ دانستہ حدیثوںؐ کی کثرت کو روکتے رہے۔ علامہ ذہبی نے طبقات الحفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ اس خوف سے کہ حدیثؐ بیان کرنے والا رسول اللہؐ کی طرف غلط روایت منسوب نہ کر دے۔ صحابہؓ کو ہمیشہ حکم دیتے تھے کہ حدیثیںؐ کم بیان کیا کریں[2]"ایک بار انصار کے ایک گروہ کو کوفہ بھیجا۔ چلتے وقت اُن سے فرمایا کہ "تم لوگ کوفہ جا رہے ہو۔ وہاں ایک قوم سے ملو گے جو بڑی رقت سے قرآن تلاوت کرتے ہیں۔ وہ تمہاری آمد سنکر مشتاق ہونگے کہ رسول اللہؐ کے اصحابؓ آئے ہیں رسول اللہؐ کے اصحابؓ آئے ہیں لیکن جب وہ تمہارے پاس آئیں۔ اور حدیثیںؐ سننی چاہیں۔ تو زیادہ حدیثیں نہ بیان کرنا[3]"۔ اسی طرح عراق کو صحابہؓ جانے لگے۔ تو حضرت عمرؓ نے خود اُنکی مشایعت کی۔ اور اُن سے پوچھا کہ "جانتے ہو! میں کیوں تمہارے ساتھ آرہا ہوں"؟ لوگوں نے کہا تکرمۃ علینا۔ یعنی ہماری عزت افزائی کے لئے فرمایا کہ "ہاں لیکن ایک اور مقصد ہے۔ وہ یہ کہ جہاں جا رہے ہو۔ وہاں لوگ اکثر قرآن کی تلاوت کیا کرتے ہیں۔ اُن کو حدیثوںؐ میں نہ پھنسا لینا۔ اور رسول اللہؐ سے کم روایت کرنا چنانچہ جب یہ لوگ قرظہ پہنچے۔ تو لوگ یہ سنکر کہ صحابہؓ تشریف لائے ہیں۔ زیارت کو آئے

حضرت عمرؓ کثرت روایت کو روکتے تھے

[1] مسند دارمی ۱۲۔ [2] طبقات الحفاظ ترجمہ حضرت عمر ۱۲۔ [3] مسند دارمی ۱۲۔

اور حدیثوں کی خواہش ظاہر کی۔ ان لوگوں نے اس بنا پر انکار کیا کہ حضرت عمرؓ نے منع کیا ہے[1]۔ حضرت ابوہریرہؓ سے ابو سلمہ نے پوچھا۔ کہ آپ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی اس طرح حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔ بولے کہ "نہیں ورنہ عمرؓ دُرّہ مارتے"[2]۔

حدیثوں کا وضع کیا جانا

حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ کی مجموعی خلافت بیس اکیس برس رہی۔ اسمیں احادیث کی زیادہ اشاعت ہوئی۔ صحابہؓ دور دور پہنچ گئے تھے۔ ضرورتیں بڑھتی جاتی تھیں۔ نئے نئے مسئلے پیش آتے تھے۔ ان اسباب نے حدیث و روایت کے سلسلہ کو بہت وسعت دی۔ حضرت عثمانؓ کے آخیر زمانہ میں بغاوت ہوئی جسکا خاتمہ خلیفۂ وقت کی شہادت پر ہوا۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ جماعت اسلام میں فرقہ بندیاں قائم ہوئیں۔ حضرت علیؓ کی خلافت شروع ہی سے پُر آشوب رہی۔ ان اختلافات اور فتن کے ساتھ وضع احادیث کی ابتدا ہوئی۔ اور اگرچہ کثرت اور انتشار زیادہ تر زمانۂ مابعد میں ہوا۔ لیکن خود صحابہؓ کے عہد میں اہل بدعت نے سینکڑوں ہزاروں حدیثیں ایجاد کرلی تھیں۔ مقدمہ صحیح مسلم میں ہے کہ ایکبار بشیر عدوی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس آیا اور حدیث بیان کرنی شروع کی۔ اُنہوں نے کچھ خیال نہ کیا بشیر نے کہا ابن عباسؓ! میں رسول اللہ سے روایت کر رہا ہوں۔ اور تم متوجہ نہیں ہوتے"۔ فرمایا کہ "ایک زمانہ میں ہمارا یہ حال تھا کہ کسیکو قال رسول اللہ کہتے سنتے تھے تو فوراً ہماری نگاہیں اُٹھ جاتی تھیں۔ اور کان لگاکر سُنتے تھے۔ لیکن جب سے لوگوں نے نیک و بد میں تمیز نہیں کی ہم صرف اُن حدیثوں کو سنتے ہیں۔ جنکو ہم خود بھی جانتے ہیں"۔

زبانی روایت سے گزر کر تحریروں میں بھی جعل شروع ہوگیا تھا۔ مسلم نے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ عبداللہ بن عباسؓ۔ حضرت علیؓ کے ایک فیصلہ کی نقل لے رہے تھے۔ بیچ بیچ میں الفاظ چھوڑتے جاتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ "واللہ علیؓ نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا ہوگا"۔ اسی طرح ایک اور دفعہ عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت علیؓ کی ایک تحریر دیکھی۔ تو تھوڑے سے الفاظ کے سوا باقی سب عبارت مٹا دی۔

وضع حدیث اور روایت میں بے احتیاطی کے اسباب

لوگوں کو وضع حدیث کی زیادہ جرأت اس وجہ سے ہوتی تھی۔ کہ اُسوقت تک اسناد و روایت کا طریقہ جاری نہیں ہوا تھا۔ جو شخص چاہتا تھا قال رسول اللہ کہدیتا تھا۔ اور اثبات مسند کے مواخذہ سے بری رہتا تھا۔ ترمذی نے کتاب العلل میں امام ابن سیرین سے روایت کی ہے کہ "پہلے زمانہ میں لوگ اسناد نہیں پوچھا کرتے تھے جب فتنہ پیدا ہوا تو اسناد کی پوچھ گچھ ہوئی۔ تاکہ اہل سنت کی حدیثیں لیجائیں۔ اور اہل بدعت کی ترک کیجائیں۔

[1] طبقات الحفاظ۔ ترجمہ حضرت عمر فاروقؓ ۱۲ [2] طبقات الحفاظ۔ ترجمہ عمر فاروقؓ ۱۲

لیکن حدیث کی بے اعتباری اہل بدعت پر موقوف نہ تھی۔ اسلیئے یہ احتیاط چنداں مفید نہ ہوئی اور غلطیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

بنوامیہ۔ کا دور شروع ہوا اور بڑے زور شور سے حدیث نے ترویج پائی۔ صحابہؓ کی تعداد جسقدر کم ہوتی جاتی تھی۔ اُسیقدر اُنکی قدر اور اُنکی طرف التفات بڑھتا جاتا تھا۔ تمدن میں بہت کچھ ترقی ہوگئی تھی۔ نئی نئی قومیں مسلمان ہوتی جاتی تھیں۔ اِن نو مسلموں کو ادھر تو اسلام کا نیا نیا جوش تھا۔ اُدھر۔ قوم فاتح کے مجمع میں عزت و اثر پیدا کرنے کی اس سے بڑھکر کوئی تدبیر نہ تھی۔ ان باتوں نے اُنکو معلومات مذہبی کا اسقدر شایق بنا دیا تھا کہ خود عرب اُنکی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔ غرض تمام ممالک اسلامیہ میں گھر گھر حدیث و روایت کے چرچے پھیل گئے اور سینکڑوں ہزاروں درسگاہیں قائم ہوگئیں۔

لیکن جسقدر اشاعت کو وسعت حاصل ہوتی جاتی تھی۔ اعتماد اور صحت کا معیار کم ہوتا جاتا تھا ارباب روایت کا دائرہ اسقدر وسیع تھا کہ اُسمیں مختلف خیال مختلف عادات مختلف عقاید مختلف قوم کے لوگ شامل تھے۔ اہل بدعت جا بجا پھیل گئے تھے۔ اور اپنے مسائل کی ترویج میں مصروف تھے۔ سب سے زیادہ یہ کہ پوری ایک صدی گزر جانے پر بھی کتابت کا طریقہ مروج نہیں ہوا تھا۔ ان اسباب سے روایتوں میں اسقدر بے احتیاطیاں ہوئیں کہ موضوعات اور اغالیط کا ایک دفتر بے پایان طیار ہوگیا۔ یہانتک کہ امام بخاری نے اپنے زمانہ میں صحیح حدیثوں کو جدا کرنا چاہا تو کئی لاکھ میں سے انتخاب کر کے جامع صحیح لکھی۔ جسمیں کل ۷۲۹۷ حدیثیں ہیں کس میں بھی اگر مکررات نکال ڈالی جائیں۔ تو صرف ۲۷۶۱ حدیثیں باقی رہتی ہیں۔

سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں حدیثیں دانستہ لوگوں نے وضع کرلیں۔ حماد بن زید کا بیان ہے کہ چودہ ہزار حدیثیں صرف ایک فرقہ زنادقہ نے وضع کرلیں۔ عبد الکریم وضاع نے خود تسلیم کیا تھا کہ چار ہزار حدیثیں اُسکی موضوعات سے ہیں بہت سے ثقات اور پارسا تھے۔ جو نیک نیتی سے فضائل اور ترغیب میں حدیثیں وضع کرتے تھے۔ حافظ زین الدین عراقی لکھتے ہیں کہ "ان حدیثوں نے بہت ضرر پہنچایا۔ کیونکہ ان واضعین کی تقدس اور تورع و زہد کی وجہ سے یہ حدیثیں اکثر مقبول ہوگئیں اور رواج پاگئیں۔

وضع کے بعد۔ تساہلات۔ غلط فہمیاں۔ بے احتیاطیوں کا درجہ تھا۔ جسکی وجہ سے ہزاروں اقوال رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بے قصد منسوب ہوگئے۔ بعض محدثین کا قاعدہ تھا۔ کہ حدیث کے ساتھ حدیث کی تفسیر بھی بیان کرتے جاتے تھے۔ اور اکثر حروف تفسیر حذف کر دیتے تھے

زنادقہ نے چودہ ہزار حدیثیں وضع کیں ایک شخص نے چار ہزار حدیثیں وضع کیں

۵۱ فتح المغیث صفحہ ۱۰۸، ۵۲ فتح المغیث صفحہ ۱۰۸-۱۲

جس سے سامعین کو دھوکا ہوتا تھا اور وہ اُنکے تفسیری جملوں کو بھی حدیث مرفوع سمجھ لیتے تھے۔ تعجب یہ ہے کہ اس قسم کے مسامحات بڑے بڑے ایمہ فن سے صادر ہوئے۔ امام زہری۔ جو امام مالک کے اُستاد۔ اور حدیث کے ایک بڑے رکن تھے۔ اُنکی نسبت، علامہ سخاوی لکھتے ہیں۔ ولکن اکان الزہری یفسر الحدیث کثیرا وربما اسقط اداۃ التفسیر یعنی اُسیطرح۔ زہری اکثر حدیث کی تفسیر کرتے تھے۔ اور وہ حروف جن سے اُس عبارت کا تفسیر ہونا ظاہر ہو۔ چھوڑ دیا کرتے تھے۔" وکیع کا بھی یہی حال تھا۔ وہ اکثر حدیث کے بیچ بیچ میں "یعنی" کہکر مطلب بیان کرتے جاتے۔ اور اکثر "یعنی" کا لفظ چھوڑ دیتے تھے جس سے سامعین کو اشتباہ ہوتا تھا۔ کتب رجال و اصول حدیث میں اس قسم کی اور بہت مثالیں ملتی ہیں۔

بڑی آفت تدلیس کی تھی جسکا ارتکاب بڑے بڑے ایمہ فن کرتے تھے۔ اس تدلیس نے اسناد کے اتصال کو بالکل مشتبہ کر دیا تھا۔ اُنکے سوا اور بہت سی بے احتیاطیاں تھیں جنکی تفصیل حدیث کی کتابوں میں مل سکتی ہے۔

غرض امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں احادیث کا جو دفتر طیار ہو چکا تھا۔ ہزاروں۔ موضوعات و مغالیط۔ ضعاف و مدرجات سے بھرا ہوا تھا۔ اُسوقت امام بخاری و مسلم نہ تھے۔ جو صحیح حدیثوں کے انتخاب کی کوشش کرتے۔ امام ابوحنیفہ گو مہمات فقہ کی وجہ سے اسطرف متوجہ نہ ہو سکے تاہم اُنہوں نے روایتوں کی تنقید کی بنیاد ڈالی۔ اور اُسکے اصول و ضوابط قرار دیے۔ اُنکے اصولِ تنقید نہایتِ سخت خیال کیے گئے ہیں۔ یہانتک کہ محدثین نے اُنکو مشدد فی الروایۃ کا لقب دیا ہے۔ تمام اور محدثین کی بہ نسبت امام صاحب کی قلیل الروایۃ ہونے کی ایک یہ بھی وجہ ہے۔ بلکہ تمام اور وجوہ کی بہ نسبت زیادہ یہی سبب ہے علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں

والامام ابوحنیفۃ انما قلت روایتہ لما شدد فی شروط الروایۃ والتحمل

یعنی ابوحنیفہ کی روایتیں اسلیئے کم ہیں کہ اُنہوں نے روایت اور تحمل کی شروط میں سختی کی۔"

حدیث کے متعلق پہلا اجمالی خیال جو امام صاحب کے دل میں پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ بہت کم حدیثیں ہیں جو صحیح ہیں۔ یا یہ کہ بہت کم حدیثیں ہیں جنکی صحت کا کافی ثبوت موجود ہے یہ صدا اگرچہ جدت کی وجہ سے کسیقدر نامانوس صدا تھی۔ اور اسی وجہ سے بعض بعض ارباب حدیث نے نہایت سخت مخالفت کی۔ لیکن امام صاحب اِس خیال پر مجبور بلکہ معذور تھے۔ اُنہوں نے یہ رائے مقلدانہ نہیں قائم کی تھی۔ وہ اپنے زمانہ کے اکثر مشہور شیوخ سے ملے تھے اور اُنکے سرمایۂ حدیث سے متمتع ہوئے تھے۔ حرمین کی بڑی بڑی درسگاہوں میں برسوں تعلیم پائی

امام صاحب کا خیال تھا کہ بہت کم حدیثیں صحیح ہیں

تھی۔ کوفہ۔ بصرہ۔ حرمین۔ میں ارباب روایت کا جو گروہ موجود تھا۔ برسوں کے تجربہ سے
اُنکے ذاتی اوصاف۔ اخلاق و عادات پر اطلاع حاصل کی تھی۔ غرض اس مسئلہ کے متعلق اثباتاً
یا نفیاً مجتہدانہ رائے قائم کرنے کے لئے جو شرطیں درکار تھیں سب اُنمیں موجود تھیں۔

اس خیال کا ایک بڑا سبب

اس خیال کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ یہ مسئلہ کسی نہ کسی پیرایہ میں اُنکے خاندان تعلیم میں
وراثتاً چلا آتا تھا۔ حدیث و فقہ میں اُنکے خاندانِ تعلیم کے مورثِ اول۔ عبداللہ بن مسعودؓ ہیں اور
مذہب حنفی کی بنیاد زیادہ تر اُنہیں کی روایات و استنباطات پر ہے عبداللہ بن مسعود۔ اگرچہ
بہت ہی بڑے محدث تھے لیکن اور محدثین صحابہؓ کی نسبت قلیل الروایۃ تھے۔ جسکی وجہ یہ تھی کہ وہ
متشدد اور محتاط تھے۔ علامہ ذہبی اُنکے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "ممن یتحری فی الاداء
ویشدد فی الروایۃ ٭٭ وکان یقل من الروایۃ للحدیث" یعنی عبداللہ
بن مسعود اداء میں تحری اور روایت میں تشدد کرتے تھے۔ اور حدیث کی روایت کم کرتے تھے
ابراہیم نخعی۔ جو عبداللہ بن مسعود کے بہ یک واسطہ شاگرد اور امام ابوحنیفہ کے بہ یک واسطہ
اُستاد تھے۔ اُنکا بھی یہی مذہب تھا۔ اور اسی وجہ سے وہ صیرفی الحدیث کہلاتے تھے۔
امام ابوحنیفہ نے گو اور بہت سے درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی۔ لیکن اُنکی معلومات اور خیالات
کا اصلی مرکز یہی خاندان تھا۔ یہی خاندانی اثر تھا۔ جس نے اُنکے دل میں یہ خیال پیدا کیا
اور اُسکو اُنکے ذاتی تجربہ اور دقت نظر نے اور بھی قوت دی۔

امام مالک و امام ابوحنیفہ کی شروط روایت قریب قریب متحد ہیں

امام صاحب کے اس خیال نے اگرچہ قبول عام کی سند حاصل نہیں کی تاہم وہ بالکل
بے اثر نہیں رہا۔ امام مالک و امام شافعی۔ جو اجتہاد میں امام ابوحنیفہ سے متاخر ہیں۔ اُن کے
اصول اجتہاد میں اس خیال کا صاف پرتو پایا جاتا ہے۔ امام مالک نے روایت کے متعلق
جو قید اور شرطیں لگائی ہیں۔ وہ امام ابوحنیفہ کی شرائط کے قریب قریب ہیں اور یہی وجہ ہے
کہ متشددین فی الروایۃ میں۔ امام ابوحنیفہ و امام مالک کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے ابن
الصلاح۔ مقدمہ میں لکھتے ہیں "ومن مذاہب التشدید مذہب من قال لا حجۃ
الا فیما رواہ الراوی من حفظہ وتذکرہ وذلک مروی عن مالک وابی حنیفۃ"
یعنی متشددین کا یہ مذہب ہے کہ صرف وہ حدیث قابل حجت ہے۔ جسکو راوی نے اپنی حفظ
سے یاد رکھا ہو اور یہ قول مالکؒ و ابوحنیفہؒ سے منقول ہے۔" محدثین نے لکھا ہے کہ امام
مالک نے اول جب موطاء لکھی۔ تو اُسمیں دس ہزار حدیثیں تھیں۔ پھر امام مالک زیادہ تحقیق
کرتے گئے۔ تو یہ تعداد کم ہوتی گئی۔ یہانتک کہ چھ سات سو رہ گئی۔ امام شافعی نے صاف
لفظوں میں امام ابوحنیفہ کے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ امام بیہقی نے روایت کی ہے کہ ایکدن

امام شافعی کا قول تھا کہ صحیح حدیثیں بہت کم ہیں

ہرم قرشی نے امام شافعی سے کہا کہ آپ وہ حدیثیں لکھوا دیجئے۔ جو رسول اللہ سے ثابت ہیں۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ "ارباب معرفت کے نزدیک صحیح حدیثیں کم ہیں کیونکہ ابوبکر صدیق رضی نے جو حدیثیں رسول اللہ سے روایت کیں۔ اُنکی تعداد سترہ سے زیادہ نہیں ہے عمر بن الخطاب رض باوجود اسکے کہ رسول اللہ کے بعد مدت تک زندہ رہے۔ اُنکی روایت سے پچاس حدیثیں بھی ثابت نہیں حضرت عثمان رض کا بھی یہی حال ہے حضرت علی ع اگرچہ لوگوں کو حدیث سیکھنے کی ترغیب دلاتے تھے۔ لیکن اُن سے بھی کم حدیثیں مروی ہیں۔ کیونکہ وہ مطمئن نہیں رہے۔ اُن سے جو حدیثیں مروی ہیں اکثر حضرت عمر اور حضرت عثمان کے عہد خلافت کی ہیں۔ اِن لوگوں کے سوا اور صحابہ سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں لیکن اہل معرفت کے نزدیک وہ تمام روایتیں صحیح سند سے ثابت نہیں"۔

اِن باتوں سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ امام ابوحنیفہ۔ معتزلیوں کی طرح احادیث کے منکر تھے یا صرف دس بیس حدیثوں کو تسلیم کرتے تھے۔ اُنکے شاگردوں نے خود اُن سے سیکڑوں حدیثیں روایت کیں ہیں۔ موطا امام محمد۔ کتاب الآثار۔ کتاب الحجج۔ جو عام طور پر متداول ہیں اِن میں بھی امام صاحب سے بیسیوں حدیثیں مروی ہیں۔ البتہ اور محدثین کی نسبت اُنکی احادیث مسلمہ کی تعداد کم ہے اور اُسکی وجہ وہی شروط روایت کی سختی ہے۔ امام صاحب نے روایت کے متعلق جو شرطیں اختیار کیں۔ کچھ تو وہی ہیں جو اور محدثین کے نزدیک مسلم ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جنمیں وہ منفرد ہیں یا صرف امام مالک اور بعض اور مجتہدین انکے ہمزبان ہیں

امام صاحب نے روایت کیلئے کیا شرطیں مقرر کیں

ان میں سے ایک یہ مسئلہ ہے کہ "صرف وہ حدیث حجت ہے جسکو راوی نے اپنے کانوں سُنا ہو اور روایت کے وقت تک یاد رکھا ہو" یہ قاعدہ بظاہر نہایت صاف ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اُسکی تفریعیں نہایت وسیع اثر رکھتی ہیں اور عام محدثین کو اُن سے اتفاق نہیں ہے۔ محدثین کے نزدیک اِن پابندیوں سے روایت کا دائرہ تنگ ہوجاتا ہے۔ اور اس سے ہمکو بھی انکار نہیں۔ لیکن اسکا فیصلہ ناظرین خود کر سکتے ہیں کہ احتیاط مقدم ہے یا روایت کی وسعت۔ ہم بعض تفریعات کو کسیقدر تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوگا کہ امام ابوحنیفہ کو کس خیال نے اس قسم کی سختیوں پر مجبور کیا تھا۔

اکثر شیوخ کا حلقہ درس نہایت وسیع ہوتا تھا یہانتک کہ ایک ایک مجلس میں دس دس ہزار سامعین جمع ہوتے تھے۔ اسوقت متعدد مستملی یعنے نائب جابجا بٹھائے جاتے تھے کہ شیخ کے الفاظ کو دور والوں تک پہنچائیں۔ بہت سے ایسے لوگ ہوتے

تھے جنکے کانوں میں شیخ کا ایک لفظ بھی نہیں پہنچتا تھا۔ وہ صرف مستملی کے الفاظ سنکر حدیث روایت کرتے تھے۔ اب بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ جس شخص نے صرف مستملی سے سُنا وہ اصل شیخ کی نسبت حدثنا کہہ سکتا ہے یا نہیں۔ اکثر ارباب روایت کا مذہب ہے کہ کہہ سکتا ہے امام ابوحنیفہ اسکے خلاف ہیں۔ ائمہ محدثین میں سے حافظ ابونعیم فضل بن دکین۔ زائدہ بن قدامۃ امام صاحب کے ہمزبان ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ "مقتضائے عقل یہی امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے لیکن عام مذہب میں آسانی ہے[۱]"

امام ابوحنیفہ کو اس احتیاط پر جس چیز نے مجبور کیا تھا۔ وہ یہ تھی کہ انکے زمانہ تک روایت بالمعنی کا طریقہ نہایت عام تھا۔ اور بہت کم لوگ تھے جو الفاظ حدیث کی پابندی کرتے تھے۔ اسلیئے روایات میں تغیر و تبدل کا احتمال ہر واسطہ میں بڑھتا جاتا تھا۔ کم از کم یہ کہ ہر روایت پہلے واسطہ میں جسقدر قوی ہوتی تھی۔ دوسرے واسطہ میں اسکا وہ پایہ نہیں قائم رہ سکتا تھا۔ بے شبہہ مستملی کے مقرر کرنیکا طریقہ قائم رکھنا ضرور تھا کیونکہ اکثر موقعوں پر بغیر مستملی کے کام نہیں چلسکتا تھا۔ لیکن ناانصافی تھی۔ کہ جس شخص نے بلاواسطہ شیخ سے سنا ہو اور جس نے مستملی سے روایت کی ہو۔ دونوں کا ایک درجہ قرار دیا جاوے۔ مستملی کبھی کبھی نہایت غافل اور بے سمجھ ہوتے تھے۔ اسلیئے غلطیوں کا احتمال اور بھی قوی ہو جاتا تھا

اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ غیر محتاط طریقہ یہ تھا کہ اخبرنا و حدثنا کو بعض بعض محدثین نہایت عام معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ امام حسن بصری نے متعدد روایتوں میں کہا ہے حدثنا ابوہریرۃ حالانکہ ابوہریرہؓ سے وہ کبھی نہیں ملے تھے۔ انہوں نے اسکی یہ تاویل کی تھی۔ کہ ابوہریرہ نے جب وہ حدیث بیان کی تھی تو اُس شہر میں وہ موجود تھے اسی طرح اور شیوخ۔ صحابہؓ کی نسبت حدثنا کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ اور معنی یہ لیتے تھے۔ کہ ان کے شہر والوں نے اُن شیوخ سے سنا تھا۔ محدث بزار نے لکھا ہے کہ حسن بصریؒ نے اُن لوگوں سے روایت کی ہے۔ جن سے وہ کبھی نہیں ملے اور تاویل یہ کرتے تھے۔ کہ انکی قوم نے وہ حدیث اُن لوگوں سے سُنی تھی[۱] یہ امر اس لئے کہ ایک قسم کی غلط بیانی تھی۔ حدیث کی اسناد کو مشتبہ کر دیتا تھا۔ کیونکہ راوی نے جب خود شیخ سے حدیث نہیں سُنی۔ تو بیچ میں کوئی واسطہ ہوگا اور چونکہ راوی نے اُس کا نام نہیں بتایا۔ اسی لئے اُن کے ثقہ و غیرہ ثقہ ہونے کا حال نہیں معلوم ہو سکتا۔ صرف حسن ظن پر مدار رہگیا۔ کہ ایسے شخص نے جس سے سُنا ہوگا

[۱] فتح المغیث ص ۱۵۷

وہ ضرور قابل استناد ہوگا۔ امام ابوحنیفہ نے اس طریقہ کو ناجائز قرار دیا۔ اور اُن کے بعد اور ائمہ حدیث نے بھی اُنکی متابعت کی۔

اجزاے روایت

ارباب روایت کا ایک یہ طریقہ تھا۔ کہ جب کسی شیخ سے کچھ حدیثیں سنیں اور قلمبند کرلیں تو ان اجزاء سے روایت کرنی ہمیشہ جائز سمجھتے تھے۔ اسکو اسقدر وسعت دیگئی۔ کہ گو راوی کو اُن حدیثوں کے الفاظ و معانی کچھ یاد نہ رہے ہوں۔ تاہم اس بنا پر کہ اجزاء اُس کے پاس موجود ہیں۔ اُن کی روایت کرسکتا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے اس طریقہ کو قائم رکھا لیکن یہ قید لگائی کہ حدیث کے الفاظ و مطالب محفوظ ہونے چاہئیں۔ ورنہ روایت جائز نہیں ٭

یہ مسئلہ بھی اگرچہ عام طور پر نہیں تسلیم کیا گیا تاہم جیسا کہ محدث سخاوی نے تصریح کی ہے امام مالک اور بہت سے ائمہ فن نے اُسکی موافقت کی۔ امام بخاری و مسلم وغیرہ کے زمانہ میں اس قید کی چنداں ضرورت نہیں رہی تھی۔ کیونکہ اُسوقت روایت باللفظ کا عام رواج ہو چکا تھا۔ لیکن امام ابوحنیفہ کے عہد تک حدیثیں زیادہ تر بالمعنے روایت کیجاتی تھیں۔ اسی لئے اگر راوی کو الفاظ حدیث۔ موقع حدیث۔ شان نزول۔ وغیرہ یاد نہیں ہوتے تھے تو روایت کا بعینہا ادا کرنا قریباً ناممکن ہوتا تھا۔ اسی ضرورت سے امام ابوحنیفہ نے اس طریقہ کو محدود کردیا اور انصاف یہ ہے کہ ایسا کرنا ضروری تھا ٭

سب سے زیادہ مہتم بالشان اور قابل بحث مسئلہ یہ ہے کہ روایت بالمعنی جائز ہے یا نہیں۔ یا یہ کہ ایسی روایت قطعاً قابل حجت ہے یا نہیں۔ یہ مسئلہ ہمیشہ مختلف فیہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔ امام شافعی نے روایت کی ہے کہ "بعض تابعین نے ایک حدیث۔ متعدد صحابہ سے سُنی جسکو سب نے مختلف لفظوں میں بیان کیا لیکن مطلب ایک تھا۔ اُنہوں نے کسی صحابی سے یہ حقیقت بیان کی۔ صحابی نے جواب دیا کہ جب معنی مختلف نہیں تو کچھ مضایقہ نہیں۔" اگر امام شافعی نے تابعی کا نام نہ بتایا۔ جس سے روایت کی قوت اور ضعف کا اندازہ ہو سکتا۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا۔ کہ بعض صحابہ روایت بالمعنی جائز سمجھتے تھے اور اُس پر عمل کرتے تھے۔ بخلاف اس کے بعض صحابہ مثلاً عبداللہ بن مسعود کو روایت باللفظ پر اصرار تھا۔ علامہ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں اُن کے حالات کے ذیل میں لکھتے ہیں۔ کہ "وہ روایت میں سختی کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو زجر کرتے تھے۔ الفاظ کے ضبط میں بے پروائی نہ کریں عبداللہ بن مسعود جب کبھی بالمعنی روایت کرتے تھے۔ تو ساتھ ہی یہ الفاظ استعمال کرتے تھے

روایت بالمعنی میں صحابہ کی احتیاط۔

او مثلہ او نحوہ او شبیہ۔ اما فوق ذلک۔ و اما دون ذلک و اما قریب من ذلک

یعنے رسول اللہ نے اس طرح فرمایا تھا یا اسکے مثل یا اسکے مشابہ اس سے کچھ زیادہ یا کم یا اس کے قریب فرمایا تھا۔ ابوالدرداؓ کا بھی یہی حال تھا وہ حدیث بیان کر کے کہا کرتے تھے ھذا او نحو ھذا او شکلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو لوگوں کو روایتِ حدیث سے منع کیا کرتے تھے۔ اُن کا بھی غالباً یہی منشا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ الفاظ کم یاد رہ سکتے ہیں۔ اور معنے کی عام اجازت میں تغیر و تبدل کا احتمال بڑھتا جاتا ہے۔

صحابہؓ کے دور کے بعد بھی یہ مسئلہ یکسو نہوا۔ تابعینؒ کے دو گروہ تھے اور خود امام ابوحنیفہ کے اُستاد الاستاد روایت بالمعنی کے قائل تھے۔ آگے چلکر تو گویا اسپر اتفاق عام ہو گیا۔ کہ روایت بالمعنی جائز ہے۔ چنانچہ اصولِ حدیث کی کتابوں میں جمہور کا یہی مذہب بیان کیا جاتا ہے۔ مجتہدین میں سے صرف امام مالکؒ اسکے خلاف ہیں۔ محدثین کا ایک گروہ جنمیں امام مسلم قاسم بن محمد۔ محمد بن سیرین۔ رجاء بن حیوۃ۔ ابوزرعۃ۔ سالم بن ابی الجعد عبدالملک بن عمرؒ داخل ہیں۔ روایت باللفظ پر عمل کرتا تھا۔ لیکن عام محدثین جواز ہی کے قائل ہیں۔ اور در حقیقت ایک ایسا فرقہ جسکا عام میلان بہرحالت میں کثرتِ روایت کی طرف ہو۔ جواز ہی کا قائل ہو سکتا تھا۔

اسمیں شبہ نہیں کہ اکثر تابعینؒ اور صحابہؓ نے بالمعنی حدیثیں روایت کیں۔ اور اگر شروع سے یہ قید لگائی جائے تو روایت کا دائرہ اسقدر تنگ ہو جاتا ہے کہ مسائل و احکام کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ روایت بالمعنے میں اصل روایت کا اصلی حالت پر قائم رکھنا اسقدر مشکل ہے کہ قریباً ناممکن ہے۔ زبان کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ مرادف الفاظ بھی یکساں اثر نہیں رکھتے اور معنی کی حیثیتوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ مجوزین نے مرادف وغیرہ کی قید بھی نہیں رکھی۔

اور ادائے مطلب کو نہایت عام وسعت دی ہے۔ صحابہؓ سے زیادہ کوئی شخص رسول اللہ کے الفاظ و مطالب کا اندازہ دان نہیں ہو سکتا تھا۔ اول تو وہ زباندان اور زبان کے حاکم تھے۔ اسکے ساتھ شرفِ صحبت کی وجہ سے رسول اللہؐ کی طرز ادا طریقۂ گفتگو۔ انداز کلام فحوائے سخن سے خوب واقف تھے۔ تاہم کتب حدیث میں اسکی متعدد نظیریں ملتی ہیں۔ کہ خود صحابہ سے ادائے مطلب میں کمی یا زیادتی ہو گئی۔

ابن ماجہ۔ میں روایت ہے کہ ابوموسیٰ اشعری نے آنحضرتؐ سے روایت کی ان المیت یعذب ببکاء الحی اذا قالوا واعضداہ واکاسباہ وا ناصراہ واجبلاہ یعنی "جب وہ

سلہ فتح المغیث ۱۲

پر بالفاظ لکھکر دیا جاتا ہے تو اسکو عذاب دیا جاتا ہے"۔ کسی نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ ابن عمرؓ یہ حدیث بیان کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے کہا میں یہ نہیں کہتی کہ ابن عمرؓ جھوٹ کہتے ہیں لیکن اُن کو سہو ہُوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک یہودی عورت مرگئی۔ اُسکے گھر والے اُسپر روتے تھے۔ آنحضرتؐ نے سنا تو فرمایا کہ "اسکے گھر والے رو رہے ہیں اور اُسپر قبر میں عذاب ہو رہا ہے"۔ ایک اور روایت میں ہے حضرت عائشہؓ نے قرآن کی یہ آیت پڑھی وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی جس سے اسبات پر استدلال لیا کہ ایک شخص کے فعل کا دوسرا شخص ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ گھر والے روتے ہیں تو اُنکا قصور ہے مردے نے کیا گناہ کیا ہے کہ اُسپر عذاب کیا جاوے۔ دیکھو اس حدیث میں رسول اللہؐ نے یہودیہ عورت کا معذب ہونا بطور ایک واقعہ بیان کیا تھا۔ راوی نے رونے کو اُسکا سبب قرار دیا اور حدیث کے یہ الفاظ بیان کیے کہ ان المیت یعذب ببکاء الحی۔ یعنی مردہ کو زندوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔

اسیطرح غزوہ بدر کے واقعہ میں عام روایت یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے قلیب پر کھڑے ہوکر فرمایا ھل وجدتم ما فعل ربکم حقا لوگوں نے غرض کی کہ آپ مردوں سے خطاب فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ "جو میں نے کہا ان لوگوں نے سن لیا"۔ لیکن یہ واقعہ حضرت عائشہؓ کے سامنے بیان کیا گیا تو اُنہوں نے فرمایا رسول اللہؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا بلکہ یہ الفاظ کہے تھے۔ لقد علموا ان ما دعوتهم حق [1] یعنے ان لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ جس چیز کی میں نے دعوت کی تھی۔ وہ حق ہے دیکھو ان دونوں جملوں کے مفہوم میں کسقدر فرق ہے۔ اور اُس سے سماع موتے کے مسئلہ پر کیسا مختلف اثر پڑتا ہے۔

غرض جب صحابہؓ سے اس قسم کے مسامحات واقع ہوتے تھے تو دوسرے اور تیسرے دور کا کیا ذکر ہے۔ لطف یہ ہے کہ جو لوگ روایت بالمعنی کے قایل ہیں اُنہوں نے چند الفاظ مثالاً بتائے ہیں کہ "ان کو دوسرے لفظوں میں اسطرح ادا کرسکتے ہیں اور معنی میں مطلق فرق نہیں پیدا ہوگا"۔ حالانکہ غور سے دیکھیے تو ان لفظوں کے اثر میں صاف تفاوت نظر آتا ہے محدث سخاوی لکھتے ہیں کہ حدیث میں آیا ہے۔ اقتلوا الاسودین الحیۃ والعقرب اب بجائے اسکے یہ کہہ سکتے ہیں کہ امر بقتلھما محدث سخاوی کے نزدیک اس مثال میں الفاظ کے اختلاف نے معنی میں کچھ فرق نہیں پیدا کیا۔ حالانکہ اقتلوا اور امر بالقتل میں صریح تفاوت ہے۔ اقتلوا اگرچہ امر کا صیغہ ہے لیکن اسمیں وہ تحتم اور تاکید نہیں ہے جو امر میں ہے۔

[1] تاریخ کبیر علامہ ابو جعفر جریر طبری صفحہ ۱۳۳۲ ۱۲

امام ابوحنیفہ نے ان مشکلات کا اندازہ کر کے نہایت معتدل طریقہ اختیار کیا۔ جو حدیثیں اُنکے زمانہ سے پہلے بالمعنی روایت ہو چکی تھیں اور محدثین میں شائع تھیں اُن کے قبول سے تو چارہ نہ تھا ورنہ روایت کا تمام دفتر بیکار ہو جاتا۔ اسلیئے امام صاحب نے اُن حدیثوں کو قبول کیا۔ لیکن یہ قید لگائی کہ "رواۃ حدیث فقیہ ہوں۔ یعنی الفاظ کے اشارات اور مطالب کی تعبیر سے واقف ہوں"۔ تغیر مطالب کا احتمال اب بھی باقی رہتا ہے۔ لیکن احادیث کا مدار (جیسا کہ محدثین نے تصریح کر دی ہے) ظن غالب پر ہے۔ اسلیئے جب تک کوئی مخالف دلیل موجود نہو روایت بالمعنی قابل عمل ہوگی۔ امام صاحب نے اُن احادیث کو بھی قبول کیا جنکے رُواۃ ثقہ ہوں اور فقیہ نہوں۔ لیکن اُن کا درجہ پہلے کی بہ نسبت کم قرار دیا۔[1] اُن میں اصول درایت کی زیادہ ضرورت سمجھی۔ امام صاحب کے ان اصول سے اور ائمہ نے بھی اتفاق کیا "ائمہ الحدیث میں ہے کہ جو شخص مدلولِ الفاظ کو اچھی طرح نہیں سمجھتا اُسکو روایت باالالفاظ ضروری ہے۔ البتہ جو شخص مطالب کا اندازہ دان ہے۔ اُسکی نسبت اختلاف ہے۔ کثرتِ رائے اس طرف ہے کہ وہ الفاظ کا پابند نہیں"۔ لیکن امام ابوحنیفہ نے اس اجازت کو صحابہ اور تابعین تک محدود کر دیا اور لوگوں کے لیئے روایت بلاالفاظ کی قید لگائی۔ اور امام طحاوی نے بسند متصل اُن سے روایت کی ہے کہ صرف وہ حدیث روایت کرنی چاہیئے۔ جو روایت کرنے کے وقت اُسیطرح یاد ہو جسطرح سننے وقت یاد تھی۔[2] ملا علی قاری اس روایت کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔ "اسکا حاصل یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ روایت بالمعنی کو جائز نہیں رکھتے تھے"۔ اس پابندی میں اگرچہ امام مالک اور بعض محدثین نے امام ابوحنیفہ سے اتفاق کیا۔ فتح المغیث میں ہے۔ وقیل لا تجوز له الرواية بالمعنى مطلقا قاله طائفة من المحدثين والفقهاء والاصوليين من الشافعية وغيرهم قال القرطبي وهو الصحيح من مذهب مالك۔ لیکن عام ارباب روایت اس سختی کے کیونکر پابند ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ایک بڑے فرقہ نے مخالفت کی اور امام صاحب کو مشکل فی الروایۃ ٹھہرایا۔ تاہم انصاف یہ ہے کہ جو اصول امام صاحب نے اختیار کیا وہ ضرور تھی اور نہایت ضروری تھا۔ خود حدیث میں آیا ہے کہ نضر الله امرءً اسمع منا شيئا فبلغه كما سمعه۔ یعنی "رسول اللہؐ نے فرمایا کہ خدا اُس شخص کو شاداب کرے جس نے ہم سے کچھ سنا اور اُسکو اُسیطرح پہنچایا جیسا کہ ہم سے سنا تھا"۔ اس سے زیادہ

[1] یعنے کہا گیا ہے کہ روایت بالمعنی مطلقاً جائز نہیں۔ محدثین و فقہاء و اصولیین شافعیہ کا ایک گروہ اسی قول کا قائل ہے اور قرطبی نے کہا ہے کہ امام مالک کا صحیح مذہب یہی ہے۔ ۱۲

[2] شروح امام اعظم از ملا علی قاری صہ ۳ ۱۲

اسباب میں کسی دلیل کی کیا ضرورت ہے۔ صحابہ میں سے جو لوگ روایت باللفظ کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ ممکن ہے۔ کہ یہ حدیث اُن کو نہ پہنچی ہو چنانچہ جن صحابہ کی نسبت ثابت ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو سُنا تھا۔ مثلاً عبداللہ بن مسعود۔ جو اس حدیث کے راوی ہیں وہ الفاظ کے پابند تھے۔ امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں یہ حدیث عام ہو چکی تھی۔ اس لئے اُنکو اُس کی تعمیل میں کیا عذر ہو سکتا تھا۔

فن حدیث میں سب سے بڑا کام امام ابوحنیفہ نے یہ کیا کہ درایت کے اصول قائم کئے اور اُن کو احادیث کی تحقیق و تنقید میں برتا۔ فن حدیث کی ایک شاخ یعنے روایت پر ہمارے علما نے جسقدر توجہ کی اُسکی کوئی نظیر دنیا کی گذشتہ اور موجودہ تاریخ میں نہیں ملسکتی۔ لیکن یہ افسوس ہے کہ اصول درایت کے ساتھ چنداں اعتنا نہیں کیا گیا۔ حافظ ابن حجر۔ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن میں بعض تصنیفیں لکھی گئیں۔ لیکن وہ اسقدر کم اور غیر متعارف ہیں کہ گویا نہیں ہیں۔ اصول حدیث۔ ایک مستقل فن بن گیا ہے اور بڑی بڑی کتابیں جو اس فن میں لکھی گئیں عموماً متداول ہیں۔ لیکن اُن سے اصول درایت کے متعلق بہت کم واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ حالانکہ یہی اصول۔ فن حدیث کے نہایت ضروری اجزا ہیں۔ یہ عزت صرف امام ابوحنیفہ۔ کو حاصل ہے کہ جب اس فن کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اُس وقت اُنکی نگاہ اِن باریک نکتوں پر پہنچی۔ بے شبہ صحابہ کی تاریخ میں جستہ جستہ اصول درایت کے آثار نظر آتے ہیں اور درحقیقت وہی امام ابوحنیفہ کے لئے دلیل راہ بنے۔ لیکن وہ باتیں عام مسائل۔ کے ہجوم میں ایسی گم اور ناپید تھیں۔ کہ اُن پر عام لوگوں کی نگاہ نہیں پڑسکتی تھی۔

روایات کی صحت وعدم صحت کا مدار ہمیشہ راویوں کے اعتبار وعدم اعتبار پر نہیں ہوتا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کی روایت جس سند سے بیان کیجاتی ہے۔ اُس کے تمام راوی ثقہ اور قابل اعتبار ہوتے ہیں۔ لیکن واقعہ صحیح نہیں ہوتا۔ حدیث میں بھی اسکی سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔ اسلئے ضرور ہے کہ صرف رواۃ کی بنا پر احادیث کا فیصلہ نہ کیا جائے۔ بلکہ یہ بھی دیکھا جائے۔ کہ وہ اصول درایت کے مطابق ہیں یا نہیں۔

درایت سے یہ مطلب ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جاے تو اسپر غور کیجائے۔ کہ وہ طبیعت انسانی کے اقتضا۔ زمانہ کی خصوصیتیں۔ منسوب الیہ۔ کے حالات۔ اور دیگر قرائن عقلی کے ساتھ کیا نسبت رکھتا ہے۔ اگر اس معیار پر پورا نہیں اُترتا۔ تو اُس کی صحت بھی مشتبہ ہوگی۔ یعنی یہ احتمال ہوگا کہ روایت کے تغیرات نے واقعہ کی صورت بدلدی ہے۔ اس قسم

کے قواعد۔ حدیث کی تحقیق و تنقید میں بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور انہیں کا نام اصول درایت ہے۔ علامہ ابن جوزی۔ جو فن حدیث میں بڑا پایہ رکھتے تھے لکھتے ہیں کہ "جس حدیث کو تم دیکھو کہ عقل کے مخالف یا اصول کے مناقض ہے تو یہ سمجھ لو کہ وہ موضوع ہے۔ اُس میں راویوں کی تحقیق حال کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح وہ حدیث بھی موضوع ہے جو حس و مشاہدہ سے باطل ثابت ہو۔ یا قرآن۔ حدیث متواتر۔ اجماع قطعی کے خلاف ہو" ابن جوزی کے الفاظ۔ جیسا کہ فتح المغیث میں منقول ہے یہ ہیں۔ کل حدیث رایتہ یخالفہ العقول او یناقض الاصول فاعلم انہ موضوع فلا یتکلف اعتبارہ ای لا تعتبر رواتہ ولا ینظر فی جرحہم او یکون مما یدفعہ الحس والمشاہدۃ او مباینا لنص الکتاب او السنۃ المتواترۃ والاجماع القطعی حیث لا یقبل شئی من ذلک التاویل او تتضمن الافراط بالوعید الشدید علی الامر الیسیر وبالوعد العظیم علی الفعل الیسیر وھذا الاخیر کثیر موجود فی حدیث القصاص والطرقیہ تاویل نہو۔ یا جسمیں ایک معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو یا ذرا سے کام پر بڑے انعام کا وعدہ ہو۔ اس طرح کی حدیثیں واعظوں اور صوفیوں کی روایتوں میں بہت پائی جاتی ہیں"۔

امام ابو حنیفہ نے درایت کے جو اصول قائم کئے اُن میں سے بعض ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

(۱) "جو حدیث عقل قطعی کے مخالف ہو وہ اعتبار کے قابل نہیں"[۱]۔ یہ وہی قاعدہ ہے جسکو ابن جوزی نے تمام اصول درایت پر مقدم رکھا ہے۔ ابن جوزی چھٹی صدی میں تھے۔ اُسوقت اسلامی علوم۔ اوج کمال تک پہنچ گئے تھے۔ اور فلسفیانہ خیالات کا اثر زیادہ عام ہو گیا تھا لیکن امام ابو حنیفہ کے زمانہ تک مذہب میں عقل کا نام لینا ایک جرم عظیم تھا۔

امام صاحب نے اوّل اوّل جب یہ قاعدہ قرار دیا۔ اور روایات میں برتا تو سخت مخالفت ہوئی۔ اس قسم کی حدیثیں جنمیں ناممکن اور محال واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ امام صاحب کے سامنے پیش کیجاتی تھیں۔ تو وہ اُن سے انکار کرتے تھے۔ یہ امر عام لوگوں پر گراں گزرتا تھا۔ کیونکہ ان لوگوں کے خیال میں روایات کی تحقیق و تنقید کا مدار صرف رُواۃ کی حالت پر تھا۔ اصول درایت سے غرض نہ تھی۔ زمانۂ مابعد میں اگرچہ یہ قاعدہ۔ اصول حدیث۔ میں داخل کر لیا گیا۔ لیکن ارباب روایت نے اسکو بہت کم برتا اور اسی کا نتیجہ ہے۔ کہ آج بیسیوں مزخرف اور دور دراز کار حدیثیں قبول عام کے شرف سے ممتاز ہیں۔

تلک الغرانیق العلی کی حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ زبان سے (سورہ

[۱] اس اصول کو علامہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں امام ابو حنیفہ کیطرف منسوب کیا ہے۔ ۱۲

نجم کی تلاوت کے وقت) بتوں کی تعریف میں یہ الفاظ ادا ہوئے تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجی یعنے "یہ بت بہت معزز ہیں اور اُنکی شفاعت کی اُمید کیجا سکتی ہے" اور یہ الفاظ شیطان نے آنحضرت کی زبان میں ڈال دئے تھے - چنانچہ تلاوت کے بعد جبرئیل آئے اور اُنہوں نے یہ شکایت کی کہ میں نے تو یہ الفاظ آپ کو نہیں سکھائے تھے - آپنے کہاں سے پڑھ دئے - اس حدیث کو امام صاحب کے اصول کے موافق - بعض محدثین مثلاً قاضی عیاض وابوبکر بیہقی وغیرہ نے غلط کہا - لیکن محدثین کا ایک بڑا گروہ اُس کو اب بھی صحیح تسلیم کرتا ہے - متاخرین میں حافظ ابن حجر سے زیادہ نامور کوئی محدث نہیں گزرا - وہ بڑے زور شور سے اس حدیث کی تائید کرتے ہیں - اور فرماتے ہیں - کہ چونکہ اس کے رُواۃ ثقہ ہیں - اس لئے اُسکی صحت سے انکار نہیں کیا جاسکتا !!! اسی طرح ردالشمس کی حدیث کو جسمیں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علی کی نماز عصر قضا ہوگئی تھی - اسلئے آنحضرت کی دعا سے آفتاب غروب ہونے کے بعد پھر طالع ہُوا - محدث ابن جوزی نے جرأت کرکے موضوع کہا - لیکن حافظ ابن حجر و جلال الدین سیوطی وغیرہ نے نہایت شدت سے مخالفت کی - امام صاحب کے زمانہ میں اس سے زیادہ مخالفین ہوئیں - لیکن وہ ان باتوں کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ لفظ عقل سے امام صاحب کی مراد وہ وسیع معنی نہیں ہیں جو آجکل کے تعلیم یافتہ لوگوں نے قرار دیئے ہیں - جسکی رو سے شریعت کے بہت سے اصلی مسائل برباد ہوئے جاتے ہیں -

(۲) جو واقعات تمام لوگوں کو رات دن پیش آیا کرتے ہیں - اُن کے متعلق اگر رسول اللہ سے کوئی ایسی روایت منقول ہو جو اخبار احاد کے درجہ سے زیادہ نہ ہو تو وہ روایت مشتبہ ہوگی یہ اصول اس بنا پر ہے کہ جو واقعات تمام لوگوں کو اکثر پیش آیا کرتے تھے - اُن کے متعلق جو کچھ آنحضرت کا ارشاد تھا - اُسکی ضرورت تمام لوگوں سے متعلق تھی - اسلئے صرف ایک آدھ شخص تک اُس روایت کا محدود رہنا درایت کے خلاف ہے -

اکثر مصنفین نے تصریح کی ہے کہ امام ابوحنیفہ اُس روایت کو قبول نہیں کرتے تھے - جو قیاس کے مخالف ہو - اگرچہ یہ قول محض بے اصل نہیں ہے - لیکن اُسکی تعبیر میں لوگوں نے اکثر غلطی کی ہے اور انہیں غلط تعبیرات کا اثر ہے کہ امام ابوحنیفہ - کی نسبت ارباب ظاہر میں بہت سی بدگمانیاں قائم ہوگئیں - ان لوگوں نے امام صاحب کے مقصد و منشا پر کافی غور نہیں کی اور عام رائے قائم کرلی - کہ وہ قیاس کو حدیث پر مقدم سمجھتے ہیں - امام صاحب سے اس مسئلہ کے متعلق جو اقوال منقول ہیں - وہ صریح اس دعوے کے خلاف ہیں مسائل فقہ

ہیں متعدد مثالیں موجود ہیں۔ جنمیں امام ابوحنیفہ نے حدیث و اثر کی وجہ سے قیاس کو مطلقاً ترک کر دیا ہے۔ امام محمدؒ۔ اس بحث میں کہ قہقہہ نماز ناقض وضو ہے۔ امام ابوحنیفہ کیطرف سے استدلال کرتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ لولا ماجاء من الآثار کان القیاس علی ماقال اھل المدینہ ولکن لا قیاس مع اثر ولا ینبغی الا ان ینقاد للآثار۔ یعنی قیاس وہی ہے جو اہل مدینہ کہتے ہیں لیکن حدیث کے ہوتے قیاس کوئی چیز نہیں۔ اور صرف حدیث ہی کی پیروی کرنی چاہئے"۔ اس سے زیادہ اس باب میں کیا تصریح ہوسکتی ہے عقود الجمان کے مصنف نے مختلف روایتوں سے امام ابوحنیفہ کے خاص اقوال نقل کئے ہیں کہ میں حدیث کے مقابلہ میں قیاس کو دخل نہیں دیتا۔ امام جعفر صادق سے امام صاحب نے جو گفتگو کی تھی اُسمیں بھی خیال کا اظہار کیا ہے۔

ان تصریحات کو دیکھکر بعضوں نے اس باب میں تخصیص کی اور دعوے کیا۔ کہ "جو حدیث قیاس جلی کے مخالف ہو۔ اُسکو امام صاحب قبول نہیں کرتے"۔ عبدالکریم شہرستانی نے اصحاب الرائے۔ کے بیان میں جہاں امام ابوحنیفہ۔ اور اُنکے تلامذہ کا ذکر آیا ہے۔ لکھا ہے کہ وربما یقدمون القیاس الجلی علی احاد الاخبار۔ یعنی وہ لوگ اکثر قیاس جلی کو اخبار احاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ امام رازی نے بھی مناقب الشافعی میں اسکی جابجا تصریح کی ہے۔ اور اس بناپر امام ابوحنیفہ۔ کے مقابلہ میں۔ امام شافعی کی ترجیح کے وجوہ قائم کئے ہیں۔

مینے بہت کچھ جد و جہد کی کہ اس مسئلہ کے متعلق امام صاحب کا کوئی صریح قول مل سکے لیکن نہ ملسکا۔ جن لوگوں نے امام صاحب کیطرف اس قول کو منسوب کیا ہے۔ غالباً صرف استنباط سے کام لیتے ہیں صریح قول نہیں پیش کر سکتے۔ بے شبہ حنفیوں کے اصول فقہ میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ "وہ حدیث جسکی رُواۃ فقیہ نہوں۔ اور ہر طرح قیاس کے مخالف ہو قابل حجت نہیں"۔ لیکن یہ حنفیوں کا مسلمہ اصول نہیں ہے۔ بلکہ صرف عیسےٰ بن ابان۔ اور اُن کے پیروں کی رائے ہے۔ ابوالحسن کرخیؒ وغیرہ صریح اس کے مخالف ہیں۔ اور صاحب مسلم الثبوت نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ تعجب اور سخت تعجب ہے۔ کہ بغیر کسی ثبوت کے امام ابوحنیفہ کیطرف یہ دعوے صرف اس اعتماد پر منسوب کر دیا گیا۔ کہ فقہائے حنفیہ میں سے چند علماء اُس کے قائل ہیں۔ بہت بڑی مثال بیع مصراۃ۔ کی پیش کیجاتی ہے۔ جس سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اس مسئلہ میں صریح حدیث کے ہوتے ہوتے قیاس کو مقدم رکھا ہے[1]۔ لیکن ان مدعیوں کو معلوم نہیں کہ اس مثال میں قیاس کی تقدیم

[1] تعجب ہے کہ بڑے بڑے علماء یہانتک کہ امام غزالی۔ امام رازی نے بھی۔ امام ابوحنیفہ کی نسبت یہ الزام لگایا اور یہی بیع مصراۃ کی مثال پیش کی۔

بعض علمائے حنفیہ کی ذاتی رائے ہے۔ امام صاحب سے اُسکو کچھ واسطہ نہیں۔ امام رازی نے مناقب الشافعی میں اتنی احتیاط کی کہ اس موقع پر امام ابوحنیفہ کا نام نہیں لیا۔ بلکہ اصحاب ابی حنیفہ لکھا۔ لیکن ہم اس احتیاط میں بھی اُن کو معذور نہیں رکھتے۔ کیونکہ یہ رائے بعض حنفیوں کی ہے نہ سب کی۔ امام رازی نے اصحاب کے لفظ سے جو تعمیم ظاہر کی وہ صحیح نہیں۔

بیع مصراۃ۔ کی حدیث کو امام ابوحنیفہ نے قیاس کی بنا پر رد نہیں کیا بلکہ اُس کے نسخ کا دعوے کیا ہے۔ امام طحاوی۔ نے معانی الآثار میں اس بحث کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے وہ امام ابوحنیفہ اور امام محمدؒ کا مذہب لکھکر لکھتے ہیں۔ وذھبوا الی ان ما روی عن رسول اللہ فی ذلک مما تقدم ذکرنا لہ فی ھذا الباب منسوخ یعنی یہ لوگ اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ اس بارہ میں جو کچھ رسول اللہ سے روایت کیا گیا ہے وہ منسوخ ہے۔

اس موقع پر ہم اس بحث کی تفصیل نہیں کرسکتے صرف یہ بتانا چاہتے ہیں۔ کہ اس مسئلہ میں امام صاحب نے قیاس کو ترجیح نہیں دی۔ بلکہ نسخ کا دعوے کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اس قسم کے موقعوں پر نہایت دقیقہ بینی سے دیکھنا چاہئے۔ کہ جو اقوال امام صاحب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ وہ ان سے ثابت بھی ہیں یا نہیں؟ متاخرین نے ان باتوں میں کم احتیاط کی ہے۔ اسلئے ہم کو نہایت غور و تحقیق سے کام لینا ہے۔ یہی بیع مصراۃ کی حدیث ہمیشہ اصول موضوعہ کے طور پر پیش کیجاتی ہے۔ اور اس سے ثابت کیا جاتا ہے۔ کہ امام ابوحنیفہ قیاس کو۔ حدیث پر مقدم رکھتے تھے۔ لیکن ذرا تحقیق سے کام لو تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس تمام شور و غل کی کچھ اصل نہیں۔

بخلاف اسکے نہایت قوی ذریعہ سے امام ابوحنیفہ۔ کی تصریحات ثابت ہیں کہ وہ حدیث صحیح کے مقابلہ میں قیاس کا مطلق اعتبار نہیں کرتے تھے۔ امام محمدؒ۔ اس بحث کے ذیل میں کہ جو شخص رمضان میں بھولکر کچھ کھا پی لے تو روزہ نہیں ٹوٹتا اور قضا نہیں لازم آتی حدیث پر استدلال کر کے لکھتے ہیں کہ آثار کے ہوتے ہوئے رائے کچھ چیز نہیں۔ پھر امام ابوحنیفہ کا خاص قول نقل کرتے ہیں کہ لولا ما جاء فی ھذا من الاثار لامرت بالقضا(۱)۔ یعنی "اگر اس بارہ میں آثار موجود نہ ہوتے تو میں قضا کا حکم دیتا"۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ احادیث کے ثبوت کے متعلق امام ابوحنیفہ۔ کی شرطیں نہایت سخت ہیں۔ جب تک وہ شرطیں پائی نہ جائیں وہ حدیث کو قابل استدلال نہیں سمجھتے۔ لیکن اُن شرطوں کے ساتھ حدیث ثابت ہو تو اُن کے نزدیک پھر قیاس کوئی چیز نہیں۔

(۱) کتاب الحج امام محمدؒ ۱۲

جس حد تک ہم تحقیق کر سکے امام ابوحنیفہ نے قیاس فقہی کو حدیث پر ہرگز مقدم نہیں رکھا۔ لیکن اُن کے زمانہ تک قیاس کا لفظ نہایت وسیع معنوں میں مستعمل تھا۔ اور بے شبہہ اُن معنوں کے لحاظ سے امام صاحب نے قیاس کو حدیثوں میں دخل دیا ہے۔ مسائل اور احکام شرعیہ کے متعلق اسلام میں شروع ہی سے دو فرقے قائم ہو گئے تھے۔ ایک کا خیال تھا کہ شرعی احکام۔ کسی مصلحت اور اقتضائے عقل پر مبنی نہیں ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ حسن و قبح اشیاء عقلی نہیں ہے۔ دوسرے فریق کی رائے تھی کہ تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں۔ جنمیں سے بعض کی مصلحتیں صاف نمایاں ہیں۔ اور خود شارع کے کلام سے اُس کے اشارے پائے جاتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جنکی مصلحت ہم کو معلوم نہیں۔ لیکن فی الواقع وہ مصالح سے خالی نہیں۔ اس اختلاف رائے نے حدیثوں کی روایت پر مختلف اثر پیدا کئے۔ بعض لوگ جب کسی حدیث کو سنتے تھے تو صرف یہ دیکھ لیتے تھے۔ کہ اُس کے راوی ثقہ ہیں یا نہیں۔ اگر اُنکے خیال کے موافق قابل حجت ہیں تو پھر اُن کو کوئی بحث نہیں ہوتی تھی۔ اور بے تکلف اُس حدیث کو قبول کر لیتے تھے۔ دوسرا فریق جو حسن و قبح عقلی کا قائل تھا۔ یہ بھی دیکھتا تھا کہ جو مسئلہ یا عقیدہ۔ حدیث سے مستنبط ہوتا ہے۔ وہ عقل و مصلحت کے موافق ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہوتا تھا۔ تو وہ حدیث کی زیادہ تحقیق و تنقید کی طرف مائل ہوتے تھے۔ وہ دیکھتے تھے۔ کہ راوی۔ فہم و درایت کے لحاظ سے کیا پایہ رکھتے ہیں روایت باللفظ ہے یا بالمعنی۔ موقع حدیث کیا تھا۔ کون لوگ مخاطب تھے۔ کیا حالت تھی۔ غرض اس قسم کے اسباب اور وجوہ پر غور کرتے تھے۔ ان باتوں سے اکثر اصل حقیقت کا پتہ لگ جاتا ہے۔

یہ طرز تحقیق خود صحابہؓ کے زمانہ میں قائم ہو چکا تھا۔ صحیح بن ماجہ و ترمذی میں ہے۔ کہ حضرت ابوہریرہؓ نے رسول اللہ سے حدیث روایت کی کہ "الوضوء مما غیرت النار" یعنی جس چیز کو آگ نے متغیر کر دیا ہو اُس کے استعمال سے وضو ٹوٹ جاتا ہے"۔ اسی بنا پر بعض مجتہدین قائل ہیں کہ گوشت کھانے سے وضو لازم آتا ہے۔ ابوہریرہؓ نے جب یہ حدیث بیان کی تو عبداللہ بن عباسؓ۔ موجود تھے بولے کہ "انتوضأ من الحمیم" یعنی اس بنا پر تو گرم پانی کے استعمال سے بھی وضو لازم آتا ہے"۔ ابوہریرہؓ نے کہا۔ اے برادر زادہ! جب رسول اللہ سے کوئی روایت سنو تو اُس پر مثالیں نہ کہو" لیکن عبداللہ بن عباسؓ اپنی رائے پر قائم رہے۔ حضرت عائشہؓ نے ابن عمرؓ کی اس حدیث پر ان المیت یعذب ببکاء اھلہ جو اعتراض کیا تھا۔ اسی طرز تحقیق پر مبنی تھا۔ صحابہؓ کے حالات میں اس قسم کی متعدد

مثالیں ملتی ہیں جنکا استقصا اس موقع پر ضروری نہیں۔

امام ابوحنیفہ کا بھی یہی مسلک تھا اور اسی لوگوں نے قیاس کے لفظ سے شہرت دی۔ اس مسئلہ پر کہ احکام شریعت مصالح پر مبنی ہیں۔ اس موقع پر ہم تفصیلی گفتگو نہیں کر سکتے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی بے نظیر کتاب حجۃ اللہ البالغہ اس بحث کے لئے کافی و وافی ہے۔ یہاں صرف اسقدر کہنا ضرور ہے کہ علمائے اسلام میں جو لوگ عقل و نقل دونوں کے جامع تھے۔ مثلاً امام غزالی۔ عزالدین عبدالسلام۔ شاہ ولی اللہ وغیرہ ان لوگوں کا یہی مسلک تھا۔ امام ابوحنیفہ احادیث کی تنقید میں اِس اصول کو ضروری طور پر ملحوظ رکھتے تھے۔ دو متعارض حدیثیں جو روایت کی حیثیت سے یکساں نسبت رکھتی تھیں۔ اُن میں وہ اُس حدیث کو ترجیح دیتے تھے۔ جو اصول مذکور کے موافق ہو۔

امام صاحبؒ نے بعض موقعوں پر محض اس اصول کی مخالفت کیوجہ سے بعض حدیثوں کے تسلیم میں تامل کیا ہے۔ اُنکی اصطلاح میں یہ ایک علت خفیہ ہے۔ محدثین نے اقسام حدیث میں ایک قسم معلل قرار دی ہے۔ جسکی یہ تعریف کی ہے۔ کہ "حدیث میں بظاہر صحت کی تمام شرطیں پائی جاتی ہیں۔ اور وہ قابل استدلال نہیں ہوتی۔" اس قسم کی حدیثوں کی تمیز پر محدثین کو نہایت فخر ہے اور وہ اُسکو ایک قسم کا الہام سمجھتے ہیں۔ علی بن المدینی جو امام بخاری کے اُستاد اور بہت بڑے مشہور محدث تھے۔ اُنکا قول ہے کہ ھی الھام و لو قلت للقیم بالعلل من این لک ھذا لم تکن لہ حجۃ[1] یعنی "یہ الہام ہے اور اگر تم ماہر علل سے پوچھو کہ تم نے کیونکر اُسکو معلل کہا تو وہ کوئی دلیل نہیں پیش کر سکتا۔ محدث ابوحاتم سے ایک شخص نے چند حدیثیں پوچھیں۔ انہوں نے بعض کو مدرج۔ بعض کو باطل۔ بعض کو منکر۔ بعض کو صحیح بتایا۔ پوچھنے والے نے کہا کہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا۔ کیا راوی نے آپ کو ان باتوں کی اطلاع دی؟ ابوحاتم نے کہا۔ نہیں! بلکہ مجھکو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ سائل نے کہا۔ تو کیا آپ علم غیب کے مدعی ہیں۔ ابوحاتم نے جواب دیا کہ تم اور ماہرین فن سے پوچھو۔ اگر وہ میرے ہمزبان ہوں تو سمجھنا کہ میں نے بیجا نہیں کہا۔ سائل نے ابوزرعہ سے وہ حدیثیں جاکر دریافت کیں۔ انہوں نے ابوحاتم کی موافقت کی۔ تب سائل کو تسکین ہوئی۔

بعض محدثین کا قول ہے۔ اثر یھجم علی قلوبھم لا یمکنھم ردہ وھیئۃ نفسانیۃ لا معدل لھم یعنے "وہ ایک امر ہے جو ائمہ حدیث کے دل پر وارد ہوتا ہے اور وہ اسکو رد نہیں کر سکتے اور نفسانی اثر ہے جس سے گریز نہیں ہو سکتا"۔ محدثین کا یہ دعوے بالکل

[1] فتح المغیث صفحہ ۹۸ [2] فتح المغیث صفحہ ۹۸۔

صحیح ہے۔ بے شبہہ فن روایت کی ممارست سے ایک ملکہ یا ذوق پیدا ہوجاتا ہے۔ جس سے خود تمیز ہوجاتی ہے کہ یہ قول رسول اللہ کا ہوسکتا ہے یا نہیں۔

اسیطرح شریعت کے احکام اور مسائل۔ اور اُنکے اسرار و مصالح کے تتبع اور استقراء سے ایسا ذوق حاصل ہوسکتا ہے جس سے یہ تمیز ہوسکتی ہے کہ رسول اللہ نے یہ حکم دیا ہوگا۔ یا نہیں لیکن ان اسرار اور مصالح کا تتبع محدث کا فرض نہیں ہے۔ وہ مجتہد کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ان دقیق وجوہ کے لحاظ سے امام ابوحنیفہ نے بعض حدیثوں کو معلل قرار دیا۔ تو ارباب ظاہر نے مخالفت کی۔ اور بعضوں کو یہ گمانی ہوئی۔ کہ امام صاحب حدیثوں کو عقل و رائے کی بنا پر رد کرتے ہیں۔ لیکن انصاف پسند انصاف کرسکتا ہے کہ جب روایات اور ظاہر الفاظ کے استقراء سے محدثین کو ایسا مذاق پیدا ہوجاتا ہے۔ جس سے وہ ایک حدیث کو جسمیں بظاہر صحت کی تمام شرطیں پائی جاتی ہیں۔ رد کرسکتے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ جس شخص نے دقت نظر اور نکتہ شناسی کے ساتھ احکام شریعت کے اسرار اور مصالح کا تتبع کیا ہو وہ ایسے وجدان اور ذوق سے محروم رہے۔ البتہ یہ نہایت نازک اور ذمہ داری کا کام ہے جسکا صرف وہ شخص متکفل ہوسکتا ہے۔ جو بہت ہی بڑا عالم مجتہد۔ محدث۔ دقیقہ بین۔ موید بتائید آلہی ہو۔ لیکن ان شرطوں کا جامع امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالی سے زیادہ کون ہوسکتا ہے۔

نہایت مہتم بالشان اور دقیق چیز جو امام ابوحنیفہ نے اس فن میں اضافہ کی وہ احادیث کے مراتب کا تفاوت اور اُن تفاوتوں کے لحاظ سے احکام شرعیہ کی تقسیم ہے۔ احکام اور مسائل کا پہلا ماخذ قرآن ہے جسمیں کسی کو گفتگو نہیں ہوسکتی۔ قرآن کے بعد حدیث کا رتبہ ہے حدیث اور قرآن میں اصل امر کے لحاظ سے تو چنداں فرق نہیں۔ وہ وحی متلو ہے اور یہ غیر متلو۔ جو کچھ تفاوت اور اختلاف ہے وہ ثبوت کی حیثیت سے ہے۔ اگر کوئی حدیث اُسی تواتر اور قطعیت سے ثابت ہو جسطرح قرآن ثابت ہے تو اثبات احکام میں وہ قرآن کے ہم پلہ ہے لیکن حدیثوں کے ثبوت کے مراتب متفاوت ہیں۔ اور احکام کے ثبوت میں انہیں تفاوتوں کے لحاظ کی ضرورت ہے۔ محدثین نے حدیث کی جو تقسیمیں کی ہیں۔ یعنی صحیح حسن۔ ضعیف۔ مشہور۔ عزیز۔ غریب۔ وغیرہ اُنکے اختلاف مراتب سے احکام پر چنداں اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ ان قسموں میں سے محدثین صرف ضعیف کا اعتبار نہیں کرتے۔ باقی اقسام کو قریباً یکساں قابل حجت قرار دیتے ہیں۔ محدثین کو اس سے زیادہ تدقیق اور امتیاز مراتب کی ضرورت پڑی۔ انہوں نے نوعیت ثبوت کے لحاظ سے حدیث کی تین قسمیں قرار دیں۔

(۱) متواتر۔ یعنی وہ حدیث جسکی رواۃ ہر طبقہ روایت میں اس کثرت سے ہوں۔ جنکی تواتر علی الکذب کا گمان نہیں ہو سکتا۔ یعنی رسول اللہؐ سے بیشمار لوگوں نے روایت کی ہو۔ اسی طرح اُن لوگوں سے لیکر اخیر زمانہ تک بیشمار رواۃ روایت کرتے آتے ہوں۔

(۲) مشہور یعنی وہ حدیث جسکی رواۃ پہلی طبقہ روایت میں تو بہت نہوں۔ لیکن دوسرے طبقہ سے اخیر تک اُسی کثرت سے ہوں۔ جو متواتر کے لئے مشروط ہے۔

(۳) احاد۔ جو متواتر اور مشہور نہو۔ اس تقسیم کا اثر اُنکی رائے کے موافق احکام شرعیہ پر جو پڑتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ متواتر سے فرضیت اور رکنیت ثابت ہو سکتی ہے مشہور کا درجہ چونکہ متواتر سے کم ہے۔ اسلئے اُس سے فرضیت کا اثبات تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرآن میں جو حکم مطلق ہو۔ حدیث مشہور سے مقید ہو سکتا ہے۔ اسیطرح اُس سے زیادہ علی الکتاب ہو سکتی ہے احاد کا ثبوت چونکہ بالکل ظنی ہے۔ اسلئے وہ قرآن کے احکام منصوصہ پر کچھ اثر نہیں پیدا کر سکتی۔ یہ مسئلہ اگرچہ نہایت واضح اور صاف ہے لیکن تعجب ہے کہ امام شافعی اور بعض اور محدثین اسکے مخالف ہیں۔ امام بیہقی وغیرہ نے بعض مناظرات نقل کئے ہیں۔ جو امام شافعی اور امام محمدؒ میں واقع ہوئے اور جنمیں یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ اس مسئلہ میں امام شافعی نے امام محمدؒ کو بند کر دیا۔ اگرچہ ہمارے نزدیک یہ مناظرے فرضی مناظرے ہیں۔ جن کا ثبوت اصول روایت کے مطابق ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس سے اسقدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کا انتساب۔ امام ابوحنیفہ کیطرف ضرور صحیح ہے۔

قوی سے قوی اعتراض اس مسئلہ پر جو کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ خود امام ابوحنیفہ اور اُن کے تلامذہ اُسکے پابند نہ رہ سکے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے۔ کہ امام شافعی نے امام محمدؒ سے کہا کہ کیا آپکے نزدیک خبر واحد سے قرآن پر زیادتی نہیں ہو سکتی امام محمدؒ نے کہا ہاں۔ امام شافعی نے کہا قرآن مجید میں وارثوں کے حق میں وصیت کا حکم ہے آپ اس حدیث کی بنا پر لا وصیۃ لوارث وصیت کو ناجائز کیوں قرار دیتے ہیں۔

غالباً شاہ صاحب نے یہ روایت بیہقی کی کتاب مناقب الشافعی سے لی ہے جسمیں اور بھی بہت بے سروپا روائتیں مذکور ہیں لیکن ہم شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ حنفیوں کے نزدیک وارثوں کے حق میں وراثت کا حکم کسی حدیث سے نہیں منسوخ ہوا۔ بلکہ خود قرآن مجید کی اُس آیت سے جسمیں توریث کے احکام ہیں۔ یہ صرف حنفیوں ہی کی رائے نہیں بلکہ تمام مفسرین کا یہی قول ہے (الا الشاذ النادر منہم)

ان مسائل پر اور بھی بہت سی بحثیں پیدا ہو گئی ہیں۔ جنکی تفصیل ہم نہیں کر سکتے لیکن احاد

احاد کی بحث اور اُس سے عقائد اسلام پر جو اثر پڑتا ہے اُسکو ہم اس موقع پر تفصیل سے لکھتے ہیں کیونکہ بعض محدثین کو زیادہ تر اسی مسئلہ میں اُن سے اختلاف ہے۔

اخبار احاد کی نسبت اگرچہ محققین اور اکثر ائمہ حدیث کا یہی مذہب ہے کہ وہ ظنی الثبوت ہیں لیکن ایک فرقہ اسکے خلاف بھی ہے۔ جسکے سرگروہ علامہ ابن الصلاح ہیں۔ اگرچہ علامہ ابن الصلاح نے بھی اخبار احاد کی تمام اقسام کو قطعی نہیں تسلیم کیا ہے۔ انہوں نے حدیث صحیح کی سات قسمیں کی ہیں۔ (۱) جسپر بخاری و مسلم دونوں متفق ہوں (۲) بخاری متفرد ہوں۔ (۳) مسلم متفرد ہوں (۴) بخاری و مسلم نے اُسکو روایت نہ کیا ہو۔ لیکن اُنکی شرطوں کے موافق ہو۔ (۵) صرف بخاری کی شرط پر ہو۔ (۶) صرف مسلم کی شرط پر ہو۔ (۷) بخاری و مسلم کی شرط کے موافق نہ ہو۔ لیکن اور محدثین نے اسکو صحیح تسلیم کیا ہو۔ ان سات قسموں میں سے علامہ ابن الصلاح پہلی قسم کو قطعی الصحۃ قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ وھذا القسم جمیعہ مقطوع بصحتہ والعلم النظری واقع بہ متفردات بخاری اور مسلم کی نسبت اُن کی رائے ہے کہ اسی قبیل میں داخل ہیں۔ بجز اُن چند حدیثوں کے جن پر دارقطنی وغیرہ نے جرح کی ہے۔ ابن الصلاح کا قول۔ اگرچہ ظاہر بینوں میں اور بالخصوص آج کل زیادہ رواج پا گیا ہے۔ لیکن کچھ شبہہ نہیں کہ وہ بالکل غلط اور بے دلیل خیال ہے۔ اور خود ائمہ حدیث اُس کے مخالف ہیں۔ علامہ نووی شرح صحیح مسلم میں ابن الصلاح کا قول تفصیلاً نقل کر کے لکھتے ہیں۔ وھذا الذی ذکرہ الشیخ فی ھذہ المواضع خلاف ما قولہ المحققون والاکثرون فانھم قالوا احادیث الصحیحین التی لیست بمتواترۃ تفید الظن فانھا احاد والاحاد انما تفید الظن علی ما تقرر ولا فرق بین البخاری ومسلم وغیرھما فی ذلک یعنے شیخ ابن الصلاح نے ان موقعوں پر جو کچھ کہا وہ محققین اور اکثروں کی رائے کے خلاف ہے۔ کیونکہ محققین اور اکثر علما کا قول ہے۔ کہ صحیحین کی حدیثیں جو تواتر کے رتبہ کو نہیں پہنچی ہیں۔ صرف ظن کی مفید ہیں۔ کیونکہ وہ اخبار احاد ہیں۔ اور اخبار احاد کی نسبت ثابت ہو چکا ہے۔ کہ اُن سے صرف ظن پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اسباب میں بخاری و مسلم اور اور لوگ سب برابر ہیں"۔ ابن الصلاح کے قول کو اور ائمہ فن نے بھی رد کیا ہے۔ لیکن ہم اس بحث کو نقلی طور سے طے کرنا نہیں چاہتے۔ ہم کو خود غور کرنا چاہئے۔ کہ اخبار احاد سے یقین پیدا ہو سکتا ہے یا ظن۔

کسی حدیث کو جب ایک محدث گو وہ کسی رتبہ کا ہو۔ صحیح کہتا ہے تو اُسکا یہ دعوے درحقیقت چند ضمنی دعوٰں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ یہ روایت متصل ہے۔ اُسکے رواۃ ثقہ ہیں۔

ضابط القلب ہیں۔ روایت میں شذوذ نہیں ہے۔ کوئی علۃ قادحہ نہیں ہے۔ یہ سب امور ظنی اور اجتہادی ہیں جن پر یقین کی بنیاد قائم ہو سکتی۔ جس طرح ایک فقیہ کسی مسئلہ کو قرآن یا حدیث سے استنباط کر کے اپنی دانست میں صحیح سمجھتا ہے۔ اور اُس کی صحت یقینی نہیں ہوتی۔ کیونکہ استنباط میں جن مقدمات سے اُس نے کام لیا ہے۔ اکثر اُس کے ظنیات ہیں اسیطرح حدیث کا حال ہے۔ کسی حدیث کو صحیح کہنا محدث کے ظنیات و اجتہادات پر مبنی ہے۔ ایک یا چند محدثین نے کسی حدیث کو اگر صحیح کہا ہے۔ اور دوسرا شخص اُسکی صحت نہیں تسلیم کرتا تو وہ صرف اس گناہ کا مجرم ہے کہ اُس محدث یا محدثین کے اصول تحقیق۔ قواعد استنباط طریق روایت۔ غرض اُن کے اجتہادات اور مزعومات کا مخالف ہے۔ حدیث کی تحقیق و تنقید کے لیے محدثین نے جو اصول مقرر کیے ہیں اور جنپر احادیث کی صحت کا مدار ہے سب عقلی اور اجتہادی مسائل ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُن میں۔ خود محدثین باہم اختلاف عظیم رکھتے ہیں۔ ظاہر بینوں کا خیال ہے کہ حدیث کا فن نقلی ہے نہ نقلی لیکن جس شخص نے اصول حدیث پر غور کی ہے۔ وہ اس خیال کی غلطی کو نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے اسی نکتہ کیطرف امام ابوحنیفہ۔ نے اشارہ کیا ہے کہ ھذا الذی نحن فیہ رای لا نجبر علیہ احدا ولا نقول یجب علی احد قبولہ بعضوں نے غلطی سے امام صاحب کے اس وسیع قول کو فقہ پر محدود سمجھا۔ لیکن اُن کو معلوم نہیں کہ مجتہد کو مسائل سے زیادہ مسائل کے ماخذ سے بحث ہوتی ہے۔

اصول حدیث کے ظنی اور اجتہادی ہونیکا ہی اثر ہے۔ کہ محدثین کو احادیث کی صحت و عدم صحت میں باہم اختلاف ہوتا ہے۔ ایک محدث ایک حدیث کو نہایت صحیح مستند واجب العمل قرار دیتا ہے۔ دوسرا اُسی کو ضعیف بلکہ موضوع کہتا ہے۔ محدث ابن جوزی نے بہت سی حدیثوں کو موضوعات میں داخل کیا ہے۔ جنکو دوسرے محدثین صحیح اور حسن کہتے ہیں۔ ابن جوزی نے تو یہ قیامت کی صحیحین کی بعض حدیثوں کو موضوع لکھ دیا۔ علامہ سخاوی لکھتے ہیں۔ بل ربما ادرج فیھا الحسن والصحیح مما ھو فی احدی الصحیحین فضلا عن غیرھما یعنے "ابن جوزی نے حسن اور صحیح تک کو جو بخاری یا مسلم میں موجود ہیں موضوعات میں درج کر دیا ہے۔ دوسری کتابوں کا کیا ذکر ہے"۔ بے شبہہ ابن جوزی نے اس افراط میں غلطی کی۔ لیکن یہ غلطی ایک اجتہادی غلطی ہے جسکا حاصل اسیقدر ہے کہ انہوں نے بخاری یا مسلم کی صحیح اجتہاد کو غلط خیال کیا۔ ان اصولی اختلافات کی وجہ سے احادیث کی صحت اور عدم صحت میں جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ اُنکا استقصاء

کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

حدیث مرفوع کی پہلی ضروری شرط یہ ہے کہ رسول اللہؐ تک متصل ثابت ہو۔ لیکن اتصال کے ثبوت کے جو طریقے تسلیم کئے ہیں۔ اُن میں اکثر ظنی اور اجتہادی ہیں۔ صحابہؓ کے ان الفاظ کو۔ "یہ امر سنت ہے"۔ "ہم کو یہ حکم دیا گیا تھا"۔ "ہم اسبات سے روکے گئے تھے"۔ "رسول اللہؐ کے زمانہ میں ہم فلاں کام کرتے تھے"۔ یا ہم اُس کو بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ اکثروں نے مرفوع قرار دیا ہے۔ اور بعض نے یہانتک وسعت دی کہ جن حدیثوں میں یہ الفاظ تھے اُن کو ان لفظوں سے روایت کر دیا۔ کہ "رسول اللہؐ نے یہ فرمایا"۔ حالانکہ یہ الفاظ اس معنی میں قطعی الدلالہ نہیں ہیں۔ بلکہ صحابہؓ کے ظن اور اجتہاد پر مبنی ہیں۔ جسکی نسبت عموماً تسلیم کیا گیا ہے کہ فہم الصحابی لیس بحجۃ یعنے صحابیؓ کی سمجھ کوئی دلیل نہیں۔ اسی بنا پر بعض علماء نے اختلاف کیا اور کہا کہ یہ الفاظ اتصال و رفع کے لیئے کافی نہیں ہیں۔ امام شافعی ابن حزم ظاہری۔ ابوبکر رازی۔ اور دیگر محققین نے۔ صحابہؓ کے اس قول کو کہ "یہ فعل سُنت ہے"۔ حدیث مرفوع نہیں قرار دیا۔ کتب سیر و احادیث میں بیسیوں مثالیں ملتی ہیں جنمیں صحابیؓ نے یہ الفاظ استعمال کئے اور وہ حدیث نبوی نہ تھی۔ بلکہ خود اُن کا قیاس و اجتہاد تھا۔ لیکن اکثر محدثین نے ان حدیثوں کو مرفوع کہا۔ اس خیال نے یہ آفت پیدا کی کہ اُسکی بنا پر بعض رواۃ نے صریح مرفوع الفاظ میں حدیث کی روایت کر دی۔ جسکی وجہ سے ایک عام شبہہ پیدا ہو گیا۔

معنعن روایتوں میں اتصال کا ثابت ہونا نہایت مشکل ہے۔ حالانکہ اس قسم کی روائتیں کثرت سے ہیں۔ امام بخاری کا مذہب ہے کہ معنعن حدیثوں میں اگر یہ ثابت ہو کہ راوی اور مروی عنہ دونوں ہمزمان تھے اور کبھی ملے بھی تھے تو وہ حدیث متصل سمجھی جائیگی امام مسلم حالانکہ امام بخاری۔ کے شاگرد اور زیادہ تر انہیں کے طریقے کے پیرو تھے۔ تاہم انہوں نے نہایت سختی سے اس شرط کی مخالفت کی اور صرف ہمزمان ہونا کافی سمجھا[۱]۔ اس اختلاف کا یہ نتیجہ ہے۔ کہ امام بخاری کے اصول کے موافق۔ امام مسلم۔ کی وہ تمام معنعن روائتیں جنمیں لقا نہیں ثابت ہے۔ مقطوع ہیں۔ حالانکہ امام مسلم۔ اُن کو متصل سمجھتے ہیں اور اُسپر اُن کو یہانتک اصرار ہے کہ اپنے مخالف کو سخت الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ امام مسلم نے تو زیادہ توسیع کی لیکن امام بخاری۔ کی شرط کے موافق بھی معنعن روایت میں۔ اتصال کا ثبوت محض ظنی ہے۔ یہ کچھ ضرور نہیں۔ کہ دو شخص ہمزمان اور باہم لقا ہوں تو اُنکی روائتیں ہمیشہ بالذات

[۱] دیکھو مقدمہ صحیح مسلم۔

ہوں۔ جہاں حدثنا اور اخبرنا ہوگا۔ وہاں ایسا ہونا البتہ ضرور ہے۔ لیکن اگر یہ الفاظ نہیں ہیں اور راوی نے عن کے لفظ سے روایت کی ہے تو اتصال کا خیال قیاس غالب ہوگا۔ لیکن یقینی نہ ہوگا۔ حدیث وسیر۔ میں بیسیوں مثالیں ملسکتی ہیں کہ دو راوی۔ ایک زمانہ میں تھے اور آپس میں ملاقات بھی تھی۔ تاہم ایک نے دوسرے سے بعض روائتیں بواسطہ کیں۔ روزمرہ کے تجربوں میں اسکی سیکڑوں شہادتیں ملتی ہیں۔

سب سے بڑا ضروری اور اہم مسئلہ رجال کی تنقید ہے۔ اخبار احاد کا تمامتر مدار۔ رجال پر ہے۔ لیکن رجال کی تنقید و توثیق۔ ایسا ظنی مسئلہ ہے۔ جسکا قطعی فیصلہ نہایت مشکل اور قلیل الوجود ہے۔ ایک شخص کو بہت سے لوگ نہایت ثقہ۔ نہایت متدین۔ نہایت راستباز سمجھتے ہیں۔ اسی شخص کو دوسرے اشخاص ضعیف الروایۃ۔ غیر ثقہ۔ ناقابل اعتبار۔ خیال کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ دونوں فریق اس رتبہ کے ہوتے ہیں۔ جنکی عظمت وشان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ امام بخاری ومسلم میں گو ایسا سخت اختلاف نہیں ہے۔ تاہم بہت سی رواۃ ہیں جنکو ان دونوں اماموں میں سے ایک قابل حجت سمجھتا ہے۔ اور دوسرا نہیں سمجھتا۔ علامہ نووی۔ نے مقدمہ شرح صحیح مسلم میں بعضوں کے نام بھی لکھے ہیں۔ اور محدث حاکم کی کتاب المدخل سے نقل کیا ہے کہ اُن لوگوں کی تعداد جن سے امام مسلم نے مسند صحیح میں احتجاج کیا ہے اور امام بخاری نے جامع صحیح۔ میں اُن سے حجت نہیں لی ۶۲۵ ہے۔

میزان الاعتدال۔ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں رُواۃ ہیں جن کی جرح وتعدیل مختلف فیہ ہے اور ایسا ہونا ضرور تھا۔ کسی شخص کے اُن تمام اوصاف و عادات پر مطلع ہونا۔ جنکا اثر روایت کی قوت وضعف پر پڑسکتا ہے۔ مدتوں کی ملاقات اور تجربہ پر موقوف ہے۔ جو لوگ جرح وتعدیل کے کام میں مصروف تھے۔ سیکڑوں ہزاروں راویوں سے ایسی عمیق واقفیت کیونکر حاصل کرسکتے تھے۔ اسی لئے مختلف قرائن ظاہری آثار۔ عام شہرت۔ سمعی روایتوں سے۔ کام لینا پڑتا تھا۔ اور بہت کم قطعی فیصلہ ہوسکتا تھا۔ اگرچہ محدثین۔ نے ان متعارضات کے رفع کرنے کے لئے اصول قرار دیئے ہیں لیکن وہ اصول خود اجتہادی اور مختلف فیہ ہیں۔ اسکے علاوہ متعدد موقعوں پر محدثین کو خود اپنے اصول سے انحراف کرنا پڑتا ہے۔ جرح کو عموماً تعدیل پر مقدم مانا گیا ہے۔ لیکن بہت سی رواۃ ہیں جنکی نسبت اس قاعدہ کی پابندی نہیں کیجاتی۔ محمد بن بشار المصری احمد ابن صالح مصری۔ عکرمہ مولی ابن عباسؓ۔ کی نسبت مفسر جرحیں موجود ہیں تاہم ان جرحوں کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔

تعجب یہ ہے۔ کہ جارحین و معدلین دونوں ائمہ فن ہوتے۔ اور اُن راویوں میں اس قدر اختلاف ہوتا ہے۔ جس سے تعجب پیدا ہوتا ہے۔ جابر جعفی کوفی۔ ایک مشہور راوی ہے۔ جسکو دعوے تھا کہ مجھکو پچاس ہزار حدیثیں یاد ہیں۔ اُسکی نسبت ائمہ جرح و تعدیل کی یہ رائیں ہیں۔

سفیان گا قول ہے کہ میں نے جابر سے زیادہ محتاط حدیث میں نہیں دیکھا۔ شعبہ کہتے ہیں۔ کہ جابر جب اخبرنا و حدثنا کہیں تو وہ الثاس ہیں۔ امام سفیان ثوری نے شعبہ سے کہا کہ اگر تم جابر جعفی میں گفتگو کرو گے۔ تو میں تم میں گفتگو کرونگا۔ وکیع۔ کا قول ہے کہ تم لوگ اور کسی بات میں شک کرو تو کرو۔ لیکن اسبعبات میں کچھ شک نہ کرو۔ کہ جابر جعفی۔ ثقہ ہیں۔ اسکے مقابلہ میں اور ائمہ فن کی رائیں ہیں۔ جسکے یہ الفاظ ہیں کہ وہ متروک ہے۔ کذاب ہے۔ وضاع ہے۔ چنانچہ اخیر فیصلہ جو پچھلے محدثوں نے کیا۔ وہ یہی ہے۔ کہ جابر کی روایت قابل اعتبار نہیں۔

اس سے یہ غرض نہیں کہ جرح و تعدیل کا فن ناقابل اعتبار ہے۔ بلکہ یہ مقصود ہے کہ جن وسائل اور طریق سے رجال کے حالات قلمبند کئے گئے اور کئے جا سکتے تھے۔ اُن کا مرتبہ ظن غالب۔ یا محض ظن سے فائق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اُس پر یقینیات اور قطعیات کی بنیاد نہیں قائم ہو سکتی۔

ان امور کے بعد تادیہ معنی کی بحث باقی رہتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث[2] تمام محدثین اور مجتہدین کے اصول کے موافق متصل بھی ہے۔ رُواۃ بھی ثقہ ہیں۔ تشذذ بھی نہیں ہے لیکن یہ بحث اب بھی باقی ہے کہ راوی نے ادا ے مطلب کیونکر کیا؟ موقع اور محل روایت کی تمام خصوصیتیں ملحوظ رکھیں یا نہیں؟ فہم مطلب۔ یا طریقہ ادا۔ میں تو کوئی غلطی نہیں کی چونکہ یہ مسلّم ہے کہ حدیثیں اکثر بالمعنی روایت کی گئی ہیں۔ اس لئے ان احتمالات کو زیادہ قوت ہو جاتی ہے۔ صحابہ کے زمانہ میں کسی روایت کی صحت سے انکار کیا جاتا تھا۔ تو اسی بنا پر کیا جاتا تھا۔ ورنہ یہ ظاہر ہے کہ صحابہ عموماً ثقہ تھے اور اُن کی روایت میں انقطاع کا کوئی احتمال نہ تھا۔ صحیح مسلم باب التیمم میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر سے مسئلہ دریافت کیا کہ مجھ کو غسل کی حاجت ہوئی اور پانی نہ ملا۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ نماز نہ پڑھو۔ عمار۔ موجود تھے انہوں نے اس مسئلہ کے متعلق رسول اللہ سے ایک روایت بیان کی اور کہا کہ اُس موقع پر آپ بھی موجود تھے۔ حضرت عمر نے کہا۔ اتق اللہ یا عمار یعنی "اے عمار خدا سے ڈرو" یہ ظاہر ہے کہ حضرت عمر۔ عمار۔ کو کاذب الروایۃ نہیں

سمجھتے تھے۔ لیکن اس احتمال پر کہ شاید ادائے مطلب میں غلطی ہوئی۔ یہ الفاظ فرمائے چنانچہ عمار نے کہا "کہ اگر آپ کی مرضی نہ ہو تو میں یہ حدیث نہ روایت کیا کروں"۔ اخبار احاد کی بحث کو ہم نے قصداً اسلئے طول دیا کہ محدثین زیادہ تر اسی مسئلہ کی وجہ سے امام ابوحنیفہ پر رد و قدح کرتے ہیں۔ حالانکہ امام صاحب کا مذہب۔ نہایت تحقیق اور دقت نظر پر مبنی ہے۔

یہ تمام احتمالات اور اجتہادات اخبار احاد کے ساتھ مخصوص ہیں۔ متواتر اور مشہور میں ان بحثوں کا مساغ نہیں۔ انہیں وجوہ اور اسباب سے اخبار احاد کے متعلق مختلف رائیں پیدا ہو گئیں۔ معتزلہ نے تو سرے سے انکار کیا۔ اُن کے مقابلہ میں بعض محدثین نے یہ شدت کی کہ خبر واحد کو قطعی قرار دیا۔ صرف یہ شرط لگائی کہ رواۃ ثقہ ہوں۔ اور انقطاع وشذوذ و علت نہو۔ بعض محدثین اگرچہ اصول کے طور پر اخبار احاد کو ظنی کہتے ہیں۔ لیکن جزئیاتِ احکام اور مسائل اعتقادی میں اسکا خیال نہیں رکھتے۔ امام ابوحنیفہ نے اس بحث میں جو مسلک اختیار کیا وہ نہایت معتدل اور انکی دقت نظر کی بہت بڑی دلیل ہے۔ انہوں نے نہ معتزلہ کیطرح سرے سے انکار کیا۔ نہ ظاہر بینوں کیطرح خوش اعتقادی سے اُس کی قطعیت تسلیم کی۔ امام صاحب کی یہ رائے بڑے بڑے صحابہ کی رائے کے موافق ہے۔ حضرت عمر۔ حضرت عائشہ۔ عبد اللہ بن مسعود نے متعدد موقعوں پر خبر واحد کی تسلیم میں تردد کیا ہے۔ جس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اخبار احاد کو قطعی نہیں سمجھتے تھے۔ فاطمہ بنت قیس نے جب حضرت عمر کے سامنے رسول اللہ سے روایت کی کہ لا سکنیٰ و لا نفقۃ تو حضرت عمر نے فرمایا۔ لا نترک کتاب اللہ بقول امرأۃ لا ندری صدقت ام کذبت یعنی "ایک عورت کی روایت کی بنا پر جس کی نسبت معلوم نہیں کہ اُس نے غلط کہا یا صحیح۔ ہم کتاب الٰہی کو چھوڑ نہیں سکتے" فقہی احکام اس قاعدہ کی متعدد تفریعیں ہیں مثلاً یہ کہ اخبار احاد سے کسی حکم کا فرض ہونا نہیں ثابت ہو سکتا۔ کیونکہ فرضیت۔ ثبوت قطعی کی محتاج ہے البتہ اُس سے ظن غالب پیدا ہوتا ہے۔ اسلئے وجوب۔ تسنن۔ استحباب۔ ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر نماز میں قراۃ فاتحہ کو امام شافعی فرض سمجھتے ہیں۔ اور امام ابوحنیفہ۔ واجب اس اصول پر بہت سے احکام متفرع ہیں۔

فقہ۔ سے زیادہ اس قاعدہ کا اثر علم کلام پر پڑتا ہے۔ اور یہی چیز ہے۔ جس نے ایک عالم کو امام ابوحنیفہ کا مخالف بنا دیا تھا۔ امام صاحب نے مذکورۂ بالا قاعدہ کی بنا پر یہ اصول

قرار دیا تھا کہ جو مسائل اور عقائد۔ اسلام میں متفق علیہ ہیں۔ اُن کے خلاف اخبار احاد قابل اعتبار نہیں۔ مثلاً انبیا کی عصمت۔ اہل حق کا ایک مسلم مسئلہ ہے۔ اسکے برخلاف جن روائیوں سے انبیا کا مرتکب کبائر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے اصول کے موافق وہ روائتیں قابل اعتبار نہیں۔ اس اصول کی بنا پر بہت سے اشکالات سے جو ملاحدہ پیش کرتے ہیں نجات ملتی ہے۔ لیکن افسوس ہے۔ کہ اکثر ارباب روایت نے اس عمدہ اصول کی قدر نہ کی بلکہ اُلٹی اور مخالفت کی۔ علامہ ابن عبد البر نے جو مشہور محدث ہیں کتاب الکنی میں لکھا ہے۔ کان من مذھب الامام ابی حنیفہ فی اخبار احاد ان لا یقبل منھا المخالف الاصول المجمع علیھا فانکر علیہ اصحاب الحدیث فافرطوا[1]

یعنی "اخبار احاد میں امام ابوحنیفہ کا یہ مذہب تھا کہ اصول متفق علیہ کے خلاف ہو۔ تو قابل قبول نہیں۔ اسپر اصحاب حدیث نے اُنکی مخالفت کی اور افراط کو پہنچا دیا"۔

محدثین اور امام ابوحنیفہ کے اصول میں عملاً یہ فرق ہے کہ جو حدیث اصول متفق علیہ کے خلاف ہوتی تھی۔ محدثین اُس کی صحت کو تسلیم کرکے تاویل سے کام لیتے تھے۔ حالانکہ اکثر جگہ محض بارد تاویل ہوتی تھی بخلاف اسکے امام صاحب اس طرف مائل ہوتے تھے۔ کہ چونکہ وہ حدیث متواتر اور مشہور نہیں ہے۔ اسلئے ممکن ہے کہ رُواۃ نے غلطی یا مسامحت کی ہو۔ امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں ایک بحث لکھی ہے۔ جو اس موقع کی ایک عمدہ مثال ہے وہ لکھتے ہیں کہ "ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ یہ حدیث جسمیں بیان کیا گیا ہے۔ کہ حضرت ابراہیم تین بار جھوٹ بولے۔ ما کذب ابراھیم الا ثلث کذبات۔ صحیح نہیں۔ کیونکہ اس سے حضرت ابراہیم کا (نعوذ باللہ) کاذب ہونا لازم آتا ہے۔ اُس شخص نے کہا کہ اس حدیث کی رُواۃ ثقہ ہیں اُن کو کاذب کیونکر کہا جائے۔ میں نے جواب دیا۔ کہ حدیث کو صحیح مانیں تو حضرت ابراہیم کا کذب لازم آتا ہے اور غلط تسلیم کریں۔ تو راوی کو کاذب ماننا پڑتا ہے۔ لیکن یہ بدیہی بات ہے کہ حضرت ابراہیم کو راوی پر ترجیح ہے"۔ امام رازی کا استدلال۔ امام ابوحنیفہ کے اسی خیال پر مبنی ہے۔ یعنی چونکہ انبیا کا معصوم اور صادق ہونا متفق علیہ ہے۔ اسلئے خبر واحد اُسکے متعارض نہیں ہوسکتی۔ افسوس ہے کہ محدث قسطلانی صحیح بخاری کی شرح میں اس استدلال کو نقل کرکے لکھتے ہیں۔ کہ "جب رُواۃ ثقہ ہیں تو حدیث کو بہرحال صحیح ماننا چاہئے"۔

اسی اصول پر امام صاحب اسبات کے قائل ہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ہر سورہ

[1] اس عبارت کو حافظ ابو المحاسن نے عقود الجمان میں نقل کیا ہے۔ ۱۲

کے شروع میں جزو قرآن نہیں ہے" امام شافعی - اور بعض محدثین اسکے خلاف ہیں - اور سند میں چند حدیثیں پیش کرتے ہیں - امام ابو حنیفہ کیطرف سے یہ جواب ہے - کہ قرآن تواتر سے ثابت ہے اور جو تواتر سے ثابت ہے - وہی قرآن ہے - اخبار احاد سے قرآن نہیں ثابت ہوسکتا - اسی طرح امام صاحب کے اصول کے مطابق - وہ روائتیں قابل اعتنا نہیں - جن میں عبد اللہ بن مسعود کیطرف معوذتین - کا انکار منسوب کیا گیا ہے - حافظ ابن حجر نے ان روائتوں کو صحیح تسلیم کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ "روایت سے انکار نہیں کرنا چاہئے بلکہ تاویل سے کام لینا چاہئے" لیکن تاویل کیا ہوسکتی ہے - خدانخواستہ یا تو ماننا پڑیگا کہ معوذتین - متواتر نہیں ہیں - یا تواتر کا اتنا رتبہ گھٹانا ہوگا - کہ رسول اللہ کے اصحاب کو بھی اُس سے واقف ہونا ضرور نہ ہو امام صاحب کے اس اصول کے مطابق اسلام کا دائرہ اُسقدر وسیع رہتا ہے - جسقدر کہ اُسکو رہنا چاہئے - بخلاف اسکے اور لوگوں کی رائے کے مطابق اُسکی وسعت نقطہ سے بھی کم رہجاتی ہے - مثلاً یہ مسلم اور یقینی ہے کہ جو شخص توحید و نبوت کا قائل ہے اور دل سے اُسپر اعتقاد رکھتا ہے - وہ قرآن مجید کی نص کے مطابق مسلمان ہے - اب اسکے مقابلہ میں وہ حدیثیں جو قطعی الثبوت نہیں ہیں - اور جنمیں بہت سے خارجی امور پر کفر کا حکم دیا گیا ہے - کچھ اثر نہیں پیدا کرسکتیں اسی بنا پر امام صاحب معتزلہ قدریہ جہمیہ - وغیرہ کو کافر نہیں کہتے تھے - اور اس قسم کی حدیثوں کا کہ بہتر فرقوں میں سے صرف ایک فرقہ جنتی ہے - اور باقی دوزخی" اعتبار نہیں کرتے تھے - لیکن بہت سے ظاہر بینوں نے ان حدیثوں کا یہ رتبہ قائم کیا کہ اُن کی بنا پر بات بات پر کفر کے فتوے دیئے یہانتک کہ جو شخص وضع قطع میں ذرا بھی کسی دوسرے کے مشابہ ہوجائے وہ کافر ہے خود متاخرین حنفیہ نے امام صاحب کے اس عمدہ اصول کو نظر انداز کردیا اور سینکڑوں ہزاروں مسئلے کفر کے ایجاد کر دیئے - جن کی تفصیل سے فقہ کی کتابیں - لامال ہیں -

فقہ

اسلامی علوم مثلاً - تفسیر - حدیث - فقہ - مغازی - انکی ابتداء اگرچہ اسلام کے ساتھ ساتھ ہوئی لیکن جبوقت تک اُن کو فن کی حیثیت نہیں حاصل ہوئی - وہ کسی خاص شخص کیطرف منسوب نہیں ہوئے - دوسری صدی کے اوائل میں تدوین و ترتیب شروع ہوئی ہے اور جن لوگوں نے تدوین و ترتیب کی وہ اُن علوم کے بانی کہلائے چنانچہ بانی فقہ کا لقب امام ابو حنیفہ کو ملا جو درحقیقت اس لقب کے سزاوار تھے - اگر ارسطو علم منطق کا موجد ہے -

تو بے شبہہ امام ابوحنیفہ بھی علم فقہ کے موجد ہیں۔ امام صاحب کی علمی زندگی کا بڑا کارنامہ فقہ کی تاریخ لکھیں جس سے ظاہر ہو کہ علم کب شروع ہوا۔ اور کیونکر شروع ہوا؟ اور خاص کر یہ کہ امام ابوحنیفہ نے جب اُس کو پایا تو اُس کی کیا حالت تھی؟

فقہ۔ کی تاریخ پر شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک نہایت عمدہ مضمون لکھا ہے جسکا التقاط ہمارے لئے کافی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ کے زمانہ میں احکام کی قسمیں نہیں پیدا ہوئی تھیں۔ آنحضرت صحابہ کے سامنے وضو فرماتے تھے۔ اور کچھ نہ بتلاتے تھے۔ کہ یہ رکن ہے۔ یہ واجب ہے یہ مستحب ہے صحابہ آپ کو دیکھکر۔ اُسیطرح وضو کرتے تھے۔ نماز کا بھی یہی حال تھا یعنے صحابہ۔ فرض وواجب وغیرہ کی تفصیل و تدقیق نہیں کیا کرتے تھے۔ جسطرح رسول اللہ کے اصحاب سے بہتر نہیں دیکھا۔ لیکن انہوں نے رسول اللہ کی تمام زندگی میں تیرہ مسئلوں سے زیادہ نہیں پوچھے۔ جو سب کے سب قرآن میں موجود ہیں البتہ جو واقعات غیر معمولی طور سے پیش آتے تھے اُنہیں۔ لوگ آنحضرت سے استفتا کرتے اور آنحضرت جواب دیتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ لوگوں نے کوئی کام کیا اور آپ نے اُس پر تحسین کی یا اُس سے ناراضمندی ظاہر کی۔ اس قسم کے فتادے اکثر عام مجمعوں میں ہوتے تھے۔ اور لوگ آنحضرت کے اقوال کو محفوظ رکھتے تھے۔ . . .

آنحضرت کی وفات کے بعد۔ فتوحات کو نہایت وسعت ہوئی۔ اور تمدن کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ واقعات اس کثرت سے پیش آئے کہ اجتہاد و استنباط کی ضرورت پڑی اور اجمالی احکام کی تفصیل پر متوجہ ہونا پڑا۔ مثلاً کسی شخص نے غلطی سے نماز میں کوئی عمل ترک کر دیا اب بحث یہ پیش آئی کہ "نماز ہوئی یا نہیں"۔ اس بحث کے پیدا ہونے کے ساتھ یہ تو ممکن نہ تھا۔ کہ نماز میں جسقدر اعمال تھے سب کو فرض کہدیا جاتا۔ صحابہ کو تفریق کرنی پڑی کہ نماز میں کتنے ارکان فرض و واجب ہیں کتنے مسنون اور مستحب۔ اس تفریق کے لئے جو اصول قرار دئے جا سکتے تھے۔ اُن پر تمام صحابہ کی رایوں کا متفق ہونا ممکن نہ تھا۔ اسلئے مسائل میں اختلاف آرا ہوا اور اکثر مسئلوں میں صحابہ کی مختلف رائیں قائم ہوئیں بہت سے ایسے واقعات پیش آئے کہ رسول اللہ کے زمانہ میں اُنکا عین واقعہ بھی پایا گیا تھا۔ صحابہ کو ان صورتوں میں استنباط۔ تفریع حمل النظیر علے النظیر۔ قیاس سے کام لینا پڑا۔ ان اصول کے طریقے یکساں نہ تھے۔ اسلئے ضروری اختلاف پیدا ہوئے۔ غرض صحابہ ہی کے زمانہ میں احکام اور مسائل۔ کا ایک۔ دفتر بنگیا اور جدا جدا طریقے قائم ہو گئے۔ صحابہ میں سے جن لوگوں نے استنباط و اجتہاد سے کام لیا۔ اور مجتہد یا فقیہ کہلائے اُن میں

سے چار بزرگ نہایت ممتاز تھے۔ عمرؓ۔ علی۔ عبداللہ بن مسعود۔ عبداللہ بن عباس۔ حضرت علی و عبداللہ بن مسعود زیادہ تر۔ کوفہ۔ میں رہے اور وہیں اُن کے مسائل و احکام کی زیادہ ترویج ہوئی۔ اس تعلق سے کوفہ۔ فقہ کا دار العلوم بنگیا۔ جسطرح کہ حضرت عمر و عبداللہ بن عباسؓ کے تعلق سے حرمین کو دار العلوم۔ کا لقب حاصل ہوا تھا۔

حضرت علیؓ۔ بچپن سے رسول اللہ کی آغوش تربیت میں پلے تھے۔ اور جسقدر اُن کو آنحضرت کے اقوال و افعال سے مطلع ہونے کا موقع ملا تھا۔ کسی کو نہیں ملا تھا۔ ایک شخص نے اُن سے پوچھا کہ آپ اور صحابہ کی نسبت کثیر الروایۃ کیوں ہیں؟ فرمایا کہ "میں آنحضرت سے کچھ دریافت کرتا تھا تو بتاتے تھے اور چپ رہتا تھا تو خود ابتدا کرتے تھے"۔ اس کے ساتھ ذہانت۔ قوت استنباط۔ ملکہ استخراج۔ ایسا بڑا ہوا تھا کہ عموماً صحابہ۔ اعتراف کرتے تھے حضرت عمرؓ کا عام قول تھا۔ کہ "خدا نہ کرے کہ کوئی مشکل مسئلہ آن پڑے اور علی موجود نہ ہوں"۔ عبداللہ بن عباس۔ خود مجتہد تھے مگر کہا کرتے تھے کہ "جب ہم کو علیؓ کا فتوے ملجائے تو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں"۔

عبداللہ بن مسعود بھی حدیث و فقہ۔ دونوں میں کامل تھے۔ رسول اللہ کے ساتھ جسقدر جلوت و خلوت میں وہ ہمدم و ہمراز رہے تھے بہت کم لوگ رہے ہوں گے۔ صحیح مسلم۔ میں ابو موسےٰ سے روایت ہے کہ ہم یمن سے آئے اور کچھ دنوں تک (مدینہ میں) رہے۔ ہم نے عبداللہ بن مسعود کو رسول اللہ کے پاس اس کثرت سے آتے جاتے دیکھا کہ ہم اُن کو۔ رسول اللہ کے اہلبیت سے گمان کرتے رہے"۔ عبداللہ بن مسعود کو دعوے تھا۔ کہ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جسکی نسبت میں یہ نہ جانتا ہوں کہ کس باب میں اُتری ہے" وہ کہا کرتے تھے کہ "اگر کوئی شخص قرآن مجید۔ کا مجھ سے زیادہ عالم ہوتا تو میں اُسکے پاس سفر کر کے جاتا"۔ صحیح مسلم میں ہے کہ۔ انھوں نے ایک مجمع میں دعوے کیا کہ تمام صحابہ۔ جانتے ہیں کہ میں قرآن کا سب سے زیادہ عالم ہوں۔ شفیق اس جلسہ میں موجود تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اس واقعہ کے بعد۔ میں اکثر صحابہ کے حلقوں میں شریک ہوا مگر کسی کو عبداللہ بن مسعود کے دعوے کا منکر نہیں پایا"۔

عبداللہ بن مسعود۔ باقاعدہ طور پر حدیث و فقہ کی تعلیم دیتے تھے اور اُن کی درسگاہ میں بہت تلامذہ کا مجمع رہتا تھا جنمیں سے چند شخص۔ یعنی اسود۔ عبیدہ۔ حارث۔ علقمہ نہایت نام آور ہوئے۔ علقمہ۔ رسول اللہ کی زندگی میں پیدا ہوئے تھے۔ اور حضرت عمر۔ عثمان علی۔ عائشہ۔ سعد۔ حذیفہ۔ خالد بن الولید۔ خباب۔ اور بہت سے صحابہ

سے حدیثیں روایت کیں۔ خاصکر۔ عبداللہ بن مسعود کی صحبت میں۔ اس التزام سے رہتے اور اُن کے طور و طریقہ کے اسقدر قدم بقدم چلتے تھے۔ کہ لوگوں کا قول تھا۔ کہ "جس نے علقمہ کو دیکھ لیا۔ اُس نے عبداللہ بن مسعود۔ کو دیکھ لیا"۔ خود عبداللہ بن مسعود۔ کا قول تھا کہ جسقدر علقمہ کی معلومات ہیں میری معلومات اُس سے زیادہ نہیں ہیں"۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ صحابہ اُن سے مسائل دریافت کرنے آتے تھے۔ عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں میں اگر کوئی شخص۔ علقمہ۔ کا ہمسر تھا تو اسود تھے۔

علقمہ و اسود کے انتقال کے بعد ابراہیم نخعی۔ مسند نشین ہوئے۔ اور فقہ۔ کو بہت کچھ وسعت دی۔ یہانتک کہ اُن کو فقیہ العراق کا لقب ملا۔ علم حدیث میں اُن کا یہ پایہ تھا کہ صیرفی الحدیث کہلاتے تھے۔ امام شعبی نے جو علامۃ التابعین کے لقب سے ممتاز ہیں اُن کی وفات کے وقت کہا کہ "ابراہیم نے کسی کو نہیں چھوڑا جو اُن سے زیادہ عالم اور فقیہ ہو"۔ اسپر ایک شخص نے تعجب سے پوچھا۔ کہ کیا حسن بصری۔ اور ابن سیرین۔ بھی۔ شعبی نے کہا حسن بصری اور ابن سیرین پر کیا ختم ہے۔ بصرہ۔ کوفہ۔ شام۔ حجاز۔ میں کوئی شخص اُن سے زیادہ عالم نہیں ہا۔

ابراہیم نخعی کے عہد میں مسائل فقہ کا ایک مختصر مجموعہ تیار ہو گیا تھا۔ جس کا ماخذ حدیث نبوی اور حضرت علی اور عبداللہ بن مسعود۔ کے فتاوے تھے۔ یہ مجموعہ گو مرتب طور پر قلمبند نہیں کیا گیا۔ لیکن اُن کے شاگردوں کو اُس کے مسائل زبانی یاد تھے۔ سب سے زیادہ یہ مجموعہ حماد کے پاس جمع تھا۔ جو ابراہیم کے تلامذہ میں نہایت ممتاز تھے۔ چنانچہ اُن کے مرنے کے بعد فقہ۔ کی مسند خلافت بھی انہیں کو ملی۔ حماد نے گو فقہ۔ کو چنداں ترقی نہیں دی۔ لیکن وہ ابراہیم کے مجموعہ فقہ کے بہت بڑے حافظ تھے۔ حماد نے سنہ ۱۲۰ ہجری میں قضا کی اور لوگوں نے اُن کی جگہ امام ابو حنیفہ۔ کو فقہ کی مسند پر بٹھایا۔

امام صاحب کے زمانہ تک اگرچہ فقہ کے متعدد مسائل مدون ہو چکے تھے۔ لیکن اولاً تو یہ تدوین صرف زبانی روایت تھی۔ دوسرے جو کچھ تھا فن کی حیثیت سے نہ تھا۔ استنباط و استدلال کے قواعد قرار پائے تھے نہ احکام کی تفریع کے اصول منضبط ہوئے تھے نہ حدیثوں میں اختیار مراتب تھا اور شبہ النظیر کے قاعدے مقرر تھے۔ مختصر یہ کہ فقہ۔ جزئیات مسائل کا نام تھا اور اسکو قانون کے رتبہ تک پہنچانے کے لیے بہت زینے باقی تھے۔ تاریخ سے اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ امام ابو حنیفہ کو خاص کس وجہ سے فقہ کی تدوین کا خیال پیدا ہوا۔ قلائد عقود العقیان۔ کے مصنف نے کتاب الموذج القتال سے اس کا ایک قصہ نقل کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "دو شخص حمام میں نہانے گئے اور حمامی کے پاس کچھ امانت رکھتے گئے۔ ایک اُن میں سے نہا کر نکلا اور حمامی سے امانت طلب کی۔ اُس نے دیدی۔

یہ کہکر چلتا ہوا - دوسرا حمام سے باہر آیا - اور امانت مانگی تو اُس نے عذر کیا کہ میں نے تمہارے شریک کو حوالہ کر دی - اس نے عدالت میں استغاثہ کیا - قاضی صاحب نے حمامی کو ملزم ٹھہرایا - کہ جب دونوں نے ملکر تیرے پاس امانت رکھی تھی - تو تجھ کو ضرور تھا - کہ دونوں کی موجودگی میں واپس کرتا - حمامی گھبرایا ہوا امام ابوحنیفہ کے پاس آیا - امام صاحب نے کہا کہ تم جاکر اُس شخص سے کہو کہ میں تمہاری امانت ادا کرنے کے لئے تیار ہوں - لیکن قاعدہ کے موافق تنہا تمکو نہیں دے سکتا - شریک کو لاؤ تو لیجاؤ - اس واقعہ کے بعد امام صاحب کو فقہ کی تدوین کا خیال پیدا ہوا - اور اُس کی ترتیب شروع کی -

ممکن ہے کہ یہ واقعہ صحیح ہو لیکن اس خیال کے پیدا ہونے کے اصلی اسباب اور تھے یہ امر تاریخوں سے ثابت ہے کہ امام صاحب کو تدوین فقہ کا خیال تقریباً سنہ ۱۲۰ھ میں پیدا ہوا یعنے جب اُن کے اُستاد حماد - نے وفات کی - یہ وہ زمانہ ہے کہ اسلام کا تمدن نہایت وسعت پکڑ گیا تھا - عبادات اور معاملات کے متعلق اس کثرت سے واقعات پیدا ہو گئے تھے اور ہوتے جاتے تھے کہ ایک مرتب مجموعۂ قانون کے بغیر کسی طرح کام نہیں چل سکتا تھا نیز سلطنت کی وسعت اور دوسری قوموں کے میل جول سے تعلیم و تعلم نے اسقدر وسعت حاصل کر لی تھی کہ زبانی سند و روایت - اُسکا تحمل نہیں کر سکتی تھی - ایسے وقت یہ قدرتی طور پر - لوگوں کے دل میں خیال آیا ہوگا کہ ان جزئیات کو اصول کے ساتھ ترتیب دیکر ایک فن بنا دیا جائے -

امام ابوحنیفہ کی طبیعت مجتہدانہ اور غیر معمولی طور پر متفننانہ واقع ہوئی تھی - اسکے ساتھ تجارت کی وسعت اور ملکی تعلقات نے اُن کو معاملات کی ضرورتوں سے خبردار کر دیا تھا - اطراف و بلاد سے ہر روز جو سیکڑوں ضروری استفتا آتے تھے - اُن سے اُن کو اندازہ ہوتا تھا کہ ملک کو اس فن کی کسقدر حاجت ہے قضاۃ اور حکام - فصل قضایا میں جو غلطیاں کرتے تھے - وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے - غرض یہ اسباب اور وجوہ تھے - جنھوں نے اُن کو اس فن کی تدوین و ترتیب پر آمادہ کیا - ممکن ہے کہ کسی خاص واقعہ سے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اس آمادگی کو اور تحریک ہوئی - جسکے ساتھ عملی کوشش کا ظہور ہوا -

امام صاحب نے جس طریقہ سے فقہ کی تدوین کا ارادہ کیا وہ نہایت وسیع اور پُر خطر کام تھا - اس لئے انھوں نے اتنے بڑے کام کو اپنی ذاتی رائے اور معلومات پر منحصر کرنا نہیں چاہا - اس غرض سے انھوں نے اپنے شاگردوں میں سے چند نامور شخص - انتخاب کئے جنمیں سے اکثر خاص خاص - فنون میں جو تکمیل فقہ کیلئے ضروری تھے اسقدر زمانہ تسلیم

گئے جاتے تھے۔ مثلاً یحیٰی بن ابی زایدہ۔ حفص بن غیاث۔ قاضی ابویوسف۔ داؤد الطائی حبان۔ مندل حدیث و آثار میں نہایت کمال رکھتے تھے۔ امام زفر۔ قوت استنباط میں مشہور تھے۔ قاسم بن معن اور امام محمد۔ کو ادب اور عربیت میں کمال تھا۔ امام صاحب نے ان لوگوں کی شرکت سے ایک مجلس مرتب کی۔ اور باقاعدہ طور سے فقہ کی تدوین شروع ہوئی۔ امام طحاوی نے بسندِ متصل اسد بن فرات۔ سے روایت کی ہے کہ "ابوحنیفہ۔ کے تلامذہ جنہوں نے فقہ کی تدوین کی چالیس تھے۔ جنمیں یہ لوگ زیادہ ممتاز تھے۔ ابویوسف۔ زفر۔ داؤد الطائی۔ اسد بن عمر۔ یوسف بن خالد التیمی۔ یحیٰی بن ابی زایدۃ"۔ امام طحاوی نے یہ بھی روایت کی ہے کہ لکھنے کی خدمت یحیٰی۔ سے متعلق تھی۔ اور وہ تیس برس تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس کلام میں کم وبیش تیس برس کا زمانہ صرف ہوا۔ یعنی سنہ ۱۲۱ سے سنہ ۱۵۰ ہجری تک جو امام ابوحنیفہ کی وفات کا سال ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ کہ یحیٰی شروع سے اس کام میں شریک تھے۔ یحیٰی سنہ ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے وہ شروع سے کیونکر شریک ہو سکتے تھے۔ طحاوی۔ نے جن لوگوں کے نام گنئے ہیں۔ اُن کے سوا عافیہ ازدی۔ ابو علی غزی۔ علی مسہر۔ قاسم بن معن حبان۔ مندل۔ بھی اس مجلس کے ممبر رہے تھے۔

تدوین کا طریقہ یہ تھا کہ کسی خاص باب کا کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا تھا۔ اگر اُسکے جواب میں سب لوگ متفق الرائے ہوتے تو اُسوقت قلمبند کر لیا جاتا۔ ورنہ نہایت آزادی سے بحثیں شروع ہوتیں۔ کبھی کبھی بہت دیر تک بحث قائم رہتی۔ امام صاحب غور اور تحمل کے ساتھ سب کی تقریریں سُنتے اور بالآخر ایسا جچا تُلا فیصلہ کرتے کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ امام صاحب۔ کے فیصلہ کے بعد بھی لوگ اپنی اپنی رایوں پر قائم رہتے۔ اُسوقت وہ سب مختلف اقوال قلمبند کر لئے جاتے۔ اس کا التزام تھا۔ کہ جب تک تمام شرکائے جلسہ جمع نہ ہولیں کسی مسئلہ کو طے نہ کیا جائے۔

جواہر مضیئہ کے مصنف۔ نے عافیہ بن یزید۔ کے تذکرہ میں اسحٰق۔ سے روایت کی ہے کہ ابوحنیفہ کے اصحاب کسی مسئلہ میں بحث کرتے تھے۔ اور عافیہ۔ موجود نہ ہوتے۔ تو امام صاحب فرماتے۔ کہ عافیہ کو آلینے دو۔ جب وہ آلیتے اور اتفاق کرتے۔ تب وہ مسئلہ درج تحریر کیا جاتا۔ اس طرح تیس برس کی مدت میں یہ عظیم الشان کام انجام کو پہنچا۔ امام صاحب کی اخیر عمر قید خانہ میں گذری وہاں بھی یہ کام برابر جاری رہا۔

اس مجموعہ کی ترتیب جیسا کہ۔ حافظ ابو المحاسن۔ نے بیان کی ہے یہ تھی اول باب الطہارۃ

باب الصلوۃ ۔ باب الصوم ۔ پھر عبادات ۔ کے اور ابواب ۔ اسکے بعد ۔ معاملات ۔ سب سے اخیر میں باب المیراث ۔

امام صاحب کی زندگی ہی میں اس مجموعہ نے وہ حسن قبول حاصل کیا ۔ کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے مشکل سے قیاس میں آسکتا ہے ۔ جسقدر اُسکے اجزا تیار ہوتے جاتے تھے ۔ ساتھ ہی ساتھ ۔ تمام ملک میں اُسکی اشاعت ہوتی جاتی تھی ۔ امام صاحب کا درسگاہ ایک قانونی مدرسہ تھا ۔ جسکے طلبا نہایت ۔ کثرت سے ملکی عہدوں پر مامور ہوئے ۔ اور اُن کی آئین حکومت کا یہی مجموعہ تھا ۔ تعجب یہ ہے کہ جن لوگوں کو امام صاحب سے ہمسری کا دعوے تھا وہ بھی اس کتاب سے بے نیاز نہ تھے ۔ امام سفیان ثوری ۔ نے بڑے لطائف الحیل سے کتاب الرہن ۔ کی نقل حاصل کی اور اُسکو اکثر پیش نظر رکھتے تھے ۔ زایدہ کا بیان ہے ۔ کہ میں نے ایک دن سفیان کے سرہانے ایک کتاب دیکھی جسکا وہ مطالعہ کر رہے تھے ۔ اُن سے اجازت مانگ کر میں اُسکو دیکھنے لگا تو ۔ ابوحنیفہ کی کتاب الرہن ۔ نکلی ۔ میں نے تعجب سے پوچھا کہ " آپ ابوحنیفہ ۔ کی کتابیں دیکھتے ہیں " ۔ بولے " کاش ۔ اُن کی سب کتابیں میرے پاس ہوتیں "[1] ۔

یہ بھی کچھ کم تعجب کی بات نہیں ۔ کہ باوجودیکہ اُسوقت بڑے بڑے مدعیان فن موجود تھے اور اُنمیں بعض امام ابوحنیفہ ۔ سے مخالفت بھی رکھتے تھے ۔ تاہم کسی کو اس کتاب کی رد وقدح کی جرأت نہیں ہوئی ۔ امام رازی ۔ مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں " ان اصحاب الرای اظھروا مذاھبھم وکانت الدنیا مملوۃ من المحدثین ورواۃ الاخبار فلم یقدر احد منھم الطعن فی اقاویل اصحاب الرای یعنے اصحاب الرائے (ابوحنیفہ اور اُن کے تلامذہ) نے اپنے مسائل جس زمانہ میں ظاہر کیئے ۔ دنیا محدثین اور راویان اخبار سے بھری ہوئی تھی ۔ تاہم کسی کو یہ قدرت نہ ہوئی ۔ کہ اُنکے اقوال پر اعتراض کرتا " امام رازی نے تو عام نفی کی ہے ۔ لیکن ہمکو زیادہ استقصاء سے معلوم ہوا کہ اس کہ اس عموم میں ایک استثنا ہے ۔ کیونکہ بیہقی نے تصریح کی ہے کہ امام اوزاعی نے ابوحنیفہ ۔ کی کتاب السیر ۔ کا رد لکھا تھا ۔ جسکا جواب قاضی ابویوسف نے لکھا ۔

غالباً یہ مجموعہ بہت بڑا مجموعہ تھا اور ہزاروں مسائل پر مشتمل تھا ۔ قلائد عقود العقیان کے مصنف نے کتاب الصیانتہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ " امام ابوحنیفہ نے جسقدر مسائل مدون کیئے اُنکی تعداد بارہ لاکھ نوے ہزار سے کچھ زیادہ ہے " شمس الایمہ کردری نے لکھا

---

[1] عقود الجمان باب العاشر ۱۲

ہے کہ" یہ مسائل چھ لاکھ تھے"۔ یہ خاص تعداد شاید صحیح نہ ہو۔ لیکن کچھ شبہ نہیں۔ کہ ان کی تعداد لاکھوں سے کم نہ تھی۔ امام محمدؒ کی جو کتابیں آج ہیں اُن سے اسکی تصدیق ہوسکتی ہے۔

اگرچہ اسمیں کسی طرح شبہہ نہیں ہوسکتا کہ امام ابوحنیفہ کی زندگی ہی میں۔ فقہ کے تمام ابواب مرتب ہوگئے تھے۔ رجال و تاریخ کی کتابوں میں اسکا ثبوت ملتا ہے۔ جسکا انکار گویا تواتر کا انکار ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ مجموعہ ایک مدت سے ضائع ہوگیا ہے۔ اور دنیا کے کسی کتب خانہ میں اُسکا پتہ نہیں چلتا۔ امام رازی۔ مناقب الشافعی۔ میں لکھتے ہیں۔ کہ "ابوحنیفہ۔ کی کوئی تصنیف باقی نہیں رہی"۔ امام رازیؒ نے ۶۰۶ھ میں انتقال کیا۔ اس لحاظ سے کم از کم چھ سو برس ہوئے۔ کہ امام صاحب کی تصنیفات ناپید ہوچکیں۔ امام صاحب کی تصنیفات کا ضائع ہوجانا اگرچہ کچھ محل تعجب نہیں۔ اُس عہد کی ہزاروں کتابوں میں سے آج ایک کا بھی وجود نہیں۔ امام اوزاعی۔ ابن جریج۔ ابن عروبہ۔ حماد بن ابی معمر۔ ان کی تالیفات عین اُسی زمانہ میں شائع ہوئیں۔ جب امام ابوحنیفہ۔ کا دفتر فقہ مرتب ہورہا تھا تاہم ان کتابوں کا نام بھی کوئی نہیں جانتا۔ لیکن **امام ابوحنیفہ**۔ کی تصنیفات کی گمشدگی کی ایک خاص وجہ ہے۔ امام صاحب کا مجموعہ فقہ اگرچہ بجائے خود مرتب اور خوش اسلوب تھا۔ لیکن قاضی ابویوسف۔ و امام محمدؒ۔ نے اُنہیں مسائل کو اس توضیح و تفصیل سے لکھا۔ اور ہر مسئلہ پہ استدلال و براہان کے ایسے حاشیئے اضافہ کئے۔ کہ اُنہیں کو رواج عام ہوگیا اور اصل ماخذ سے لوگ بے پرواہو گئے۔ ٹھیک اسیطرح جسطرح کہ متاخرین نحویوں کی تصنیفات کے بعد۔ فراء کسائی۔ خلیل۔ اخفش۔ ابوعبیدہ۔ کی کتابیں دنیا سے بالکل ناپید ہوگئیں۔ حالانکہ یہ لوگ فن نحو کے بانی اور مدونِ اوّل تھے۔

امام صاحب کے مسائل کا آج جو ذخیرہ دنیا میں موجود ہے۔ وہ امام محمدؒ۔ اور قاضی ابویوسف کی تالیفات ہیں جنکے نام اور مختصر حالات ان بزرگوں کے ترجمہ میں ہم لکھیں گے یہ فقہ اگرچہ عام طور سے فقہ حنفی کہلاتی ہے۔ لیکن درحقیقت وہ چار شخصوں۔ یعنی امام ابوحنیفہ۔ زفر۔ قاضی ابویوسف۔ امام محمد کی رائیوں کا مجموعہ ہے۔ قاضی ابویوسف و امام محمد نے بہت سے مسائل میں۔ امام ابوحنیفہ کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ فقہاء حنفیہ نے روایتیں نقل کی ہیں کہ ان صاحبوں کو اعتراف تھا کہ "ہم نے جو اقوال۔ امام ابوحنیفہ کے مخالف کہے وہ بھی امام ابوحنیفہ ہی کے اقوال ہیں۔ کیونکہ بعض مسئلوں میں امام ابوحنیفہ نے متعدد اور مختلف رائیں ظاہر کی تھیں"۔ یہ روایتیں۔ شامی۔ وغیرہ میں مذکور ہیں لیکن

اُنکا ثابت ہونا مشکل ہے - ہمارے نزدیک یہ اُن فقہا کا حسن ظن ہے - قاضی ابو یوسف و امام محمد اجتہاد مطلق کا منصب رکھتے تھے - اور اُن کو اختلاف کا پورا حق حاصل تھا - اسلام کی ترقیاں اُسیوقت تک رہیں کہ لوگ باوجود حسن عقیدت کے بزرگوں اور اُستادوں کی رائے سے علانیہ مخالفت کرتے تھے - اور خیالات کی ترقی محدود نہ تھی -

یہ مسائل جو فقہ حنفی کے نام سے موسوم ہیں نہایت تیزی سے تمام ملک میں پھیل گئے - عرب میں تو اُن کے مسائل کو چنداں رواج نہ ہُوا - کیونکہ مدینہ - میں امام مالک - اور مکہ - میں اَور ایمہ اُن کے حریف مقابل موجود تھے - لیکن **عرب** - کے سوا تمام ممالک اسلامی میں جن کی وسعت سندہ سے ایشیاے کوچک تک تھی عموماً اُنہیں کا طریقہ جاری ہوگیا - ہندوستان سندھ کابل بخارا - وغیرہ میں تو اُن کے اجتہاد کے سوا کسی کا اجتہاد تسلیم ہی نہیں کیا جاتا - دوسرے ممالک میں گو - شافعی - وحنبلی فقہ کا رواج ہُوا لیکن فقہ حنفی - کو دبا نہیں سکا البتہ بعض ملکوں میں وہ بالکل معدوم ہوگیا - اور اُس کے خاص اسباب تھے - مثلاً افریقہ میں ۴۰۵ھ تک امام ابو حنیفہ کا طریقہ - تمام اور طریقوں پر غالب تھا - لیکن معز بن بادیس - نے ۴۰۷ھ میں جب وہاں کی مستقل حکومت حاصل کی - تو حکومت کے زور سے تمام ملک میں مالکی فقہ کو رواج دیدیا کہ آج تک قائم ہے[51] -

ایک خاص بات یہ ہے کہ عنان حکومت جن لوگوں کے ہاتھوں میں رہی وہ اکثر حنفی ہی فقہ کے پابند تھے - خلفاے عباسیہ - تو اس بحث سے خارج ہیں - کیونکہ یہ خاندان جب تک اوج پر رہا - یہ لوگ تلوار کے ساتھ قلم کے بھی مالک رہے - یعنی اُن کو خود دعوے اجتہاد تھا - اور کبھی کسی کی تقلید نہیں کی - تنزل کے بعد وہ اس قابل ہی نہیں رہے - کہ اُن کے حالات سے کسی ملکی اثر کا اندازہ کیا جائے - تاہم اُن میں اگر کسی نے تقلید گوارا کی تو ابو حنیفہ - ہی کی کی - عبد اللہ بن المعتز جو فن بدیع - کا موجد تھا اور خلفاے عباسیہ - میں سب سے بڑا شاعر اور ادیب تھا - حنفی المذہب تھا[52] -

عباسیہ کے تنزل کے ساتھ جن خاندان کو عروج ہُوا - اکثر حنفی تھے - خاندان سلجوق جس نے ایک وسیع مدت تک حکومت کی اور جنکے دایرہ حکومت کی وسعت دی - طول میں کاشغر سے بیت المقدس تک اور عرض میں قسطنطنیہ سے بلاد خزر تک پہنچی تھی - حنفی تھا محمود غزنوی - جسکے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے - فقہ حنفی - کا بہت بڑا عالم تھا فن فقہ میں اُسکی ایک نہایت عمدہ تصنیف موجود ہے جسکا نام - التفرید ہے اور جسمیں کم و

---

(۵۱) تاریخ ابن خلکان ترجمہ معز بن بادیس - ۱۲

(۵۲)

بیش ساٹھ ہزار مسئلے ہیں۔ **نور الدین زنگی**۔ کا نام چھپا ہُوا نہیں ہے۔ وہ ہمارے ہیرو ز میں داخل ہے بیت المقدس کی لڑائیوں میں اوّل اُسی نے نام حاصل کیا۔ صلاح الدین۔ فاتح بیت المقدس۔ اُسی کے دربار کا ملازم تھا۔ دنیا میں پہلا دار الحدیث اُسی نے قائم کیا۔ اگرچہ وہ شافعی۔ ومالکی۔ فقہ۔ کی بھی عزت کرتا تھا۔ لیکن وہ خود اور اُس کا تمام خاندان مذہباً حنفی تھا[51]۔ صلاح الدین۔ خود شافعی تھا۔ لیکن اُسکے خاندان میں بھی حنفی المذہب موجود تھے۔ الملک المعظم عیسےٰ بن الملک العادل جو ایک وسیع ملک کا بادشاہ تھا۔ علامہ ابن خلکان اُس کے حالات میں لکھتے ہیں۔ کہ "وہ نہایت عالی ہمت۔ فاضل۔ ہوشمند۔ دلیر۔ پُر رعب تھا اور حنفی مذہب میں غلو رکھتا تھا۔ چراکہ مصر جو نویں صدی کے آغاز میں مصر کی حکومت پر پہنچے۔ اور ۱۴۸ برس تک فرمانروا رہے اور بہت سی فتوحات حاصل کیں۔ خود حنفی تھے اور اُن کے دربار میں اسی مذہب کو زیادہ فروغ تھا۔ سلاطین ترک جو کم وبیش چھ سو برس سے روم کے فرمانروا ہیں۔ اور آج اُنہیں کی سلطنت۔ اسلام کی عزت و وقار کی اُمیدگاہ ہے عموماً حنفی تھے۔ خود ہمارے ہندوستان کے فرمانروا خوانین اور آلِ تیمور اسی مذہب کے پابند رہے اور اُن کی وسیع سلطنت میں اس طریقہ کے سوا اور کسی طریقہ کو رواج نہ ہوسکا۔

بعضوں کا خیال ہے کہ حنفی مذہب کو جو قبول عام حاصل ہُوا وہ حکومت کے صدقہ سے ہُوا۔ ابن حزم۔ جو ارباب ظاہر کے مشہور امام ہیں۔ اُن کا قول ہے کہ "دو مذہبوں نے سلطنت کے زور سے ابتدا ہی میں رواج عام حاصل کیا۔ ایک ابوحنیفہ کا مذہب کیونکہ جب قاضی ابویوسف کو قاضی القضاۃ۔ کا منصب ملا تو انہوں نے حنفی لوگوں کو عہدہ قضا پر مقرر کیا دوسرا امام مالک کا مذہب اندلس۔ میں۔ کیونکہ امام مالک کے شاگرد یحییٰ مصمودی۔ خلیفہ اندلس کے نہایت مقرب تھے اور کوئی شخص بے اُن کے مشورہ کے عہدۂ قضا پر مقرر نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ صرف اپنے ہم مذہبوں کو مقرر کراتے تھے[52]۔

لیکن یہ ابن حزم کی ظاہر بینی ہے۔ امام ابوحنیفہ۔ سنہ ۱۲۰ھ میں مسند اجتہاد پر بیٹھے۔ قاضی ابویوسف۔ نے سنہ ۱۷۰ھ کے بعد قاضی القضاۃ۔ کا منصب حاصل کیا۔ کیونکہ اُن کے تقرر اور عروج کا زمانہ ہارون الرشید کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ جو سنہ ۱۷۰ھ میں تخت نشین ہُوا تھا۔ قاضی ابویوسف کے فروغ سے پہلے پچاس برس کا زمانہ گزر چکا تھا جسمیں امام ابوحنیفہ کے مذہب نے قبول عام حاصل کر لیا تھا۔ اور اُنکے سیکڑوں شاگرد قضا کے عہدوں پر ممتاز

٥١ الجواہر المضیئہ ترجمہ نور الدین زنگی ۱۲۔

٥٢ ابن حزم کے اس قول کو علامہ ابن خلکان نے یحییٰ مصمودی کے ترجمہ میں نقل کیا ہے ۱۲

ہو چکے تھے۔ اس کامیابی کو کسکی طرف منسوب کیا جائے؟ یہ ضرور ہے کہ قاضی ابو یوسف کی وجہ سے امام صاحب کے مسائل کو اور زیادہ عروج ہوا۔ لیکن مذہب حنفی کا اصلی عروج قاضی صاحب کی کوششوں کا محتاج نہ تھا۔ امام رازی نے باوجود مخالفت کے تسلیم کیا ہے۔ کہ ثم انہ لما قوی مذهب اصحاب الرای واشتهر واعظم وقعته فی القلوب ثم اتفق اتصال ابی یوسف ومحمد بخدمة هرون الرشید عظمت تلک القوة جدا لان العلم والسلطنة حصلا معا "یعنی" اصحاب الرائے کا مذہب قوی ہوگیا ہے۔ اور شہرت پکڑ گیا اور اسکی وقعت دلوں میں بہت ہوگئی پھر اسکے بعد ابو یوسف و محمد کو ہارون الرشید کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔ تو یہ قوت بہت ہی زیادہ بڑھ گئی۔ کیونکہ علم اور حکومت دونوں مجتمع ہو گئے"۔

اسکے علاوہ قاضی ابو یوسف کا اثر ہارون الرشید کے زمانہ تک محدود تھا۔ دیرپا اور غیر منقطع کامیابی کس نے پیدا کی؟ یوں تو بعض اور ائمہ نے بھی اپنے عہد میں نہایت عروج حاصل کیا تھا۔ امام اوزاعی اپنی زندگی میں بلکہ زمانہ مابعد تک بھی تمام شام کے امام مطلق تسلیم کئے گئے اور ان ممالک میں لوگ عموماً انہیں کی تقلید کرتے تھے۔ لیکن وہ ایک محدود اثر تھا جو بہت جلد جاتا رہا۔ ان واقعات سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے مذہب میں ایسی خاص خوبیاں ہیں جو اور مذہبوں میں نہیں۔

تمام ممالک اسلامی میں جن ائمہ کی فقہوں نے رواج پایا وہ صرف چار ہیں۔ ابو حنیفہ۔ مالک۔ شافعی۔ احمد حنبل۔ مسائل فقہ کی ترویج و اشاعت کا سبب۔ اگرچہ خود ان مسائل کی خوبی و عمدگی ہے۔ لیکن کچھ شبہ نہیں کہ اس امر میں واضع فقہ کی ذاتی رسوخ۔ اور عظمت کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ ہمارے نزدیک۔ امام ابو حنیفہ کے سوا۔ اور مجتہدین فقہ کی ترویج و اشاعت کا باعث زیادہ تر انکی ذاتی خصوصیتیں تھیں۔ مثلاً امام مالک۔ مدینہ کے رہنے والے تھے جو نبوت کا مرکز اور خلفائے راشدین کا دار الخلافہ رہ چکا تھا۔ اس تعلق سے لوگوں کو عموماً مدینہ اور ارباب مدینہ کے ساتھ خلوص و عقیدت تھی۔ انکا خاندان ایک علمی خاندان تھا۔ ان کے دادا۔ مالک بن ابی عامر۔ نے بڑے بڑے صحابہ سے حدیثیں سیکھی تھیں۔ انکے چچا شیخ الحدیث تھے۔ امام مالک نے جب حدیث و فقہ میں کمال پیدا کیا تو یہ عارضی اوصاف ان کی ذاتی قابلیت پر طرہ بنکر نمایاں ہوئے۔ اور تمام اطراف و دیار میں ان کی شہرت کا سکہ جم گیا۔ امام شافعی کو اور بھی زیادہ خصوصیتیں حاصل تھیں۔ مکہ معظمہ وطن تھا۔ باپ کی طرف سے قریشی اور مطلبی اور ماں کیطرف سے ہاشمی تھے۔ انکا تمام خاندان ہمیشہ سے معزز و ممتاز چلا آتا تھا۔ ان کے پردادا سائب۔ جنگ بدر میں ہاشمیوں کے علم بردار تھے اور

گرفتار ہوکر اسلام لائے تھے۔ مکّہ معظمہ کی ولادت۔ خاندان کا اعزاز۔ رسول اللہ کے ہم نسبی۔ ایسی چیزیں تھیں جن سے بڑھکر حسن قبول اور مرجعیت کے لئے کوئی کارگر آلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ امام ابوحنیفہ میں اس قسم کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ قریشی اور ہاشمی ہونا تو ایک طرف وہ عربی النسل بھی نہ تھے۔ خاندان میں کوئی شخص ایسا نہیں گزرا تھا۔ جو اسلامی گروہ کا مرجع اور مقتدا ہوتا۔ آبائی پیشہ تجارت تھا۔ اور خود بھی تمام عمر اسی ذریعہ سے زندگی بسر کی۔ کوفہ جو اُن کا مقام ولادت تھا گو دار العلم تھا۔ لیکن مکہ معظمہ۔ اور مدینہ منورہ۔ کا ہمسر کیونکر ہو سکتا تھا۔ بعض اتفاقی، ورنا گزیر اسباب سے ارباب روایت کا ایک گروہ اُن کی مخالفت پر کمر بستہ تھا۔ غرض حسن قبول اور عام اثر کے لئے جو اسباب درکار ہیں وہ بالکل نہ تھے باوجود اُسکے اُنکی فقہ کا تمام ممالک اسلامیہ میں اس وسعت اور ترقی کے ساتھ رواج پانا یقیناً اس بات کی دلیل ہے کہ اُن کا طریقۂ فقہ انسانی ضرورتوں کے نہایت مناسب اور موزوں واقع ہوا تھا۔ اور بالخصوص تمدن کے ساتھ جسقدر اُنکی فقہ کو مناسبت تھی کسی کی فقہ کو نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اور ائمہ کے مذہب کو زیادہ تر اُنہیں ملکوں میں رواج ہوا جہاں تہذیب و تمدن نے زیادہ ترقی نہیں کی تھی۔ علامہ ابن خلدون۔ اس بات کی وجہ بتاتے ہیں کہ مغرب و اندلس میں بدویت غالب تھی۔ اور وہاں کے لوگوں نے وہ ترقی نہیں حاصل کی تھی جو اہل عراق نے کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں امام مالک۔ کی فقہ کے سوا اور کسی فقہ کو فروغ نہ ہو سکا"۔

حنفی فقہ جسمیں امام ابوحنیفہ کے علاوہ اُن کے نامور شاگردوں کے مسائل بھی شامل ہیں۔ اُس زمانہ کا بہت بڑا قانون بلکہ بہت بڑا مجموعہ قوانین تھا۔ زمانہ مابعد میں۔ گو علمائے حنفیہ نے اُسپر بہت کچھ اضافہ کیا۔ اور جزئیات کی تفریع کے ساتھ اصول فن کو نہایت ترقی دی۔ لیکن ایجاد کے زمانہ میں جسقدر کسی فن کی حالت ہو سکتی ہے۔ وہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی جو امام ابوحنیفہ کے عہد میں فقہ کو حاصل ہو چکی تھی۔ اس مجموعہ میں عبادات کے علاوہ دیوانی فوجداری۔ تعزیرات۔ لگان۔ مالگزاری۔ شہادت۔ معاہدہ۔ وراثت۔ وصیت۔ اور بہت سے قوانین شامل تھے۔ اُسکی وسعت اور خوبی کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے۔ کہ ہارون الرشید اعظم کی وسیع سلطنت جو سندھ سے ایشیائے کوچک تک پھیلی ہوئی تھی۔ انہیں اصول پر قائم تھی۔ اور اُس عہد کے تمام واقعات و معاملات انہیں قواعد کی بنا پر فیصل ہوتے تھے۔

یہ قانون جسکو فقہ۔ کہتے ہیں دو قسم کے مسائل پر مشتمل ہے اور اس لحاظ سے اُسکے

واضع کی دو مختلف حیثیتیں ہیں۔

(۱) وہ مسائل جو شریعت سے ماخوذ ہیں۔ اور تشریعی احکام کہے جا سکتے ہیں۔

(۲) وہ احکام جن سے شریعت نے سکوت کیا ہے اور جو تمدن اور معاشرت کی ضرورتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ یا جنکا ذکر شریعت میں ہے۔ لیکن تشریعی طور پر نہیں۔

پہلی قسم کے مسائل کے لحاظ سے فقیہ کی حیثیت۔ شارح اور مفسر کی حیثیت ہے اور اس اعتبار سے اُسکے لئے جس قسم کی قابلیت درکار ہے وہ مہارت زبان۔ واقفیت نصوص قوت استنباط توفیق متعارضات۔ ترجیح دلائل ہے۔ دوسری قسم کے احکام کے لحاظ سے واضع فقہ ایک مقنن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس لحاظ سے اُس کی قابلیت اُس رتبہ کی ہونی چاہئے۔ جیسی کہ دنیا کے اور مشہور مقننوں کی تھی۔ یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ اسلام میں بہت سے نامور گزرے ہیں۔ جو قرآن و حدیث کے عمدہ مفسر یا شارح تھے۔ لیکن مقننانہ قابلیت سے معرا تھے۔ اسی طرح ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو مقنن اور واضع قانون تھے۔ لیکن نصوص شرعی کے مفسر نہیں کہے جا سکتے تھے۔ جہانتک ہماری واقفیت ہے اسلام کے اس وسیع دور میں قدرت نے یہ دونوں قابلیتیں جس اعلےٰ درجہ پر امام ابوحنیفہ میں جمع کر دی تھیں۔ کسی مجتہد یا امام۔ میں مجتمع نہیں ہوئیں۔

علم فقہ کے متعلق سب سے بڑا کام جو امام صاحب نے کیا وہ تشریعی اور غیر تشریعی احکام میں امتیاز قائم کرنا تھا۔

شارع علیہ السّلام کے اقوال و افعال جو سلسلۂ روایت سے منضبط کئے گئے۔ اُن میں بہت سے ایسے امور تھے۔ جنکو منصب رسالت سے کچھ تعلق نہ تھا۔ لیکن بطور ایک اصطلاح کے اُن سب پر حدیث کا لفظ اطلاق کیا جاتا تھا۔ فقہ کی توضیع میں ایک عام اور سخت غلطی یہ ہوئی کہ لوگوں نے ان تمام امور کو شرعی حیثیت پر محمول کیا اور اس خیال سے اُن پر مسائل اور احکام کی بنیاد قائم کی۔ حالانکہ وہ حدیثیں منصب شریعت سے علاقہ نہیں رکھتی تھیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں[1]۔ کہ آنحضرت سے جو کچھ روایت کیا گیا ہے۔ اور کتب حدیث میں اُسکی تدوین ہوئی اُسکی دو قسمیں ہیں۔

(۱) جو تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتا ہے اور اسی بارہ میں یہ آیت اُتری ہے۔ مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا یعنی پیغمبر جو چیز تم کو دے اُس کو اختیار کرو اور جس چیز سے روکے اُس سے باز آؤ۔

[1] حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ بریلی صفحہ ۱۳۳ و ۱۳۴-۱۲

(۲) جو تبلیغ رسالت سے متعلق نہیں۔ چنانچہ اُن کی نسبت آنحضرت نے ارشاد فرمایا ہے۔ انما انا بشر اذا امرتکم بشی من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشی من رائی فانما انا بشر۔ یعنی "میں ایک آدمی ہوں جب میں کوئی مذہبی حکم دوں تو تم لوگ اُس کے پابند ہو اور جب میں اپنی رائے سے کسی بات کا حکم دوں تو میں صرف ایک آدمی ہوں"۔ اس دوسری قسم میں وہ حدیثیں ہیں جو آنحضرت نے طب کے متعلق ارشاد کیں۔ اور اسی قسم میں وہ افعال داخل ہیں۔ جو آنحضرت سے عادۃً صادر ہوئے نہ عبادۃً اور اتفاقاً واقع ہوئے۔ نہ قصداً اور اسی قسم میں وہ حدیثیں داخل ہیں جو آنحضرت نے اپنی قوم کے گمان کے موافق بیان کیں مثلاً ام زرع کی حدیث اور خرافہ کی حدیث۔ اور اسی قسم میں وہ امور داخل ہیں جو آنحضرت نے اُسوقت مصلحت جزئی کے موافق اختیار فرمائے اور وہ سب لوگوں پر واجب العمل نہیں ہیں۔ مثلاً فوجوں کی تیاری اور شعار کی تعیین۔ اسی بنا پر حضرت عمر نے فرمایا تھا۔ کہ اب رمل کرنے کی کیا ضرورت ہے جس قوم کے دکھانے کے لیے ہم رمل کرتے تھے اُن کو خدا نے ہلاک کر دیا"۔ اور آنحضرت کے بہت سے احکام اسی قسم میں داخل ہیں۔ مثلاً یہ حکم کہ جہاد میں جو شخص کسی کافر کو قتل کرے تو اُسکے ہتیار کا مالک بھی وہی ہو گا"

شاہ ولی اللہ صاحب نے حدیث کی قسموں میں جو دقیق فرق بیان کیا۔ یہ وہی نکتہ ہے جسکی طرف سب سے پہلے امام ابوحنیفہ کا ذہن منتقل ہوا۔ اسی بنا پر بہت سے مسائل۔ مثلاً۔ غسل جمعہ خروج النساء الی العیدین۔ نفاذ طلاق۔ تعین جزیہ۔ تشخیص خراج۔ تقسیم غنایم وغیرہ میں جو حدیثیں وارد ہیں اُن کو امام ابوحنیفہ نے دوسری قسم میں داخل کیا ہے۔ لیکن امام شافعی وغیرہ اِن حدیثوں کو بھی تشریعی حدیثیں سمجھتے ہیں۔

حنفی فقہ کو بمقابلہ اور فقہوں کے بہت بڑی خصوصیت جو حاصل ہے وہ یہی ہے۔ کہ اُسکے مسائل عموماً اسی قاعدہ پر مبنی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اُسمیں وہ وسعت اور آزادی پائی جاتی ہے جو اور ائمہ کے مسائل میں نہیں پائی جاتی۔ یہ قاعدہ اگرچہ نہایت صاف اور صریح ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اور ائمہ نے اُس پر لحاظ نہیں کیا۔ اور اگر خلفاء راشدین کی نظریں موجود نہ ہوتیں تو شاید امام ابوحنیفہ کو بھی اُسکے اختیار کرنے کی جرات نہ ہوتی۔ اگرچہ امام صاحب کے بعد بھی بعض ائمہ نے جنکو اُنکے مقابلہ میں اجتہاد کا دعوےٰ تھا۔ اس عمدہ اصول کی پیروی نہ کی اور اُسی غلط خیال پر قائم رہے۔ لیکن اسمیں کون شبہ کر سکتا ہے کہ امام صاحب کی رائے نہایت صحیح اور نہایت دقیقہ سنجی پر مبنی تھی۔

خلفائے راشدین سے بڑھکر کون احکام شریعت کا نکتہ شناس ہو سکتا ہے انہوں نے

کیا کیا ؟ حضرت عمر کے آغاز خلافت تک اُمہات اولاد یعنی وہ لونڈیاں جن سے اولاد ہو چکی ہو عموماً خریدی اور بیچی جاتی تھیں۔ حضرت عمر نے اس رواج کو بالکل روک دیا۔ آنحضرت نے تبوک کے سفر میں۔ غیر مذہب والوں پر جو جزیہ مقرر کیا وہ فی کس ایک دینار تھا حضرت عمر نے ایران میں ۴۸ و ۲۴ و ۱۲ کے حساب سے شرحیں مقرر کیں۔ آنحضرت۔ مال غنیمت جب تقسیم کرتے تھے تو اپنے عزیز و اقارب کا بھی حصہ لگاتے تھے۔ خلفائے راشدین میں سے کسی نے حتّے کہ حضرت علی نے بھی ہاشمیوں کو کبھی حصہ نہیں دیا۔ آنحضرت کے زمانہ میں بلکہ حضرت ابوبکر کے عہد تک تین طلاقیں ایک سمجھی جاتی تھیں۔ حضرت عمر نے اپنے زمانہ خلافت میں منادی کرادی کہ تین طلاق طلاق بائن سمجھی جائیگی آنحضرت کے عہد میں شراب پینے کی سزا میں کوئی خاص حد نہیں مقرر ہوئی تھی۔ حضرت ابوبکر نے اسکی حد چالیس دُرّے قرار دیئے۔ اور حضرت عمر نے بسبب اسکے کہ انکے زمانہ میں مے نوشی کا زیادہ رواج ہو چلا تھا چالیس سے اسّی دُرّے کردئے۔ یہ وہ واقعات ہیں جو حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ اور جن کے ثبوت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن کیا اسکا یہ مطلب ہے۔ کہ خلفائے راشدین کسی حکم آنحضرت کا تشریعی حکم سمجھکر اُسکی مخالفت کرتے تھے !! اگر (نعوذ باللہ) اگر ایسا کرتے تھے تو وہ خلفائے راشدین نہ تھے۔ بلکہ (عیاذاً باللہ) رسول اللہ کے حریف اور مقابل تھے !!!

حقیقت یہ ہے کہ صحابہ جو رات دن آنحضرت کیخدمت میں حاضر رہتے تھے۔ اور فیض صحبت کیوجسے شریعت کے ادا شناس ہو گئے تھے۔ انکو یہ تمیز کرنا نہایت آسان کام تھا کہ کون سے احکام تشریعی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور کون سے اُس حد میں داخل ہیں جنکی نسبت آنحضرت نے فرمایا تھا کہ انتم اعلم بامور دنیاکم۔ حضرت عائشہ نے آنحضرت کی وفات کے بعد ایک موقع پر کہا کہ " آج اگر رسول اللہ موجود ہوتے تو عورتوں کو مسجد میں جانیکی اجازت نہ دیتے یہ صریح اسبات کی شہادت ہے کہ حضرت عائشہ نے رسول اللہ کی اُس اجازت کو تشریعی اور لازمی حکم نہیں قرار دیا اور نہ زمانہ اور حالات کے اختلاف سے اُسپر کیا اثر پڑسکتا تھا۔ امام ابوحنیفہ نے اس معاملہ میں صحابہ ہی کو دلیل راہ بنایا۔ اور اس قسم کے مسائل میں اُن کی رائے عموماً خلفائے راشدین کے طرز عمل کے موافق ہے۔ لیکن جن لوگوں کی نگاہ اُس نکتہ تک نہیں پہنچی۔ وہ امام ابوحنیفہ بلکہ صحابہ کو بھی مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ طلاق کے مسئلہ میں قاضی شوکانی نے حضرت عمر کا قول نقل کرکے لکھا ہے۔ کہ رسول اللہ کے مقابلہ میں بیچارے عمر کی کیا حقیقت ہے"۔ لیکن قاضی شوکانی یہ نہ سمجھے کہ حضرت عمر۔ قاضی صاحب

سے زیادہ اسباب کو سمجھتے تھے کہ رسول اللہ کے مقابلہ میں اُن کی کوئی حقیقت نہیں۔

فقہ کی پہلی قسم کے متعلق۔ امام ابوحنیفہ نے جو بڑا کام کیا۔ وہ قواعد استنباط کا انضباط تھا جسکی وجہ سے فقہ (جو ابتک جزئیات مسائل کا نام تھا) ایک مستقل فن بنگیا۔ امام ابوحنیفہ کی علمی تاریخ میں جو چیز سب سے زیادہ قابل قدر اور تعجب انگیز ہے۔ وہ ان قواعد کی تحدید اور انضباط ہے ایسے زمانہ میں جبکہ علوم نہایت ابتدائی حالت میں تھے یہاں تک کہ نقل وکتابت کا بھی رواج نہ تھا۔ ایسے دقیق فن کی بنیاد ڈالنی۔ درحقیقت امام ابوحنیفہ ہی کا کام تھا۔

عام خیال یہ ہے کہ یہ قواعد جنکو اب **اصول فقہ** سے تعبیر کیا جاتا ہے سب سے پہلے امام شافعی نے مرتب کئے یہ دعوے اس لحاظ سے تو صحیح ہے کہ امام شافعی سے پہلے یہ مسائل مستقل طور سے حیز تحریر میں نہیں آئے تھے۔ لیکن اصل فن کی بنیاد۔ امام شافعی سے بہت پہلے پڑ چکی تھی۔ اور اگر تحریر کی قید اٹھادی جائے تو امام ابوحنیفہ اُسکے موجد کہے جاسکتے ہیں اصل یہ ہے کہ مسائل کا استنباط اور احکام کی تفریع۔ تابعین بلکہ صحابہ ہی کے زمانہ میں شروع ہوچکی تھی۔ لیکن استنباط اور استخراج کا جو طریقہ تھا وہ کوئی علمی صورت نہیں رکھتا تھا۔ جسطرح عام لوگ کسی عبارت سے کسی نتیجہ کا استنباط یا کسی حکم کی تفریع صرف وجدانی مذاق کی رو سے کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اُنکا استنباط یا تفریع کس قاعدہ کلیہ کے تحت میں داخل ہے اور اسکے کیا شرائط اور قیود ہیں۔ اسی طرح فقہی مسائل بھی استنباط کئے جاتے تھے۔ نہ علمی اصطلاحیں قائم ہوئی تھیں نہ کچھ اصول منضبط ہوئے تھے۔

بنوامیہ کے اخیر دور میں کچھ کچھ علمی اصطلاحیں پیدا ہوئیں چنانچہ واصل بن عطار نے جو علم کلام کا موجد تھا احکام شرعیہ کی تقسیم کی اور کہا کہ "حق کے ثبوت کے چار طریقے ہیں قرآن ناطق۔ حدیث متفق علیہ۔ اجماع امت۔ عقل وحجت (یعنی قیاس)"۔ واصل نے اور بھی چند مسائل اور اصطلاحیں قائم کیں۔ مثلاً یہ کہ "عموم وخصوص دو جداگانہ مفہوم ہیں"۔ "نسخ۔ صرف اوامر ونواہی میں ہوسکتا ہے۔ اخبار وواقعات میں نسخ کا احتمال نہیں"[۱] ان مسائل کے لحاظ سے اصول فقہ میں اولیت کا فخر **واصل** کیطرف منسوب کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ اُسی قسم کی اولیت ہوگی۔ جسطرح نحو کے دو تین قاعدوں کے بیان کرنے سے کہا جاتا ہے کہ حضرت علی علیہ السّلام فن نحو کے موجد ہیں۔ بہرحال امام ابوحنیفہ کے زمانہ تک جو کچھ ہُوا تھا اس سے زیادہ نہیں ہُوا تھا۔ لیکن چونکہ امام صاحب نے فقہ کو مجتہدانہ اور مستقل فن کی حیثیت سے ترتیب دینا چاہا اس لئے استنباط اور استخراج مسائل کے اصول قرار دینے پڑے

---

[۱] ان مسائل کو ابوبلال عسکری نے کتاب الاوایل میں واصل بن عطار کی طرف منسوب [illegible]

اگرچہ زمانہ مابعد میں اصول فقہ ایک نہایت وسیع فن بنگیا - اور سیکڑوں مسائل ایسے ایجاد ہوگئے جنکا امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں اثر بھی نہ تھا - لیکن کچھ شبہ نہیں کہ اس فن کے مہمات مسائل جن پر فن کی بنیاد قائم ہے امام صاحب ہی کے زمانہ میں منضبط ہوچکے تھے - اصول اربعہ کی توضیح حدیث کے مراتب اور اُنکے احکام - جرح و تعدیل کے اصول - اجماع کے حدود و ضوابط - قیاس کے اقسام و شرائط - احکام کی انواع - عموم و خصوص کی تحدید - رفع تعارض کے قواعد - فہم مراد کے طرق - یہ مسائل ہیں جو اصول فقہ کے ارکان ہیں - ان تمام مسائل کے متعلق امام صاحب نے ضروری اصول و قواعد منضبط کر دیئے تھے -

حدیث کے متعلق امام صاحب نے جو اصول قرار دئے اُنکو ہم حدیث کی بحث میں لکھ آئے ہیں اُنکے علاوہ - اور ابواب کے متعلق - امام صاحب نے تمام ضروری اصول منضبط کر دئے تھے - مثلاً ما لم یثبت بالتواتر لیس بقرآن الزیادۃ نسخ - لا یجوز الزیادۃ علی الکتاب بخبر الواحد حمل المطلق علی المقید زیادۃ علی النص - عموم القرآن لا یخصص بالآحاد - العام قطعی کالخاص الخاص ان کان متاخراً خصص العام وان کان متقدماً فلا بل کان العام ناسخاً للخاص وان جہل التاریخ تساقطا ویطلب دلیل اٰخر - مفہوم الصفۃ لا یحتج بہ - النہی لا تدل علی البطلان امام صاحب کے یہ اقوال اُن کے شاگردوں کی تصنیفات یا اصول کی کتابوں میں جو شافعیہ و حنفیہ وغیرہ نے لکھے ہیں - جستہ جستہ مذکور ہیں - جنکو اگر یکجا جمع کر دیا جائے تو ایک مختصر رسالہ تیار ہوسکتا ہے[1] - یہی اصول ہیں جنکی بنا پر کہا جاتا ہے - کہ امام ابوحنیفہؒ ایک خاص طریقۂ اجتہاد کے بانی ہیں - انہیں اصول کے اتحاد کی بنا پر - امام محمد و قاضی ابویوسف کا طریقہ امام صاحب کے طریقہ سے الگ نہیں سمجھا جاتا حالانکہ جزئیات مسائل میں ان لوگوں نے سیکڑوں ہزاروں جگہ اُن سے اختلاف کیا ہے -

اِن اصولی مسائل پر بوجہ اسکے کہ امام شافعی وغیرہ نے اُن سے مخالفت کی ہے نہایت وسیع اور دقیق بحثیں قائم ہوگئیں ہیں - افسوس ہے کہ ہماری مختصر تالیف میں اُنکی گنجائش نہیں اصول کی کتابوں میں یہ مباحث نہایت تفصیل سے مذکور ہیں - جس شخص کا جی چاہے - اُن کتابوں کیطرف رجوع کر سکتا ہے -

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں فقہ کے اس حصّہ میں امام صاحب کی حیثیت ایک مفسر اور

[1] یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اصول فقہ کی کتابوں میں جو بہت سے اصول مذکور ہیں اُن سب کی نسبت یہ دعوٰے نہیں کیا جا سکتا کہ وہ امام ابوحنیفہ کے اقوال ہیں - شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ البالغہ میں اسپر ایک نہایت عمدہ تقریر لکھی ہے لیکن شاہ صاحب نے بعض اون اقوال سے بھی انکار کیا ہے جو بروایت صحیحہ امام صاحب سے ثابت ہیں ۱۲ -

مستنبط کی حیثیت ہے۔ اور کچھ شبہ نہیں کہ اسباب میں امام صاحب نے جو کام کیا۔ وہ نہ صرف تاریخ اسلام میں بلکہ کل دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ دنیا میں اور بھی قومیں ہیں جن کے پاس آسمانی کتابیں ہیں۔ اور وہ لوگ اُن کتابوں سے اخذ احکام کرتے ہیں۔ لیکن کوئی قوم یہ دعوےٰ نہیں کر سکتی کہ اُس نے استنباط مسائل کے اصول اور قواعد منضبط کئے اور اُسکو ایک مستقل فن کے رتبہ تک پہنچا دیا۔

فقہ کا دوسرا حصہ جو صرف قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے حصہ کی نسبت بہت زیادہ وسیع ہے اور یہ وہ خاص حصہ ہے جسمیں امام ابوحنیفہ۔ علانیہ تمام مجتہدین سے ممتاز ہیں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اگر اسلام میں کوئی شخص واضع قانون گزرا ہے تو وہ صرف امام ابوحنیفہ ہیں۔ مسلمانوں میں توضیع قانون کا کام ہمیشہ اُن لوگوں کے ہاتھ میں رہا جو مذہبی پیشوا تھے اور زہد و اتقا میں نہایت غلو رکھتے تھے۔ مذہبی لوگوں میں جو اوصاف نہایت قابل قدر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ دنیاوی امور سے علیحدگی۔ کم آمیزی۔ معاملات میں سختی۔ عام واقعات سے بیخبری غیر مذہب والوں سے تنفر۔ یہ تمام اوصاف وہ ہیں جو تمدن کے مخالف ہیں اور جس شخص میں یہ اوصاف اعتدال سے بڑھکر ہوں اور فطرتی ہوں وہ مشکل سے تمدن کی ضروریات کا اندازہ دال ہو سکتا ہے۔ تقدس و پاکیزہ نفسی کے لحاظ سے ان لوگوں کی جسقدر عظمت کیجائے کم ہے لیکن دنیا اور دنیا والوں کا کام اُن سے نہیں چلسکتا۔ حضرت جنید بغدادی معروف کرخی۔ شیخ شبلی۔ داؤد طائی۔ کی عظمت وشان سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ واضع قانون نہیں ہو سکتے تھے۔

مجتہدین جنہوں نے فقہ کے نام سے ملکی اور شخصی قانون بنائے۔ اگرچہ رہبانیت کی حد سے دور تھے۔ تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ تمدن کی اُن تمام وسیع تعلقات پر اُن کی نگاہ پڑ سکتی تھی۔ جن سے اُن کو عمر بھر کبھی سروکار نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے قوانین میں بعض جگہ ایسی سختی اور تنگی پائی جاتی ہے۔ جسپر مشکل سے عمل در آمد ہو سکتا ہے۔ امام شافعی وغیرہ کا مذہب ہے کہ نکاح میں بجز ثقاۃ کے کوئی شخص گواہ نہیں ہو سکتا۔ ہمسایہ کو حق شفعہ نہیں پہنچتا بیع بالمعاطاۃ جائز نہیں۔ ذمیوں کی شہادت کسی حال میں مقبول نہیں۔ ایک مسلمان سیکڑوں ذمیوں کو بے قصور قتل کر ڈالے تاہم وہ قصاص میں پکڑا نہیں جا سکتا۔ ان مسائل سے دنیا کا کام کیونکر چل سکتا ہے۔

امام ابوحنیفہ۔ اس وصف میں اپنے تمام ہمعصروں سے ممتاز تھے کہ وہ مذہبی تقدس کے ساتھ دنیاوی اغراض کے اندازہ شناس تھے۔ اور تمدن کی ضرورتوں کو اچھی طرح

سمجھتے تھے۔ مرجعیت اور فصل قضایا کی وجہ سے ہزاروں پیچیدہ معاملات اُن کی نگاہ سے گذر چکے تھے۔ اُن کی مجلس افتا بہت بڑی عدالت العالیہ تھی جس نے لاکھوں مقدمات کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ ملکی حیثیت رکھتی تھی اور ارکانِ سلطنت مہمات امور میں اُن سے مشورہ لیتے تھے۔ اُنکے شاگرد اور ہمنشین جن کی تعداد سیکڑوں سے زیادہ تھی عموماً وہ لوگ تھے جو منصب قضا پر مامور تھے۔ ان باتوں کے ساتھ خود اُن کی طبیعت مقننانہ اور معاملہ سنج واقع ہوئی تھی۔ وہ ہر بات کو قانونی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ اور اُسکے دقیق نکتوں تک پہنچتے تھے۔ اِس بات کا اندازہ واقعہ ذیل سے ہوسکتا ہے جسکا ذکر اکثر مورخین نے کیا ہے۔

ایک دن امام صاحب قاضی بن ابی لیلی سے ملنے گئے۔ اُسوقت اُن کے سامنے ایک مقدمہ پیش تھا۔ مدعی کا بیان تھا کہ فلاں شخص نے میری ماں کو زانیہ کہا ہے۔ اس لئے میں ازالہ حیثیت کا دعویدار ہوں۔ قاضی صاحب نے مدعا علیہ کیطرف جو اُس موقع پر موجود تھا خطاب کیا کہ تم کیا جواب دیتے ہو امام ابوحنیفہ نے قاضی صاحب سے کہا کہ ابھی مقدمہ قایم نہیں ہوا۔ مدعی کا اظہار لینا چاہیئے کہ اُسکی ماں زندہ ہے یا نہیں۔ کیونکہ اُس کو بھی شریک مقدمہ ہونا چاہیئے۔ یا اگر اُس نے اسکی معرفت مقدمہ دایر کیا ہے تو اُسکو مختار نامہ پیش کرنا چاہیئے قاضی صاحب نے مدعی کا اظہار لیا۔ معلوم ہوا کہ اسکی ماں مرچکی ہے۔ اسپر قاضی صاحب نے مقدمہ آگے چلانا چاہا امام صاحب نے کہا۔ مدعی سے پوچھنا چاہیے کہ اس کے بھائی بہن ہیں یا نہیں کیونکہ اگر اور دعویدار موجود ہیں تو اُن کو بھی شریک مقدمہ ہونا چاہیئے۔ اسیطرح۔ امام صاحب نے اور چند سوالات کئے۔ جب وہ مراتب طے ہوچکے تو فرمایا کہ "اب مقدمہ قایم ہوا اور آپ مدعا علیہ کا اظہار لیجئے۔

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے جس طریقہ سے مقدمہ کی کارروائی شروع کی تھی وہ اُس حیثیت سے بڑھکر نہ تھا جس طرح عوام آپسمیں فصل خصومات کیا کرتے ہیں لیکن امام صاحب۔ باقاعدہ فیصلہ چاہتے تھے، جسکا ضروری اصول یہ ہے کہ ایک حق سے جتنے لوگ دعوے دار ہوسکتے ہیں اُن سب کو مقدمہ میں شریک ہونا چاہیئے تاکہ عدالت کو ایک ہی حق کے فیصلہ کرنے میں بار بار زحمت نہ اُٹھانی پڑے۔

امام صاحب نے فقہ کے اس دوسرے حصہ کی جسطرح تدوین کی اور جس ضبط و ربط سے اُسکی جزئیات کا استقصا کیا وہ اُس زمانہ کا نہایت وسیع قانون تھا اگرچہ اُسکی تعبیر ایک عام لفظ (فقہ) سے کیجاتی ہے۔ لیکن درحقیقت اُسمیں بہت سے قوانین شامل تھے چنانچہ

آج تعلیم یافتہ دنیا میں ان ہی ابواب کے مسائل جو ترتیب دیئے گئے ہیں وہ جدا جدا قانون کے نام سے موسوم ہیں۔ مثلاً قانون معاہدہ۔ قانون بیع۔ قانون لگان و مالگذاری۔ تعزیرات ضابطہ فوجداری وغیرہ وغیرہ۔

اسی بنا پر بعض یورپین مصنفوں کا خیال[1] ہے۔ کہ امام ابوحنیفہ نے فقہ کی تدوین میں رومن لا یعنے رومیوں کے قانون سے بہت کچھ مدد لی اور اُسکے بہت سے مسائل اپنے فقہ میں داخل کر لیئے۔ اس خیال کی تائید میں یہ قرائن پیش کیئے جاتے ہیں۔

(۱) حنفی فقہ کے بہت سے مسائل رومن لا کے مطابق ہیں۔

(۲) رومن لا تمام ممالک شام میں جاری تھا اور چونکہ مسلمانوں پر شام کی معاشرت و تمدن کا بہت کچھ اثر پڑا تھا اس لیئے قیاس غالب یہ ہے کہ علمائے اسلام نے قانونی مسائل میں بھی اُن سے استفادہ کیا۔

(۳) اسقدر متعدد اور وسیع قوانین۔ جو فقہ میں شامل ہیں اُن کی توضیح بغیر اسکے نہیں ہو سکتی کہ دنیا کے اور قوانین سے مدد لی گئی ہو۔

اس بحث کا اصلی تصفیہ تو جب ہو سکتا ہے کہ رومن لا اور حنفی فقہ کا نہایت وقت نظر اور استقصار کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔ جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ جسقدر دونوں قانون میں تطابق ہے وہ توارد کی حد سے متجاوز ہے یا اُسیقدر ہے جتنا کہ عموماً تمام قوموں کے قوانین بہت سی باتوں میں موافق ہوا کرتے ہیں۔ میں اولاً تو رومن لا سے واقف نہیں۔ اور ہوتا بھی تو اتنی

[1] ہم نے اس کو شہرت عام کی بنا پر لکھا تھا لیکن تالیف کتاب کے بعد ہم کو معلوم ہوا کہ مسٹر شیلڈن ایموز Sheldon Amos نے جو آجکل لنڈن یونیورسٹی کے لا پروفیسر ہیں اپنی کتاب رومن سول Roman Civil Law میں اس دعوے کو بڑی شد و مد سے ثابت کرنا چاہا ہے اور اسپر ایک مفصل بحث کی ہے[1] یورپ کو جو برتری آج تمام قوموں اور بالخصوص مسلمانوں پر حاصل ہے اُسنے یورپین مصنفوں کے دل میں بالطبع یہ بات پیدا کر دی ہے کہ وہ مسلمانوں کے تمام گزشتہ کارناموں کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھیں اور اگر کوئی کمال ایسا بدیہی اور نمایاں ہو جس سے کسیطرح انکار نہ ہو سکے تو یہ دعوے کریں کہ وہ مسلمانوں کی ایجاد نہیں ہے بلکہ روم و یونان و مصر وغیرہ سے ماخوذ ہے۔ یہی اثر ہے جس نے مسٹر شیلڈن ایموز کو اس بحث پر مجبور کیا۔ انہوں نے اپنے دعوے کو فقہ حنفی تک محدود نہیں رکھا بلکہ عام قانون اسلام کی نسبت اُنکا یہ دعوے ہے ہم اُن کے مضمون کو تقریباً اُن کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے دعوے میں کہانتک کامیاب ہوئے ہیں وہ اپنے مضمون کو اس تمہید سے شروع کرتے ہیں "مشرق میں دفعتہً ایک بالکل جدید ذطبعزاد قائم بالذات

[1] دیکھو کتاب مذکور صفحہ ۴۰۶ تا صفحہ ۴۱۵ - ۱۲

دست کہاں نصیب کہ تمام مسائل کا مقابلہ کر سکتا۔ اسلئے مجھ کو اعتراف کرنا چاہئے۔ کہ اس موقع پر جو کچھ میں لکھوں گا اُسکا رتبہ قیاس اور ظن سے زیادہ نہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ جن لوگوں نے اس بحث کو چھیڑا ہے وہ بھی قیاس و ظن ہی سے کام لیتے ہیں۔ کیونکہ باوجود تحقیق کے ہم کو کوئی ایسا مصنف نہیں ملا جسکا یہ دعوےٰ ہو کہ وہ رومن لا اور حنفی فقہ کے تمام یا اکثر مسائل کا مقابلہ کر چکا ہے۔

اس امر سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ فقہ حنفی میں ایسے مسائل موجود ہیں۔ جو عرب اور عراق میں۔ اسلام سے پہلے معمول بہ تھے۔ لیکن اس میں فقہ حنفی کی خصوصیت نہیں۔ یہ سلسلہ اور آگے چلتا ہے۔ جو مسائل آج خاص اسلام کے مسائل خیال کئے جاتے ہیں اور خود قرآن مجید میں اُن کا ذکر ہے۔ اُن میں متعدد ایسے ہیں۔ جو زمانۂ جاہلیت میں معمول و متداول تھے علامہ ابو ہلال عسکری نے کتاب الاوایل میں اُنکی تفصیل بھی کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے خراج و ٹکس کے متعلق جو قاعدے مقرر کئے۔ وہ عموماً وہی ہیں جو نوشیرواں عادل نے اپنے زمانۂ حکومت میں وضع کئے تھے۔ اور یہ کچھ تو اردنہ تھا بلکہ حضرت نے دانستہ نوشیرواں کی اقتدا کی تھی۔ چنانچہ علامہ طبری و ابن الاثیر نے صاف انہیں الفاظ میں تصریح کی ہے۔

ایک مقنن جب کسی ملک کے لئے قانون بناتا ہے تو اُن تمام احکام اور رسم و رواج۔ کو سامنے رکھ لیتا ہے۔ جو اُس ملک میں اُس سے پہلے جاری تھے اُن میں سے بعض کو وہ بعینہٖ اختیار کرتا بعض میں ترمیم و اصلاح کرتا ہے۔ بعض کی بالکل مخالفت کرتا ہے۔ بے شبہ امام ابو حنیفہ نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔ لیکن اس حیثیت سے وہ رومن لا کی بہ نسبت ایران کے قانون سے زیادہ مستفید ہوئے ہونگے۔ کیونکہ اوّلاً تو وہ خود فارسی النسل تھے اور اُن کی زبان مادری

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۳۹) سلسلہ قانون کا پیدا ہو جانا جسکی نسبت دعوےٰ کیا گیا ہے کہ وہ قرآن و حدیث پر مبنی ہے۔ ایک ایسی عجیب بات ہے کہ خواہ مخواہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی کی نسبت جو دعوےٰ کیا جاتا ہے اُسکی تاریخی بنیاد کیا ہے۔ علاوہ دوسری شہادتوں کے غور خانۂ قیاس اس دعوے کے سخت مخالف ہے"۔ اس کے بعد پروفیسر موصوف اس کلیہ پر بحث کر کے کہ ہمیشہ سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ ہر سلسلہ قانونی کو کسی واقعی یا فرضی واضع قانون کے نام سے موسوم کر دیا کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ "اس لحاظ سے اُبتدا ہی میں ایک قوی قیاس پیدا ہوتا ہے کہ جو باترتیب اور مضبوط سلسلۂ قانون مسلمان فاتحوں نے تمام ممالک مفتوحہ میں جاری کیا وہ بہ تبدیل ہیئت کوئی اعلےٰ درجہ کا مکمل رواج یافتہ سلسلۂ قانون تھا"۔

پروفیسر موصوف نے تاریخی شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ جس وقت مسلمانوں نے شام مصر۔ کو فتح کیا۔ تو وہاں رومی قوانین کے متعدد مدرسے موجود تھے۔ بیروت میں الگزنڈر سیورس کے زمانے سے ایک مدرسۂ قانون

فارسی تھی۔ دوسرے اُن کا وطن کوفہ تھا اور وہ فارس کے اعمال میں داخل تھا۔

غرض یہ امر بہر حال قابل تسلیم ہے کہ امام صاحب کو فقہ کی توضیع میں اُن قواعد اور رسم و رواج سے ضرور مدد ملی ہوگی۔ جو اُن ممالک میں جاری تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی استعانت سے امام صاحب کے واضع قانون ہونے کی حیثیت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ یعنے وہ ایک مستقل

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۴۰) چلا آتا تھا جس میں چار پروفیسر تھے۔ قیصریہ میں وکلاء کی ایک جماعت رہتی تھی اسکندریہ میں قانون کی تعلیم جاری تھی۔ ان واقعات کی تفصیل کے بعد پروفیسر موصوف فرماتے ہیں کہ "اس قیاس کی نسبت کہ اسلامی قوانین پر رومی قانون کا اثر پڑا ہے اسقدر کہنا کافی ہوگا۔ لیکن جس طریقہ سے کہ اسلامی فتوحات ہوئیں اور جس طرح پر مسلمان ممالک مفتوحہ میں آباد ہوئے۔ اگر ان امور پر غور کیا جائے تو یہ قیاس یقین سے بدلجاتا ہے"۔ اسلامی فتوحات کے طریقہ سے پروفیسر موصوف نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ شروع میں مسلمانوں نے غیر قوموں سے بجز جزیہ وصول کرنے کے اور کسی قسم کا اثر ڈالنا نہیں چاہا۔ لیکن جب علمی ترقی کا زمانہ آیا تو اُنہوں نے غیر قوموں کے لئے قانون وضع کیے جو خود اُنہی قوموں سے ماخوذ تھے پروفیسر موصوف کے الفاظ یہ ہیں۔ "نہ تو قرآن اور نہ ابتدائی خلافت کے زمانہ میں اسبات کی کچھ کوشش ہوئی کہ جو اعلےٰ قومیں عرب کے ماتحت ہوگئی تھیں اُن کی دنیوی زندگی کے پیچیدہ معاملات میں دست اندازی کیجائے۔ نہ ایسکے لئے فرصت تھی نہ دماغ اور نہ ایسے آدمی موجود تھے جو اس خدمت کو انجام دےسکتے۔ جب بغداد اور اندلس کے شہروں اور قاہرہ میں امن و امان کا زمانہ آیا اور مطالعہ و غور کا موقع ملا تو طب و ریاضت و منطق اور علوم نفسیہ میں ترقی ہوئی۔ جسطرح کہ ارسطو سے عربوں نے منطق سیکھی۔ اسی طرح بیسل (Basilica) لیو (Leo) اور اُن کے یونانی شارحوں سے علم قانون اخذ کیا۔" اس کے بعد پروفیسر موصوف اس خیال کی قطعیت پر دلیل قائم کرتے ہیں کہ قرآن میں اسقدر کم احکام ہیں کہ اُن پر ایک قانون کی بنیاد نہیں قائم ہو سکتی۔ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن میں صرف یہ احکام ہیں۔ خدا کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔ تم اپنی بیبیوں کو دو دفعہ طلاق دے سکتے ہو پھر اُن کو رحمدلی یا مہربانی سے علیحدہ کردو۔ سود خوار قیامت میں آسیب زدوں کیطرح اُٹھینگے۔ میعادی قرض کو قلمبند کرلیا کرو۔ اگر بیبیوں کے ساتھ انصاف کرسکو تو کئی نکاح کرسکتے ہو۔ لیکن چار سے زیادہ نہیں مرد کو دو حصّے ملےگا۔ اور عورت کو ایک۔ لیکن صرف عورتیں ہوں تو دو۔ شوہر کو نصف حصّہ ملیگا۔ مرض الموت میں وصیت کے وقت گواہوں کا ہونا ضرور ہے۔ سال بارہ مہینے کا ہوتا ہے۔ مکاتب کو آزادی کا معاہدہ لکھدو اگر تمہاری مرضی ہو سزا کرنا و غیبت ۱۲۔

پروفیسر صاحب کے نزدیک قرآن میں صرف اسقدر قانونی احکام مذکور ہیں۔ اور اسلئے اُن کے نزدیک قرآن مجید ایک وسیع قانون کی بنیاد نہیں قرار پاسکتا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "جو سیدھے قواعد اوپر درج ہوئے اُن میں مشکل سے رومی بنیاد کا پتہ لگ سکتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ امر اور بھی حیرت انگیز ہے

واضع قانون کہے جاسکتے ہیں یا صرف ناقل اور جامع - جہانتک ہماری تحقیق ہے مسلمانوں نے غیر قوموں کی قانونی تصنیفات سے بہت کم واقفیت حاصل کی - ترجموں کی فہرست میں ہم سیکڑوں ہزاروں کتابوں کے نام پاتے ہیں - لیکن وہ فلسفہ - طب وغیرہ تصنیفات ہیں - قانون کی ایک کتاب کا بھی پتہ نہیں چلتا جو عربی زبان میں ترجمہ کی گئی ہو - اور اس قدر قطعاً ثابت ہے کہ امام صاحب نے جس زمانہ میں فقہ کی تدوین کی کسی ایسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا تھا - اسلیئے یہ احتمال کہ امام ابوحنیفہ نے غیر قوموں کی قانونی تصنیفات سے فایدہ اُٹھایا ہو بالکل بے اصل ہے ملک میں رسم و رواج کی بنیاد پر جو احکام نافذ تھے - اس قابل نہ تھے کہ خیز تحریر میں آکر قانون کا لقب حاصل کرسکتے -

مختصر یہ کہ جسقدر تاریخی قراین موجود ہیں - اُن سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا - کہ امام صاحب کو روم یا فارس کی کوئی قانونی تصنیف ہاتھ آئی جسکے نمونہ پر اُنھوں نے فقہ کی بنیاد رکھی - اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ امام ابوحنیفہ سے پہلے فقہ کے مسائل جس قدر اور جس صورت میں مدون ہوچکے تھے - وہ فن کی حیثیت نہیں رکھتے تھے - ان باتوں کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ اگر فقہ کو ایک قانون مانا جائے تو ضرور ماننا پڑے گا - کہ امام صاحب ہی اس کے مُقنن اور واضع تھے - البتہ اُن کو ملک کے رسم و رواج مسائل معمول بہا - علما کے فتاوے سے مدد ملی - لیکن یہ اُسی قسم کی مدد ہے جس سے دنیا کے اور واضعان قانون بھی بے نیاز نہ تھے - اس لئے یہ امر امام صاحب کی مقننیت کے رتبہ کو گھٹا نہیں سکتا -

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۴۱) کہ جو عمارت مسلمان فقیہوں نے ایسے پُرانے مصالحہ سے تیار کی وہ قریب قریب ہر ایک موڑ پر رومی قانون کی گلیوں اور جزیوں کو یاد دلاتی ہے" - اس کے بعد پروفیسر موصوف نے دعوےٰ کیا ہے کہ مسائل مندرجۂ ذیل[1] میں فقہ اسلام اور رومی قانون بالکل یکساں ہے اور بالآخر اُس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ سلسلۂ قانون یعنی علم فقہ دراصل رومی قانون ہے - لیکن یہ تبدیل ہیئت - پروفیسر موصوف نے نو صفحوں میں یہ بحث لکھی ہے - ہم نے اُسکا خلاصہ لکھدیا ہے - لیکن کوئی ضروری بات ترک نہیں کی بلکہ اکثر اُن کے خاص فقرے لکھدیئے ہیں - پروفیسر موصوف نے جن مقدمات کی ترتیب سے استدلال کیا وہ ہے - مختصراً یوں بیان کیئے جاسکتے ہیں "قرآن مجید میں بہت کم احکام ہیں اور اُن سے قانون نہیں بن سکتا" "ممالک مفتوحہ اسلام میں رومی قانون پہلے سے جاری تھا" "مسلمانوں نے یونان و روم وغیرہ کی تصنیفات کے ترجمے کیئے" "فلاں فلاں مسائل میں اسلامی فقہ اور رومی قانون متحد ہیں"

[1] ہم نے بخوف تطویل اُن مسائل کو یہاں نقل نہیں کیا لیکن آگے چلکر انہیں سے بہت سے مسائل کا ذکر آئیگا -

ان عام مباحث کے بعد۔ اب ہم اُن خاصیتوں[1] کا ذکر کرتے ہیں۔ جنکی وجہ سے حنفی فقہ کو اور فقہوں کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہے۔

(۱) سب سے مقدم اور قابل قدر خصوصیت جو فقہ حنفی کو حاصل ہے وہ مسائل کا اسرار اور مصالح پر مبنی ہونا ہے۔ احکام شرعیہ کے متعلق اسلام میں شروع ہی سے دو فرقے قائم ہو گئے ایک گروہ کی یہ رائے ہے کہ یہ احکام تعبدی احکام ہیں یعنی اُن میں کوئی سر اور مصلحت نہیں ہے۔ مثلاً شراب خواری یا فسق و فجور صرف اسلئے ناپسندیدہ ہیں۔ کہ شریعت نے ان سے منع کیا ہے اور خیرات و زکوٰۃ صرف اسلئے مستحسن ہیں۔ کہ شارع نے انکی تاکید کی ہے۔ ورنہ فی نفسہ یہ افعال بُرے یا بھلے نہیں ہیں۔ امام شافعی کا اسی طرف میلان پایا جاتا ہے۔ اور شاید اسی کا اثر تھا کہ ابو الحسن اشعری نے جو شافعیوں میں علم کلام کے بانی ہیں۔ علم کلام کی بنیاد اسی مسئلہ پر رکھی۔

دوسرے فرقہ کا یہ مذہب ہے کہ شریعت کے تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں۔ البتہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں۔ جنکی مصلحت عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن درحقیقت وہ مصلحت سے خالی نہیں یہ مسئلہ اگرچہ بوجہ اسکے کہ اُسکے دونوں پہلو بڑے بڑے علما نے اختیار کئے ہیں۔ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ بن گیا ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ اسقدر بحث و اختلاف کے قابل نہ تھا

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۴۲) یہ بحث حقیقت میں نہایت مفید اور امپارٹنٹ بحث ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اصل کتاب میں بیان کیا ہے اس معرکہ میں اُس شخص کو قدم رکھنا چاہیئے جو فقہ اسلام و رومن لا دونوں سے پوری واقفیت رکھتا ہو۔ پروفیسر موصوف بے شبہ رومن لا کی نسبت ہر قسم کی واقفیت کا دعوے کر سکتے ہیں۔ لیکن مسائل اسلام کے متعلق اُن کی وسعت معلومات کا اعتراف کرنا مشکل ہے۔ اُنہوں نے یہ دعوے کیا ہے کہ قرآن مجید میں قانونی احکام صرف معدود چند ہیں جنکی اُنہوں نے تفصیل کر دی ہے۔ حالانکہ قرآن مجید کی آیات احکام کم و بیش پانسو ہیں اور اگرچہ انمیں بہت سے احکام عبادات وغیرہ کے متعلق ہیں تاہم خاص وہ آیتیں جنمیں قانونی احکام ہیں سنو سے کم نہیں۔ یہ آیتیں جُدا گانہ جمع کی گئی ہیں اور علما نے اُن پر متعدد تفسیریں لکھی ہیں۔ ان تمام احکام سے واقف ہونا تو ایک طرف پروفیسر صاحب کی وسعت معلومات کا یہ حال ہے کہ نکاح و طلاق کے مسائل میں سے اُن کو صرف دو مسئلے معلوم ہیں تعداد طلاق و تعداد نکاح۔ حالانکہ قرآن مجید میں محرمات نکاح۔ موطوءہ اب جمع بین الاختین۔ نکاح۔ با مشرکات۔ طلاق قبل خلوت صحیحہ و بعد خلوت اور دونوں کے احکام خلع اور ایلا کے مسائل تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

[1] یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جن خصوصیتوں کا ہم نے دعوے کیا ہے وہ بلحاظ اکثر مسائل کے ہیں ممکن ہے کہ بعض جزئیات کے لحاظ سے یہ خصوصیتیں امام صاحب کے مذہب میں نہ پائی جاویں اور دوسرے اماموں کے فقہ میں پائی جائیں۔ لیکن ہمارا دعوے یہ ہے کہ امام صاحب کے اکثر مسائل میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی ہیں اور امام شافعی وغیرہ کے اکثر مسائل میں نہیں پائی جاتیں۔ ۱۲

تمام مہمات مسائل کی مصلحت اور غایت خود کلام الہی میں مذکور ہے۔ کفار کے مقابلہ میں قرآن کا طرز استدلال۔ عموماً اسی اصول کے مطابق ہے۔ نماز کی مصلحت خدا نے خود بتائی۔ کہ تنھیٰ عن الفحشاءِ وَ المنکر۔ روزہ کی فرضیت کے ساتھ ارشاد ہوا۔ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُونَ جہاں کی نسبت فرمایا حَتّٰی لَاتکونَ فتنۃ۔ اسی طرح اور احکام کے متعلق قرآن و حدیث میں جا بجا تصریحیں اور اشارے موجود ہیں کہ انکی غرض و غایت کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ کا یہی مذہب تھا اور یہ اصول انکے مسائل فقہ میں عموماً مرعی ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ حنفی فقہ جسقدر اصول عقلی کے مطابق ہے اور کوئی فقہ نہیں۔ امام طحاوی نے۔ جو محدث اور مجتہد دونوں تھے اس بحث میں ایک کتاب لکھی ہے جو شرح معانی الآثار کے نام سے مشہور ہے اور جسکا موضوع یہ ہے کہ مسائل فقہ کو نصوص و طریق نظر سے ثابت کیا جائے۔ محدث مذکور نے فقہ کے ہر باب کو لیا ہے۔ اور اگرچہ انصاف پرستی کیساتھ بعض

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۴۳) وراثت کے متعلق پروفیسر صاحب کو صرف شوہر کا حصہ اور یہ کہ مرد کو عورت کے دو حصہ کے برابر ملتا ہے معلوم ہے۔ افسوس اُن کو یہ معلوم نہیں کہ وراثت کا پورا باب اجمالاً قرآن مجید میں مذکور ہے اور خصوصاً والدین کا حصہ اور کلالہ کے احکام تو صاف صاف تصریحاً مذکور ہیں۔ قصاص اور دیت کے مسائل جو نہایت تفصیل سے قرآن میں مذکور ہیں۔ اور جنمیں قتل عمد اور قتل خطا اور انکے احکام کی پوری تفصیل ہے۔ پروفیسر صاحب کو سرے سے معلوم نہیں۔ حیرت ہے کہ اس محدود واقفیت کے ساتھ پروفیسر صاحب نے اس بحث کے طے کرنے کی کیونکر جرأت کی؟

یہ توضمنی بحث تھی اَب ہم اُن مقدمات پر توجہ کرتے ہیں جن پر پروفیسر صاحب کی استدلال کی بنا ہے اسقدر اُنہوں نے خود تسلیم کرلیا ہے اور واقع میں بھی صحیح ہے کہ شروع اسلام یعنی خلافت راشدہ کے اخیر زمانہ تک مسلمان غیر قوموں سے بالکل الگ ہے اور اُن کے قانون اور احکام سے کسی قسم کی واقفیت نہیں حاصل کی۔ اسلئے دمشق و بیروت و اسکندریہ میں اُسوقت رومن لا کے جو مدرسے جاری تھے خود بقول پروفیسر صاحب کے اسلامی فقہ پر اُسکا کچھ اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ اَب قابل لحاظ یہ امر ہے کہ پروفیسر صاحب نے اسلام کے جو مسائل اس دعوے کے ساتھ پیش کئے ہیں کہ وہ رومن لا کے موافق ہیں۔ وہ کس زمانہ کے ایجاد شدہ مسائل ہیں۔ مثلاً وراثت کے متعلق پروفیسر صاحب نے لکھا ہے کہ مسائل ذیل یعنی اولاد سلسلہ اصولی۔ رشتہ داران طرفی خواہ آدھا خون ملا ہو یا کل اور اُن کی اولاد۔ بی بی یا خاوند مولائی غلام آزاد یہ سب رومن لا کے موافق ہیں۔ اسکے بعد وہ تحریر فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں ترکہ اسطرح تقسیم کیا جاتا تھا۔ جو رومن لا کا طریقہ تھا یعنی کل حصے یہ تھے۔ نصف۔ ربع۔ ثمن۔ دو ثلث۔ ایک ثلث۔ سدس۔ یہی حصے رومن لا میں بھی تھے لیکن پروفیسر صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ یہ حصص خود قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ اور قرآن مجید کا

مسئلوں میں امام ابوحنیفہ سے مخالفت کی ہے۔ لیکن اکثر مسائل کی نسبت مجتہدانہ طرز استدلال سے ثابت کیا ہے کہ "امام ابوحنیفہ کا مذہب۔ احادیث اور طریق نظر۔ دونوں کے موافق ہے"۔ امام محمد نے بھی کتاب الحجج میں اکثر مسائل میں عقلی وجوہ سے استدلال کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں چھپ گئیں ہیں اور ہر جگہ ملتی ہیں جسکو تفصیل مقصود ہو ان کتابوں کی طرف رجوع کرے۔ اس دعوے سے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب عقل کے موافق ہے۔ شافعیہ وغیرہ کو بھی انکار نہیں۔ اور وہ انکار کیونکر کرتے۔ اُنکے نزدیک احکام شرعیہ خصوصاً عبادات۔ جسقدر عقل سے بعید ہوں اُسی قدر اُنکی خوبی ہے۔

امام رازی نے زکوۃ کی بحث میں لکھا ہے[۱] کہ امام شافعی کا مذہب امام ابوحنیفہ سے زیادہ صحیح ہے جسکی دلیل یہ ہے کہ امام شافعی۔ کا مذہب عقل و قیاس سے بعید ہے۔ اور یہی اس کی صحت کی دلیل ہے۔ کیونکہ زکوۃ کے مسائل زیادہ تر تعبدی احکام ہیں۔ جنمیں عقل و رائے کو دخل نہیں"۔

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۴۴) خود پروفیسر صاحب نے تسلیم کیا ہے۔ کہ اُسمیں رومی بنیاد کا پتہ نہیں لگتا۔ البتہ ورثا کی بعض افراد قرآن مجید میں مذکور نہیں لیکن وہ زمانۂ رسالت خلافت تک پوری طرح سے معین و مقرر ہو چکے تھے۔ حدیث و آثار کی نہایت قدیم کتابیں آج موجود ہیں اُن کو پڑھکر متعصب سے متعصب شخص بھی اسسے انکار نہیں کرسکتا۔

وصیت کے متعلق پروفیسر صاحب نے فقہ کے جن مسائل کو رومن لا سے ماخوذ سمجھا ہے۔ اُن کی یہ تفصیل کی ہے وصیت تقریری یا تحریری دو گواہوں کے سامنے۔ وصی۔ ایک ثلث جائداد سے زیادہ کی وصیت نہیں کرسکتا۔ جب تک کہ ورثا نہ راضی ہوں۔ لیکن یہ مسائل بھی زمانۂ نبوت یا خلافت کے مسائل ہیں۔ اور اس امر سے ایک عام عربی داں بھی انکار نہیں کرسکتا۔ پروفیسر صاحب نے اور بھی مسائل گنائے ہیں۔ جو اُن کی رائے میں رومن لا سے ماخوذ ہیں۔ ہم اُن سب کی تفصیل نہیں کرسکتے۔ مختصراً اسقدر کہنا کافی ہے۔ کہ اُن میں اکثر مسائل اُسی زمانہ کے ہیں جنکی نسبت پروفیسر صاحب نے تسلیم کیا ہے۔ کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کے قوانین و احکام سے کچھ واقفیت نہیں حاصل کی تھی۔

پروفیسر صاحب کو اس بات پر بڑی حیرت ہے، کہ قرآن مجید یا حدیث میں قانونی مسائل بہت کم تھے اُنکی بنیاد پر فقہ کا اتنا بڑا دفتر کہاں سے تیار ہوگیا؟ اسی حیرت نے اُن کو مجبور کیا کہ وہ فقہ اسلام کو رومن لا کا خوشہ چین بتائیں۔ لیکن پروفیسر صاحب کس کس بات پر حیرت کرینگے۔ قانونی مسائل تو خیر رومن لا سے ماخوذ ہیں۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوۃ کے متعلق قرآن مجید و احادیث میں کون سی بڑی تفصیل ہے۔ پھر فقہ

[۱] مناقب الشافعی مصنفہ امام فخرالدین رازی ۱۲۔

بخلاف اور ہمعصروں کے امام ابوحنیفہ کا اس اصول کیطرف مائل ہونا ایک خاص سبب سے تھا۔ دوسرے ائمہ جنہوں نے فقہ کی تدوین و ترتیب کی۔ اُن کی علمی ابتدا فقہی مسائل سے ہوئی تھی۔ بخلاف اسکے امام ابوحنیفہ کی تحصیل علم کلام سے شروع ہوئی۔ جس کی ممارست نے اُن کی قوت فکر اور حدتِ نظر کو نہایت قوی کر دیا تھا۔ معتزلہ وغیرہ جن سے اُن کے معرکے رہتے تھے عقلی اصول کے پابند تھے۔ اسلئے امام صاحب کو بھی اُن کے مقابلہ میں اُنہیں اصول سے کام لینا پڑتا تھا۔ اور متنازع فیہ مسئلوں میں مصالح و اسرار کی خصوصیتیں دکھانی پڑتی تھیں۔ اس غور اور تدقیق۔ مشق و مہارت سے اُن کو ثابت ہو گیا تھا کہ شریعت کا ہر مسئلہ اصول عقل کے مطابق ہے۔ علم کلام کے بعد وہ فقہ کیطرف متوجہ ہوئے تو ان مسائل میں بھی وہی جستجو رہی۔

حنفی فقہ کے مسائل کا دوسرے فقہوں کے مسائل سے مقابلہ کیا جائے۔ تو یہ تفاوت صاف نظر آتا ہے۔ معاملات تو معاملات۔ عبادات میں بھی جس کی نسبت ظاہر بینوں کا خیال ہے کہ اُس میں عقل کو دخل نہیں امام صاحب کے مسائل عموماً عقل کیموافق معلوم ہوتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۴۵) میں انہی مسائل کا ایک عظیم الشان سلسلہ کیونکر قائم ہو گیا؟ کیا یہ مسائل بھی رومن لا سے ماخوذ ہیں۔ اسکو بھی جانے دو۔ تمام اور اسلامی علوم کیونکر پیدا ہوئے؟ اور اس وسعت کو کیونکر پہنچے؟ آنحضرت کے زمانہ میں۔ تفسیر۔ حدیث۔ اصول حدیث۔ اصول فقہ۔ اسماء الرجال کے کتنے مسائل پیدا ہوئے تھے۔ اور آج اُن کی کیا حالت ہے؟ کیا آج یہ سب علوم جداگانہ فن نہیں ہیں؟ کیا اُن سے مسلمانوں کی دقت۔ نظر۔ تیزی طبع۔ وسعت خیال کا اندازہ نہیں ہوتا۔ کیا یہ علوم و فنون بھی مسلمانوں نے روم و یونان سے سیکھے؟

فقہ کے جن مسائل کو پروفیسر صاحب نے رومن لا سے ماخوذ بتایا ہے وہ تو اُس زمانہ کے مسائل میں جب خود بقول پروفیسر صاحب کے مسلمانوں نے غیر قوموں سے کچھ نہیں سیکھا تھا۔ لیکن زمانہ مابعد میں بھی فقہ نے رومن لا کا کبھی احسان نہیں اُٹھایا۔ پروفیسر صاحب کا یہ دعوے صحیح ہے کہ دولت عباسیہ کے عہد ترقی میں مسلمانوں نے یونان و مصر سے علوم و فنون لیے۔ لیکن اُن کو جاننا چاہئے۔ کہ یونان و مصر کے شاگردوں کا گروہ ایک خاص گروہ تھا۔ بے شبہہ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی تھے۔ جو غیر قوموں سے مستفید ہوتے تھے اور اُسکو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن مسلمانوں ہی میں وہ گروہ بھی تھا۔ (اور وہی بہت بڑا گروہ تھا) جو اپنے فضل و کمال کے زعم میں غیر قوموں کیطرف کبھی رُخ بھی نہیں کرتا تھا۔ مجتہدین اور فقہاء اسی گروہ میں داخل ہیں یونان و روم وغیرہ کی کتابیں جو عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں۔ اُن کی نہایت مفصل فہرست ہم کو معلوم ہے۔ ان میں فلسفہ طب۔ ہندسہ۔ نجوم۔ کیمیا۔ صنعت۔ تاریخ۔ ناول۔ ہر قسم کی کتابیں ہیں۔ لیکن قانون کی ایک تصنیف بھی نہیں جسکی وجہ غالباً یہی ہے کہ فقہا مجتہدین جو اسلام میں واضع قانون تھے۔ غیر قوموں کی خوشہ چینی کو اپنی اصطلاح میں حرام کہتے تھے۔ کیا امام ابوحنیفہ

اگر اسبات پر غور کیجائے کہ نماز - روزہ - حج - زکوۃ - شریعت میں کن مصلحتوں سے فرض کئے گئے ہیں - اور اُن مصالح کے لحاظ سے ان احکام کی بجا آوری کا کیا طریقہ ہونا چاہئے - تو وہی طریقہ موزوں ثابت ہوگا - جو حنفی فقہ سے ثابت ہوتا ہے - مثلاً نماز چند افعال کے مجموعہ کا نام ہے - لیکن اس لحاظ سے کہ نماز کی اصلی غرض کیا ہے ؟ (یعنی خضوع - اظہار تعبد - اقرار عظمت الٰہی - دعا) اور اُس کے حاصل ہونے میں کن افعال کو کس نسبت سے دخل ہے ؟ - ان افعال کے مراتب مختلف ہیں - بعض لازمی اور ضروری ہیں - کیونکہ اُنکے نہ ہونے سے نماز کی اصل غرض فوت ہوتی ہے - ان افعال کو شریعت کی زبان میں فرض سے تعبیر کیا جاتا ہے - بعض افعال ایسے ہیں جو طریقۂ ادا میں ایک حسن و خوبی پیدا کرتے ہیں - لیکن اُن کے فوت ہونے سے اصل غرض فوت نہیں ہوتی - ان افعال کا رتبہ پہلی قسم سے کم ہے اور اُن کو سنت و مستحب سے تعبیر کرتے ہیں -

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود فرض و واجب و سنت کی تصریح نہیں فرمائی - لیکن اسمیں کچھ شبہہ نہیں ہو سکتا تھا - کہ نماز کے تمام افعال یکساں درجہ نہیں رکھتے تھے اسلیے تمام مجتہدین نے اُن کو امتیاز مراتب پر توجہ کی اور استنباط اجتہاد کی رو سے اُن افعال کے مختلف مدارج قائم کئے اور اُنکے جدا جدا نام رکھے - امام ابوحنیفہ نے بھی ایسا ہی کیا - لیکن اسباب میں اُن کو اور آیمہ پر جو ترجیح ہے وہ یہ ہے کہ اُنھوں نے جن افعال کو جس رتبہ پر رکھا در حقیقت اُن کا وہی رتبہ تھا - مثلاً سب سے ضروری امر یہ ہے - کہ نماز کے ارکان یعنی وہ افعال جنکے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی ، کیا ہیں ؟ چونکہ نماز اصل میں اقرار

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۴۶) امام مالک - امام شافعی - امام احمد حنبل سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ مسائل فقہ کو جو اُن کے نزدیک مذہب کا ایک حصّہ تھا روم و یونان سے سیکھتے - اگر پروفیسر صاحب کو ان ایمہ کے حالات معلوم ہوتے اور یہ بھی معلوم ہوتا کہ فقہ کے تمام ابواب انہی بزرگوں کے عہد میں مرتب ہو گئے تھے - تو وہ ہرگز ایسا دعوےٰ نہ کرتے !

البتہ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ بعض مسائل میں رومن لا و فقہ اسلام متحد کیوں ہیں - لیکن اسمیں فقہ اسلام کی تخصیص نہیں - جن قانونوں کا گو وہ کتنی ہی بے تعلق ہوں آپسمیں مقابلہ کیا جاوے بہت سے مسائل مشترک ثابت ہونگے اور قدرتاً ایسا ہونا ضرور ہے - جب تمام دنیا کے آدمیوں کی ذاتی - تمدنی - ملکی ضرورتیں - اکثر متحد اور یکساں ہیں تو ان ضرورتوں کے لحاظ سے ہر جگہ جو قوانین وضع کئے جاوینگے - اُن کے مسائل کا مشترک ہونا کونسی تعجب کی بات ہے - شنعس

دو راہرو کہ بیک رہ روند در یک سمت　　　عجب نباشد اگر او فتند پے بر پے

عبودیت اور اظہار خشوع کا نام ہے۔ اسلئے اسقدر تو سب مجتہدوں کے نزدیک مسلم رہا۔ کہ نیت تکبیر۔ قرأت۔ رکوع۔ سجود۔ وغیرہ جن سے بڑھکر اقرار عبودیت اور اظہار خشوع کا کوئی طریقہ نہیں نہیں ہوسکتا فرض اور لازمی ہیں اور خود شارع نے اُن کے لازمی اور ضروری ہونے کیطرف اشارے کئے۔ بلکہ بعض جگہ تصریح بھی کی لیکن اور ائمہ نے یہ زیادتی کی۔ کہ ان ارکان کی خصوصیتوں کو بھی فرض قرار دے دیا۔ حالانکہ وہ خصوصیتیں لازمی نہ تھیں۔ اس لئے امام ابوحنیفہ اُن کے فرضیت کے قائل نہیں۔ مثلاً امام ابوحنیفہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کہنے کے سوا اور الفاظ سے بھی ادا ہوسکتی ہے۔ جو اُس کے ہم معنی ہیں (مثلاً اللہ اعظم اللہ اجل) امام شافعی کے نزدیک نہیں ہوسکتی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک تکبیر اگر فارسی زبان میں کہی جائے۔ تب بھی جائز ہے۔ امام شافعی کے نزدیک۔ اس سے نماز باطل ہوجاتی ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک قرآن مجید کی کسی آیت کے پڑھنے سے قرأت کا فرض ادا ہوجاتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز ہو ہی نہیں سکتی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جو شخص عربی میں قرآن پڑھنے معذور ہے۔ وہ مجبوراً ترجمہ پڑھ سکتا ہے[لہ]۔ امام شافعی کے نزدیک ترجمہ سے کسی حالت میں نماز نہیں ہوسکتی۔

اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ امام ابوحنیفہ یا کسی مجتہدین نے صرف عقل وقیاس سے نماز کے ارکان متعین کئے ہیں۔ ائمہ نے ان ارکان کے ثبوت کے لئے عموماً احادیث کی تصریحات واشارات سے استدلال کیا ہے چنانچہ ہر مجتہد کے نقلی دلائل کتب فقہ میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔ ہمارا یہ مطلب ہے کہ امام ابوحنیفہ کے دعوؤں پر جس طرح نقلی دلائل یعنی احادیث کی تصریحیں اور اشارے موجود ہیں)۔ اسی طرح عقلی وجوہ بھی اُن کی صحت کے شاہد ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ امام صاحب شریعت کے اسرار او مصالح کو نہایت دقیق نگاہ سے دیکھتے تھے۔

زکوٰۃ کے مسائل کا بھی یہی حال ہے۔ زکوٰۃ کا اصلی مقصد بنی نوع کی ہمدردی اور اعانت ہے اسلئے زکوٰۃ کے مصرف میں وہ لوگ خاص کر دیئے گئے ہیں جو سب سے زیادہ ہمدردی اور اعانت کا استحقاق رکھتے ہیں۔ یعنی فقراء مساکین۔ عمال زکوٰۃ۔ مولفۃ القلوب۔ مقروض۔ مسافر۔ غازی۔ مکاتب چونکہ ان لوگوں کی تصریح خود قرآن مجید میں مذکور ہے۔ اس لئے

لہ امام محمد نے جامع صغیر میں جو روایت کی ہے اُسمیں مجبوری کی قید نہیں ہے اور اسی بنا پر مخالفین نے امام صاحب پر یہ سخت اعتراض کیا ہے کہ "وہ قرآن کی حقیقت ومفہوم میں الفاظ کو داخل نہیں سمجھتے یعنے اُنکے نزدیک صرف قرآن کے معانی پر قرآن کا اطلاق ہوسکتا ہے"۔ بے شبہہ امام صاحب کی اس غلطی کو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن فقہائے حنفیہ نے دعوے کیا ہے کہ امام صاحب نے بالآخر اس قول سے رجوع کیا ہے ۱۲۔

اس امر میں سب مجتہدین کا اتفاق رہا کہ یہ لوگ مصرف زکوۃ ہیں۔ لیکن تعین نے ایک اختلاف پیدا کر دیا۔ امام شافعی نے ان اقسام کے ذکر سے یہ خیال کیا کہ یہ سب اشخاص زکوۃ کے ادا میں لازمی ہیں۔ یعنی جب تک ان آٹھوں اقسام کے لوگوں کو زکوۃ ادا نہ کیجائے۔ فرض ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ بخلاف اسکے امام ابوحنیفہ کا یہ مذہب ہے کہ زکوۃ ان اقسام سے باہر نہ جانے پائے۔ باقی یہ امر کہ ان لوگوں میں سے سب کو دی جائے۔ یا بعض کو یہ امر مقتضائے وقت اور ضرورت پر موقوف ہے۔ امام اور حاکم وقت ضرورت کے لحاظ سے جس کو چاہے انتخاب کر سکتا ہے۔

ایک اور مسئلہ جس میں امام ابوحنیفہ اور دوسرے ائمہ مختلف ہیں یہ ہے۔ کہ چارپایوں کی زکوۃ ادا کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک زکوۃ میں جانور یا اُس کی قیمت ادا کیجا سکتی ہے۔

امام شافعی کے نزدیک "قیمت ادا کرنے سے زکوۃ ادا ہی نہیں ہو سکتی"۔ حالانکہ زکوۃ کی غرض حاصل ہونے میں جانور اور اُس کی قیمت دونو برابر ہیں۔ اس لئے شارع نے بھی کوئی تخصیص نہیں فرمائی۔

ان مسائل کے سوا عبادات کے اور سیکڑوں مسائل ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حنفی مسائل میں ہر جگہ مصالح اور اسرار کی خصوصیت ملحوظ ہے۔ لیکن ہم تطویل کے لحاظ سے اُن سب کی تفصیل نہیں کر سکتے۔ معاملات کے مسائل میں یہ عقدہ زیادہ حل ہو جاتا ہے۔ اور صاف نظر آتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب کس قدر مصالح اور اسرار کے موافق ہے۔

(۲) دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حنفی فقہ بہ نسبت تمام اور فقہوں کے نہایت آسان اور لیسیر التعمیل ہے۔

قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے "کہ خدا تم لوگوں کے ساتھ آسانی چاہتا ہے۔ سختی نہیں چاہتا"۔

رسول اللہ کا قول ہے کہ "میں نرم اور آسان شریعت لیکر آیا ہوں"۔ بے شبہ اسلام کو تمام اور مذہبوں کے مقابلہ میں یہ فخر حاصل ہے کہ وہ رہبانیت سے نہایت بعید ہے۔ اُس میں عبادات شاقہ نہیں ہیں۔ اُسکے مسائل آسان اور لیسیر التعمیل ہیں۔ حنفی فقہ کو بھی اور فقہوں پر یہی ترجیح حاصل ہے۔

حنفی فقہ کا آسان اور وسیع ہونا ایسا متعارف ہے کہ شعراء اور مصنفین اُس کو

ضرب المثل کے طور پر ذکر کرتے ہیں - انوری نے جو ایک فحاش اور بدزبان شاعر تھا - اگرچہ بُرے موقع پر اسکا استعمال کیا اور کہا - ع چوں رخصتہائے بوحنیفہ - تاہم اصل مدعا کا ثبوت اُس کے کلام سے بھی ہوتا ہے - عبادات اور معاملات کا کوئی باب کوئی فصل - لے لو یہ تفرقہ صاف نظر آتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مسائل ایسے آسان اور نرم ہیں - جو شریعت سہلہ کی شان ہے - بخلاف اس کے اور ائمہ کے بہت سے احکام نہایت سخت اور عسیر التعمیل ہیں مثلاً کتاب الجنایات و کتاب الحدود کے مسائل - انہی میں سے سرقہ کے احکام ہیں - چنانچہ ہم اُسکے چند جزئیات نمونہ کے طور پر یہاں لکھتے ہیں -

اس قدر تو سب کے نزدیک مسلم ہے کہ سرقہ کی سزا - قطع ید یعنے ہاتھ کاٹنا ہے - لیکن مجتہدین نے سرقہ کی تعریف میں چند شرطیں اور قیدیں لگائی ہیں - جن کے بغیر قطع ید کی سزا نہیں ہوسکتی - ان شروط کے لحاظ سے احکام پر جو اثر پڑتا ہے - وہ ذیل کی جزئیات سے معلوم ہوگا - جس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب کسقدر آسان - اور تمدن وشائستگی کے کس قدر موافق ہے -

امام ابوحنیفہ کے مسائل	اور ائمہ کے مسائل
نصاب سرقہ - کم از کم ایک اشرفی ہے -	ایک اشرفی کا رُبع -
اگر ایک نصاب متعدد چور دنکا ساجھا ہے - تو کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جائیگا	امام احمد کے نزدیک ہر ایک کا ہاتھ کاٹا جائیگا -
نادان بچہ پر قطع ید نہیں -	امام مالک کے نزدیک ہے -
کفن چور پر قطع ید نہیں -	اور ائمہ کے نزدیک ہے -
زوجین میں سے اگر ایک دوسرے کا مال چرائے تو قطع ید نہیں -	امام مالک کے نزدیک ہے -
بیٹا باپ کا مال چرائے - تو قطع ید نہیں -	امام مالک کے نزدیک ہے -
قرابت قریبہ والے مثلاً چچا - بھائی وغیرہ پر قطع ید نہیں -	اور ائمہ کے نزدیک ہے -
ایک شخص کسی سے کوئی چیز مستعار لیکر - انکار کر گیا - تو قطع ید نہیں -	اور ائمہ کے نزدیک ہے -
ایک شخص نے ایک چیز چرائی پھر بذریعہ ہبہ	اور ائمہ کے نزدیک ہے -

یا بیع اُس کا مالک ہوگیا۔ تو قطع ید نہیں۔	
غیر مذہب والے جو مستامن ہوکر اسلام کی عملداری میں رہتے ہیں۔ اُن پر قطع ید نہیں۔	اور ائمہ کے نزدیک ہے۔
قرآن مجید کے سرقہ پر قطع ید نہیں۔	امام شافعی و مالک کے نزدیک ہے۔
لکڑی یا جو چیزیں جلد خراب ہو جاتی ہیں۔ انکے سرقہ سے قطع ید لازم نہیں آتا۔	اور ائمہ کے نزدیک لازم آتا ہے۔

فقہ کا ایک بڑا حصہ کتاب الحظر والاباحۃ ہے۔ یعنی حرام و حلال۔ جائز و ناجائز کی تفصیل اس باب میں یہ دعوے اور زیادہ واضح ہوجاتا ہے۔ اور ائمہ کے بہت سے ایسے مسئلے ہیں۔ جن کی پابندی کیجائے تو زندگی دشوار ہوجائے۔ بخلاف اس کے امام ابوحنیفہ کے احکام نہایت آسان اور سہل ہیں۔ مثلاً امام شافعی کے نزدیک جو پانی اپلوں کی آگ سے گرم کیا گیا ہو۔ اُس سے غسل اور وضو ناجائز ہے۔ اسی طرح مٹی کے برتن جو اپلوں کی آگ سے پکائے گئے ہوں۔ اُن میں کھانا ناجائز ہے۔ رانگ۔ کانچ۔ بلور۔ عقیق کے برتنوں کا استعمال ناجائز ہے۔ مثلاً پشمینہ۔ سمور۔ پوستین وغیرہ کا استعمال ناجائز ہے اور اُس کو پہنکر نماز نہیں ہوسکتی۔ برتن یا کرسیاں اور زین وغیرہ جن پر چاندی کا کام ہو اُنکا استعمال ناجائز ہے۔ بیع بالمعاطاۃ۔ یعنے خرید و فروخت کا عام طریقہ جسمیں بعت و اشتریت کی تصریح نہیں کیجاتی۔ ناجائز ہے۔ ان تمام مسائل میں امام ابوحنیفہ کا مذہب۔ امام شافعی سے مخالف ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ حنفی فقہ۔ دوسرے فقہوں کیطرح تنگ اور سخت گیر نہیں ہے۔

(۳) فقہ کا بہت بڑا حصہ جس سے دنیوی ضرورتیں متعلق ہیں معاملات کا حصہ ہے۔ اور یہی وہ موقع ہے جہاں۔ ہر مجتہد کی دقت نظر اور نکتہ شناسی کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے امام ابوحنیفہ کے زمانہ تک معاملات کے احکام ایسے ابتدائی حالت میں تھے کہ متمدن اور تہذیب یافتہ ملک کے لئے بالکل ناکافی تھے۔ نہ معاہدات کے استحکام کے قاعدے منضبط تھے۔ نہ دستاویزات وغیرہ کی تحریر کا اصول قائم ہوا تھا۔ نہ فصل قضایا ادائے شہادت کا کوئی باقاعدہ طریقہ تھا۔ امام ابوحنیفہ پہلے شخص ہیں جو ان چیزوں کو قانون کی صورت میں لائے۔ لیکن افسوس ہے کہ جو مجتہدین اُن کے بعد ہوئے۔ انہوں نے بجائے اس کے کہ اُس کو اور وسعت دیتے۔ اُسے غیر تمدنی حالت کو قائم رکھنا چاہا۔ جس کا منشا وہ زاہدانہ خیالات تھے جو علمائے مذہب کے دماغوں میں جاگزین تھے۔ ایک مشہور محدث نے فقہا پر طعن کیا ہے کہ "ان لوگوں کے نزدیک جب کسی زمین

کا دعوے کسی عدالت میں پیش کیا جائے۔ تو ضرور ہے۔ کہ عرضی دعوے میں زمین کا موقع بتایا جائے۔ اُسکی حدود اربعہ دکھائی جائیں۔ حیثیت اور صورت کی تفصیل ہو۔ حالانکہ رسول اللہ یا صحابہ کے زمانہ میں ان جزئیات اور قیدوں کا نام و نشان بھی نہ تھا۔" محدث مذکور کے نزدیک یہ بڑے الزام کی بات ہے۔ لیکن اگر اُن کو کسی ترقی یافتہ ملک میں رہنے کا اتفاق ہوتا اور معاملات سے بھی کام پڑتا تو معلوم ہوتا کہ جن چیزوں کو وہ الزام کی بات سمجھتے ہیں اُن کے بغیر زندگی بسر کرنی مشکل ہے۔

امام شافعی۔ ہبہ کے لئے قبضہ کو ضروری نہیں سمجھتے۔ شفعہ ہمسایہ کو جائز نہیں رکھتے تمام معاملات میں مستور الحال کی شہادت کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ گواہان نکاح ہبہ کے لئے ثقہ اور عادل ہونے کی قید ضروری سمجھتے ہیں۔ ذمیوں کے باہمی معاملات میں بھی اُن کی شہادت جائز نہیں قرار دیتے بے شبہہ یہ باتیں اُن ممالک میں آسانی سے چل سکتی ہیں جہاں تمدن نے وسعت نہیں حاصل کی ہے اور معاملات کی صورتیں بالکل سادہ اور نیچرل حالت میں ہیں۔ لیکن جن ملکوں میں تمدن نے ترقی حاصل کی ہو معاملات کی مختلف اور پیچ در پیچ صورتیں پیدا ہوتی جاتی ہوں۔ حقوق کی تحدید اور انضباط کے بغیر چارہ نہ ہو۔ وہاں ایسے احکام کا قائم رہنا آسان نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُن تمام مسائل میں امام ابوحنیفہ امام شافعی سے مخالف ہیں۔ مورخ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ امام مالک کا مذہب اُنہی ممالک میں رواج پا سکا جہاں تمدن نے وسعت نہیں حاصل کی تھی[۱]۔" اُس کی وجہ یہی ہے کہ امام مالک کے مسائل میں اصول تمدن کی رعایت نہ تھی۔

امام ابوحنیفہ نے جس وقت نظر اور نکتہ شناسی کے ساتھ معاملات کے احکام منضبط کئے اُسکا صحیح اندازہ تو اُسوقت ہو سکتا ہے کہ معاملات کے چند ابواب پر ایک مفصل ریویو لکھا جائے۔ لیکن ایسی تفصیل کے لئے نہ وقت مساعد ہے نہ اس مختصر کتاب میں اُسکی گنجائش ہے تاہم ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ اس لئے نمونہ کے طور پر ہم صرف مسائل نکاح ذکر کرتے ہیں جو عبادات اور معاملات دونوں کا جامع ہے۔

نکاح کو اگرچہ فقہا نے عبادات میں شامل کیا ہے۔ لیکن یہ صرف ایک اصطلاح ہے ورنہ نکاح۔ بوجہ اسکے کہ تمدن و معاشرت کے بڑے بڑے نتائج اُسپر متفرع ہوتے ہیں معاملات کا نہایت ضروری حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

مسائل نکاح کے انتخاب کی ایک یہ بھی وجہ ہے۔ کہ بعض بعض یورپین مصنفوں نے

---

[۱] اس قول کو ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ ۱۲

یہ دعوے کیا ہے کہ حنفی فقہ کے مسائل نکاح نہایت وحشیانہ اور ظالمانہ ہیں۔ لیکن ہم اس بحث میں دکھائینگے کہ آج مہذب سے مہذب ملکوں میں بھی نکاح کے قواعد حنفی فقہ سے عمدہ تر نہیں ہیں۔ بنتھم نے اپنی کتاب یوٹلٹی میں لکھا ہے کہ "رومن لا کے بموجب قواعد نکاح ایک مجموعہ ظلم ہیں"۔

لیکن ہم ثابت کر دینگے کہ حنفی فقہ کے بموجب قواعد نکاح مجموعہ انصاف ہیں۔ غالباً اس بحث سے اُن لوگوں کے خیالات کی بھی کسیقدر اصلاح ہوگی جو غلطی سے یہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ کہ حنفی فقہ رومن لا سے ماخوذ ہے۔

نکاح وازدواج۔ تمدن اور معاشرت کا نہایت وسیع حصہ ہے۔ نکاح بقول ایک حکیم کے جماعتوں کا شیرازہ تہذیب کی اصل تمدن کی بنیاد ہے"۔ اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ جس مقنن نے اُس کے اصول وضوابط کی عمدہ توضیح یا تشریح کی وہ قانون تمدن کا بہت بڑا نکتہ شناس ہے۔ اگرچہ امام ابوحنیفہ ان اصول وضوابط کے موجد نہیں ہیں۔ شارع نے خود اُس کے مہمات مسائل بتا دئے تھے۔ تاہم جس نکتہ سنجی کے ساتھ اُنھوں نے ان اصول کی تشریح کی اور اُس پر احکام متفرع کئے وہ خود ایک بڑے مقنن کا کام تھا۔ شارع کا کلام کہیں مجمل واقع ہوا تھا۔ کہیں محتمل المعنیین۔ بعض جگہ صرف اشارے تھے۔ خاصکر جزئیات بہت کم مذکور تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ نکاح کے اکثر مسائل میں مجتہدین کی مختلف رائیں قائم ہوگئیں۔ یہی مختلف فیہ مسائل ہیں جنمیں امام صاحب کے اجتہاد کے جوہر کھلتے ہیں۔ اور صاف نظر آتا ہے کہ جسطرح اُنھوں نے ان موقعوں پر شارع کے اجمال کی تفصیل کی احتمالات کے محمل معین کئے۔ اشاروں کی تصریحیں بتائیں۔ جزئیات کی تفریع کی۔ وہ انہیں کا کام تھا جنھں اور مجتہدین کسی طرح انکی ہمسری نہیں کر سکتے۔

نکاح کے مسائل جن اصول پر متفرع ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) کن لوگوں کے ساتھ نکاح ہونا چاہیئے۔

(۲) معاملہ نکاح کس کے اختیار سے ہونا چاہیئے۔

(۳) اُسکی بقا وثبات کا استحکام کس حد تک ضروری ہے۔

(۴) فریقین کے حقوق کیا قرار دئے جائیں۔

(۵) نکاح کن دستورات اور رسوم کے ساتھ عمل میں آئے۔

یہ امر کہ نکاح کی وسعت کو کسی حد تک محدود کیا جائے۔ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ تمام مذاہب میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ ہر قوم نے چند محرّمات قرار دئے ہیں۔ جن کے

ساتھ ازدواج کو ناجائز قرار دیا ہے اور یہ محرمات قریباً تمام مذہبوں میں مشترک ہیں۔ جس کی وجہ یہی ہے کہ یہ امر نہایت صریح اصول عقلی پر مبنی ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ اور فلاسفر بنتھم نے کتاب پولٹکس میں محرمات کی حرمت کے جو دلائل قائم کئے ہیں بالکل مشترک ہیں چونکہ یہ امر بالکل اصول فطرت کے مطابق ہے۔ اور قرآن مجید میں محرمات کے نام تصریحاً مذکور ہیں۔ اسلئے اصل مسئلہ میں تمام مجتہدین کا اتفاق رہا۔ لیکن جو جزئیات ظاہر نص کے ذیل میں نہیں آئیں۔ اُنمیں اختلاف پیدا ہو گیا۔ انہیں میں حرمت بالزنا کا مسئلہ ہے جو امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے اختلاف کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ امام شافعی کا مذہب ہے کہ زنا سے حرمت کے احکام نہیں پیدا ہوتے۔ مثلاً باپ نے کسی عورت سے زنا کیا تو بیٹے کا نکاح اُس عورت سے ناجائز نہیں ہے۔ امام شافعی نے اس کو یہاں تک وسعت دی ہے کہ ایک شخص نے اگر کسی عورت کے ساتھ زنا کیا اور اُس سے لڑکی پیدا ہوئی تو خود وہ شخص اُس لڑکی سے نکاح کر سکتا ہے۔ اُن کی دلیل ہے۔ کہ زنا ایک حرام فعل ہے۔ اسلئے وہ حرام کو حلال نہیں کر سکتا۔ امام ابوحنیفہ اس کے بالکل مخالف ہیں۔ اُن کے نزدیک مقاربت کے ذریعہ سے مرد اور عورت کے تعلقات پر جو فطری اثر پڑتا ہے وہ نکاح پر محدود نہیں ہے اور یہ بالکل صحیح ہے محرمات کی حرمت جس اصول پر مبنی ہے۔ اُس نکاح کے ساتھ خصوصیت نہیں۔ اپنے نطفہ سے جو اولاد ہو گو زنا ہی سے ہو اُس کے ساتھ نکاح و مقاربت کا جائز رکھنا۔ بالکل اصول فطرت کے خلاف ہے۔ باپ کی موطوءہ کا بھی یہی حال ہے وعلیٰ ہذا القیاس۔ خود قرآن مجید میں اسکے اشارے موجود ہیں لیکن چونکہ یہاں نقلی بحث نہیں۔ ہم اُسکا ذکر نہیں کرتے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ معاملہ نکاح کا مختار کون ہے؟ یہ ایک نہایت مہتم بالشان سوال ہے اور نکاح کے اثر کی خوبی یا بُرائی بہت کچھ اسی امر پر منحصر ہے۔ امام شافعی۔ و امام احمد حنبل کے نزدیک عورت گو عاقلہ بالغہ ہو۔ نکاح کے بارہ میں خود مختار نہیں ہے یعنے کسی حال میں وہ اپنا نکاح آپ نہیں کر سکتی۔ بلکہ ولی کی محتاج ہے ان بزرگوں نے ایک طرف تو عورت کو اسقدر مجبور کیا۔ دوسری طرف ولی کو ایسے وسیع اختیارات دئے کہ وہ زبردستی جس شخص کے ساتھ چاہے نکاح باندھ دے عورت کسی حال میں انکار نہیں کر سکتی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک بالغہ عورت اپنے نکاح کی آپ مختار ہے۔ بلکہ اگر نابالغی کی حالت میں ولی نے نکاح کر دیا ہو تو بالغ ہو کر وہ نکاح کو فسخ کر سکتی ہے۔

اس اختلاف کی اصلی بنیاد عورتوں کے حقوق کے مسئلہ پر مبنی ہے۔ تمام مذہبوں میں

عورتوں کی حالت نہایت پست قرار دیگئی ہے اور اُن کے حقوق نہایت تنگدلی سے قائم کئے گئے ہیں۔ ہندوؤں اور عیسائیوں کے ہاں عورت کو میراث نہیں ملتی۔ خود عرب میں اسلام سے پہلے یہی دستور تھا۔ اسطرح کے اور بہت سے امور ہیں۔ جن سے عورتوں کا کم رتبہ ہونا ثابت ہوتا ہے لیکن اسلام نے مردوں اور عورتوں کے حقوق یکساں درجہ پر قائم کئے۔ اور فرمایا للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن امام ابوحنیفہ نے تمام مسائل میں اس اصول مساوات کو مرعی رکھا ہے۔ اور یہی خصوصیت ہے۔ جو اس باب میں اُن کی فقہ کو اور ائمہ کی فقہ سے ممتاز کرتی ہے۔ مثلاً امام ابوحنیفہ کے نزدیک نکاح۔ طلاق۔ عتق وغیرہ معاملات میں عورتوں کی شہادت اُسی طرح معتبر ہے جسطرح مرد کی۔ بخلاف اس کے اور ائمہ مجتہدین کے نزدیک عورتوں کی شہادت کا اعتبار نہیں۔ بعض معاملات میں اُن بزرگوں نے عورتوں کی شہادت جائز بھی رکھی ہے تو یہ قید بھی لگائی ہے کہ دو سے کم نہ ہوں۔ اور امام شافعی کے نزدیک تو چار سے کم کا کسی حالت میں اعتبار نہیں۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جس طرح ایک مرد کی گواہی معتبر ہے عورت کی بھی ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت منصب قضا پر مامور کیجا سکتی ہے۔ لیکن اور ائمہ مخالف ہیں۔ اسی بنا پر اُن کے نزدیک جب مرد نکاح کے معاملہ میں خود مختار قرار دیا گیا ہے۔ تو عورت کو بھی ایسا ہی اختیار دینا چاہیئے۔

اس عام اصول مساوات کے قطع نظر۔ صورت متنازعہ میں خصوصیت کی وجہ یہ بھی ہے۔ کہ نکاح کا معاملہ۔ تمام معاملات پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ نکاح ایک ایسا تعلق ہے جس کا اثر نہایت وسیع ہے اور زندگی کے اخیر وقت تک قائم رہتا ہے۔ اس لئے ایسے معاملہ میں ایک فریق کو بالکل بے اختیار رکھنا نہایت ناانصافی ہے۔

اس بحث میں امام شافعی کا مدار محض نقلی دلیلوں پر ہے۔ لیکن اس میدان میں بھی امام ابوحنیفہ اُن سے پیچھے نہیں۔ اگر امام شافعی کو لانکاح الابولی۔ پر استدلال ہے تو امام صاحب کیطرف الثیب احق بنفسھا من ولیھا والبکر تستاذن فی نفسھا۔ موجود ہے۔ لیکن اس بحث کا یہ موقع نہیں۔

تیسری بحث یہ ہے کہ معاملۂ نکاح کا استحکام و بقا کس حد تک ضروری ہے۔ عقد نکاح کی خوبی کی نسبت جو کچھ کہا گیا ہے یعنی یہ کہ وہ تمدن کی بنیاد اور جماعتوں کا شیرازہ ہے۔ اُسی حالت میں ہے۔ جب وہ ایک مضبوط اور دیرپا معاملہ قرار دیا جائے۔ ورنہ وہ صرف قضائے شہوت کا ایک ذریعہ ہے۔ امام ابوحنیفہ نے اس اصول کو نہایت قوت کے ساتھ ملحوظ رکھا ہے۔ انہوں نے طریقۂ انعقاد۔ تعیین مہر۔ ایقاع طلاق۔ نفاذ خلع کے جو قاعدے قرار

دیئے ہیں اُن سب میں اس اصول سے کام لیا ہے۔

اسباب میں سب سے مقدم اُن کا یہ مسئلہ ہے کہ الطلاق مع استقامۃ حال الزوجین حرام۔ یعنی جب تک زوجین کی حالت استقامت پر ہے۔ طلاق دینا حرام ہے۔ ضرورت اور مجبوری کی حالت میں طلاق کو جائز قرار دیا ہے۔ تو اُس کا طریقہ ایسا رکھا ہے۔ جس سے اصلاح اور رجعت کی امید منقطع نہ ہو یعنی یہ کہ تین بار کرکے طلاق دے اور ہر طلاق میں ایک مہینہ کا فاصلہ تاکہ اس اثنا میں شوہر کو اپنے ارادے کے فیصل کرنے کے لئے کافی وقت ملے اگر وہ اس ارادے سے باز آنا چاہے تو باز آسکے۔ اور مستحب یہی ہے کہ باز آئے۔ اس وسیع مدت میں بھی اگر اصلاح و آشتی کی توقع نہ ہو۔ اور تجربہ سے ثابت ہو جائے کہ فریقین کی برہمی کسی طرح اصلاح پذیر نہیں ہے۔ تو مجبوراً طلاق دے۔ طلاق کے بعد اُس کو مہر ادا کرنا ہوگا اور تین مہینہ تک زوجہ کی خورد و نوش کی کفالت کرنی ہوگی۔ اس سے یہ مقصد ہے کہ جب تک وہ دوسرا شوہر نہ پیدا کر سکے۔ گزر اور بسر اوقات کے لئے اُسکو تکلیف نہ اُٹھانی پڑے۔ اور مہر کی رقم عام مصارف میں کام آئے۔ اسباب میں امام صاحب کے مسائل جو اور آئمہ سے مختلف ہیں۔ ہم اُن کو ذیل میں یکجائی طور پر لکھتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہو سکے گا۔ کہ امام صاحب نے معاملہ نکاح کو کیسا مہتم بالشان اور مضبوط معاملہ سمجھا ہے۔ اور ہر حالت میں اُس کے قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔

(۱) جب تک فریقین کی حالت میں استقامت ہو طلاق حرام ہے۔	امام شافعی کے نزدیک حرام نہیں۔
(۲) ایک بار تین طلاق دینا حرام ہے اور اُسکا مرتکب عاصی ہے۔	امام شافعی و امام احمد حنبل کے نزدیک کچھ مضائقہ نہیں۔
(۳) مہر کی تعداد کسی حالت میں دس درہم سے کم نہیں ہو سکتی۔ اس سے یہ مقصد ہے۔ کہ مرد کو فسخ طلاق پر آسانی سے جرأت نہ ہو کیونکہ یہ تعداد غریب اور مفلس کے لئے ہے جسکو اس رقم کا ادا کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے امیروں کو دو چار ہزار کا ادا کرنا۔	امام شافعی و امام احمد بن حنبل کے نزدیک ایک حبہ بھی مہر ہو سکتا ہے۔ جسکا نتیجہ یہ ہے کہ مرد بیدریغ بے سوچے سمجھے طلاق دینے پر جرأت کر سکتا ہے اور عورت کو بوجہ اس کے کہ تفریق کے بعد محض مفلس اور نادار رہ گئی تکلیف کا احتمال ہے۔
(۴) خلوت صحیحہ سے پورا مہر واجب ہو جاتا ہے	امام شافعی کے نزدیک نصف واجب ہوتا ہے
(۵) جسمانی بیماریاں مثل برص وغیرہ فسخ نکاح کا سبب	امام شافعی و مالک کے نزدیک ان کی

نہیں ہوسکتیں۔	وجہ سے فسخ نکاح ہوسکتا ہے۔
(۶) اگر کوئی شخص مرض الموت میں طلاق دے اور عدت کے زمانہ میں اُسکا انتقال ہوجائے تو عورت کو میراث ملیگی۔	امام شافعی کے نزدیک نہیں ملیگی۔
(۷) طلاق رجعی کیحالت میں وطی حرام نہیں ہے یعنی زوجیت کا تعلق ایسی معمولی بیزاری سے منقطع نہیں ہوتا۔	امام شافعی کے نزدیک حرام ہے گویا وہ بائنہ ہوچکی
رجعت کیلئے اظہار زبانی کی ضرورت نہیں، ہر فعل جس سے رضامندی ظاہر ہو رجعت کے لیے کافی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسانی دیجائے تاکہ رجعت بادنے مسامحت ہوسکے۔	امام شافعی کے نزدیک بغیر اقرار و اظہار کے رجعت ہو ہی نہیں سکتی۔
(۹) رجعت پر گواہ مقرر کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ورنہ بعض حالتوں میں گواہ نہ مل سکے اور رجعت کی مدت قریب الانقضا ہے۔ تو طلاق بائن ہوجائے گی۔	امام مالک کے نزدیک بغیر استشہاد کے رجعت صحیح نہیں ہے۔

نکاح کے قواعد مرتب ہونے کے لئے یہ ایک نہایت ضروری امر ہے۔ کہ فریقین کے حقوق نہایت فیاضی اور اعتدال کے ساتھ قائم کئے جائیں۔ عورتوں کو مردوں کے ساتھ جن باتوں میں مساوات حاصل ہے وہ باطل نہ ہونے پائے۔ کیونکہ نکاح سے عورت کو اپنے امن وراحت کی توقع ہونی چاہیے۔ نہ یہ کہ اُسکے اصلی حقوق میں زوال آجائے۔ یہ اسلام کی خاص فیاضی ہے۔ جسکی نظیر اور کسی مذہب میں نہیں ملسکتی کہ اُس نے معاملۂ نکاح میں عورتوں کے حقوق نہایت وسعت کے ساتھ قائم کیے ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے اس اصول کو تمام مسائل میں محفوظ رکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان مسائل میں جہاں اور ائمہ نے اُن سے اختلاف کیا ہے صریح غلطی کی ہے۔ مثلاً خلع کا معاملہ جو طلاق سے مشابہ ہے۔

اسباب میں تو سب ائمہ متفق ہیں کہ جسطرح مرد کو طلاق کا حق دیا گیا ہے۔ اسیطرح عورت کو کچھ معاوضہ دیکر خلع کا اختیار ہے۔ لیکن اس امر میں اختلاف ہے۔ کہ اس معاوضہ کی کیا صورت ہے۔ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ اگر عورت کا قصور ہے۔ اور خود اُسکی بدسلوکی تفریق کا سبب ہوئی ہے تو اُس مہر کی مقدار کی برابر شوہر کو معاوضہ دینا چاہیے۔ مرد اگر اس مقدار

سے زیادہ معاوضہ کا خواہاں ہو تو مکروہ ہے۔ لیکن اگر مرد کی شرارت ہے۔ تو عورت بغیر کسی جرمانہ ادا کرنے کے خلع کی مستحق ہے اور مرد کو خلع کا معاوضہ لینا مکروہ ہے۔ امام شافعی و امام مالک کے نزدیک اولاً مرد جسقدر چاہے۔ معاوضہ لے سکتا ہے اور اسپر عورتوں کو مجبور کر سکتا ہے اس سے بڑھکر یہ کہ گو شرارت اور زیادتی مرد کی ہو تاہم وہ عورت سے معاوضہ لے سکتا ہے اور جسقدر چاہے لے سکتا ہے۔ حالانکہ یہ صریح ناانصافی ہے کہ عورت بیگناہ بھی ہو۔ اور معاوضہ بھی ادا کرے۔

اخیر بحث یہ ہے کہ نکاح کن دستورات کے ساتھ عمل میں آئے۔ ان رسوم میں صرف دو مقصود پیش نظر ہیں۔ اوّل یہ کہ فریقین کی رضامندی محقق ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ واقعۂ عقد کا اشتہار ہو جائے۔ ان اغراض کے لحاظ سے۔ امام ابوحنیفہ نے نہایت مناسب قاعدے قرار دیئے ہیں۔ یعنی یہ کہ فریقین ایسے الفاظ استعمال کریں جن سے ظاہر ہو کہ انھوں نے معاملۂ نکاح کو قبول کر لیا ہے اور یہ عقد نکاح دو گواہوں کے سامنے عمل میں آئے۔ یہ دونوں سادہ اور آسان شرطیں ہیں جو ہر موقع پر استعمال کی جا سکتی ہیں۔ لیکن بعض ائمہ نے بخلاف اس کے ان شرطوں میں ایسی سخت قیدیں لگائی ہیں جن کی پابندی نہایت مشکل ہے امام شافعی کا مذہب ہے کہ گواہان نکاح عادل ہونے چاہئیں ورنہ نکاح صحیح نہیں۔ عدالت کے جو معنی مجتہدین اور خاصکر امام شافعی نے بیان کئے ہیں اُس کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک آدھ عادل ہو سکتا ہے۔ اسلئے اگر یہ قید ضروری سمجھی جائے تو صحیح نکاح کا وجود ڈھونڈے سے نہ مل سکے۔ امام شافعی و امام احمد حنبل کے نزدیک ضرور ہے۔ کہ گواہ مرد ہوں۔ لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورتیں بھی گواہ ہو سکتی ہیں اور یہی قرین عقل بھی ہے امام شافعی نے یہ بھی قید لگائی ہے کہ خاص تزویج کے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ حالانکہ خاص الفاظ کی پابندی کا کچھ حاصل نہیں۔ جو الفاظ اس مفہوم پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً ہبہ تملیک وغیرہ سب عقد نکاح کے لئے کافی ہیں۔

(۹) ایک بڑی خصوصیت جو حنفی فقہ کو حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اُس نے ذمیوں یعنی اُن لوگوں کو جو مسلمان نہیں ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی حکومت میں مطیعانہ رہتے ہیں۔ نہایت فیاضی اور آزادی سے حقوق بخشے ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے۔ جسکی نظیر کسی امام اور مجتہد کے مسائل میں نہیں ملتی۔ اگرچہ ذمیوں کے حقوق کی حفاظت خود شارع کی ہدایتوں میں جا بجا موجود ہے لیکن چونکہ وہ عام کلیات ہیں۔ اس کے علاوہ شارع کے بعض اقوال بظاہر اس کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے اُنکی تعبیر مطالب میں اختلافات پیدا ہوئے ہیں تاہم کچھ شبہ نہیں

کہ جو تعبیر امام ابوحنیفہ نے کی وہی صحیح تعبیر تھی اسلام نہایت وسیع دنیا پر حکمراں رہا ہے۔ اور اُسکی حدود حکومت میں سیکڑوں غیر قومیں آباد تھیں اور ہیں۔ اسلئے اگر اُن کے حقوق کی واجبی حفاظت نہ کیجائے تو ایکدن بھی امن قائم نہیں رہ سکتا۔ امام ابوحنیفہ نے ذمیوں کو جو حقوق دئے ہیں دنیا میں کسی گورنمنٹ نے کبھی کسی غیر قوم کو نہیں دئے۔ یورپ جس کو اپنے قانون انصاف پر بڑا ناز ہے۔ بیشک زبانی دعوے کر سکتا ہے۔ لیکن عملی مثالین نہیں پیش کر سکتا۔ حالانکہ امام ابوحنیفہ کے یہ احکام۔ اسلامی گورنمنٹوں میں عموماً نافذ تھے اور خاصکر ہارون الرشید اعظم کی وسیع حکومت انہیں احکام پر قائم تھی۔

سب سے بڑا مسئلہ قتل و قصاص کا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ذمیوں کا خون مسلمانوں کے خون کے برابر ہے۔ یعنی اگر مسلمان۔ ذمی کو عمداً قتل کر ڈالے تو مسلمان بھی اُس کے بدلے قتل کیا جائیگا۔ اور اگر غلطی سے کیا ہے تو جو خون بہا مسلمان کے قتل بالخطا سے لازم آتا ہے۔ وہی ذمی کے قتل سے بھی لازم آئیگا۔

تذکرہ امام رازی نے اپنی کتاب مناقب الشافعی میں حنفیوں کو طعنہ دیا ہے۔ کہ اُن کے نزدیک ابوبکر صدیقؓ کا خون اور ایک ذلیل ذمی کا خون برابر ہے۔ یعنی "اگر ابوبکر صدیقؓ بجرم کسی ذمی کو قتل کر ڈالتے تو حنفیوں کے نزدیک وہ بھی قتل کئے جانے کے مستحق تھے"۔ حنفیوں نے اس مسئلہ کی تعمیم میں کہین یہ مثال نہیں دی ہے۔ امام رازی نے اس غرض سے کہ وہ اس مسئلہ کو بدنما کر کے دکھائیں۔ خود یہ مثال فرض کی ہے۔ لیکن ہم فخر کے ساتھ اس طعنہ کو قبول کرتے ہیں۔ بے شبہ انصاف اور حق کی حکومت مین۔ شاہ و گدا۔ مقبول و مردود کا ایک رتبہ ہے۔ بے شبہ یہ اسلام کی بڑی فیاضی ہے کہ اُس نے اپنی رعایا کو اپنی برابر سمجھا۔ اسلام کو اس انصاف پر ناز ہو سکتا ہے۔ اگر امام رازی کو عار آتی ہے تو آئے خود صحابہؓ کا کیا قول اور کیا عمل تھا، حضرت علیؓ کا قول ہے۔ من کانت له ذمتنا فدمه کدمنا و دیته کدیتنا " یعنی ذمی کا خون ہمارا خون ہے اور اُس کی دیت ہماری دیت ہے"۔ حضرت علیؓ پر موقوف نہین تمام مہاجرینؓ و انصارؓ کا یہی قول تھا اور اسی پر عمل تھا۔ عبیداللہؓ جو حضرت عمر فاروقؓ کے فرزند تھے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کے زخمی ہونے کے وقت دو شخصوں کو جو کافر تھے اور جن پر اُن کو شبہ تھا قتل کر ڈالا۔ جب حضرت عثمانؓ مسند خلافت پر بیٹھے تو انہوں نے مہاجرینؓ و انصارؓ کو بلایا اور اس بارہ میں رائے پوچھی۔ تمام مہاجرینؓ نے بالاتفاق کہا کہ عبیداللہ کو قتل کرنا چاہیئے۔

امام ابوحنیفہ نے ذمیوں کے لئے اور جو قواعد مقرر کئے وہ نہایت فیاضانہ قواعد ہیں وہ

تجارت میں مسلمانوں کیطرح آزاد ہیں۔ ہر قسم کی تجارت کر سکتے ہیں تو اور اُن سے اُسی شرح سے ٹیکس لیا جائیگا جسطرح مسلمانوں سے لیا جاتا ہے۔ جزیہ جو اُن کی محافظت کا ٹیکس ہے اُس کی شرح حسب حیثیت قائم کیجائیگی۔ مفلس شخص جزیہ سے بالکل معاف ہے۔ اگر کوئی شخص جزیہ کا باقیدار ہو کر مرجاوے تو جزیہ ساقط ہوجائیگا۔ ذمیوں کے معاملات انہیں کی شریعت کے موافق فیصل کیئے جائینگے۔ یہانتک کہ مثلاً اگر کسی مجوسی نے اپنی بیٹی سے نکاح کیا تو اسلامی گورنمنٹ اس نکاح کو اُسکی شریعت کے موافق صحیح تسلیم کرے گی۔ ذمیوں کی شہادت اُن کے باہمی مقدمات میں مقبول ہوگی۔ ذمیوں کی اعزازی حالت یہ ہے۔ کہ وہ حرم محترم میں جا سکتے ہیں۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں آباد ہو سکتے ہیں۔ تمام مسجدوں میں بغیر اجازت حاصل کرنے کے داخل ہو سکتے ہیں بجز اُن خاص شہروں کے جو مسلمانوں نے آباد کیئے ہیں ہر جگہ وہ اپنی عبادت گاہ بنا سکتے ہیں۔ وہ اگر حربی کافروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہیں۔ تو سپہ سالار اُن پر اعتماد کر سکتا ہے۔ اور اُن سے ہر طرح کی اعانت لے سکتا ہے۔

اس قسم کے اور احکام ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے عموماً تمام معاملات میں ذمیوں کے حقوق مسلمانوں کے برابر قرار دیئے ہیں۔ بلکہ سچ یہ ہے۔ کہ بعض امور میں تو انہوں نے مسلمانوں سے زیادہ فیاضی کی ہے۔ مثلاً اس امر میں کہ ذمی کس حالت میں عہد سے باہر ہوجاتا ہے۔ اُن کا مذہب ہے۔ کہ بجز اُس حالت کے کہ اُن کے پاس جمعیت ہو اور وہ گورنمنٹ سے بمقابلہ پیش آئیں۔ اور کسی صورت میں اُن کے حقوق باطل نہیں ہوتے۔ مثلاً اگر کوئی ذمی جزیہ نہ ادا کرے۔ یا مسلمان عورت کے ساتھ زنا کا مرتکب ہو۔ یا کافروں کی جاسوسی کرے یا کسی مسلمان کو کفر کی ترغیب دے۔ یا خدا اور رسول کی شان میں بے ادبی کرے۔ تو ان تمام حالتوں میں وہ سزا کا مستحق ہوگا۔ لیکن باغی نہ سمجھا جائیگا۔ اور اُس کے حقوق باطل نہ ہونگے

اب اس کے مقابلہ میں اور ائمہ کے مسائل دیکھو امام شافعی کے نزدیک کسی مسلمان نے گو بجرم اور عمداً کسی ذمی کو قتل کیا ہوتا ہم وہ قصاص سے بری رہے گا۔ صرف دیت دینی ہوگی یعنے مالی معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ وہ بھی مسلمان کی دیت کی ایک ثلث اور امام مالک کے نزدیک نصف۔ تجارت میں یہ سختی ہے۔ کہ ذمی اگر تجارت کا مال ایک شہر سے دوسرے شہر کو لے جاوے تو سال میں جتنی بار لیجاوے ہر بار اُس سے نیا ٹیکس لیا جائیگا۔

جزیہ کے متعلق امام شافعی کا مذہب ہے کہ کسی حال میں ایک اشرفی سے کم نہیں ہو سکتا اور بوڑھا اندھا۔ اپاہج۔ مفلس۔ تارک الدنیا۔ تک بھی اُس سے معاف نہیں۔ بلکہ امام شافعی

سے ایک اور روایت ہے کہ جو شخص مفلس ہونے کی وجہ سے جزیہ نہیں ادا کر سکتا۔ وہ اسلام کی عملداری میں نہ رہنے پاوے۔ خراج جو اُن پر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مقرر کیا گیا تھا۔ اُس پر اضافہ ہو سکتا ہے مگر کسی صورت میں کمی نہیں ہو سکتی ذمیوں کی شہادت گو فریقین مقدمہ ذمی ہوں کسی حال میں مقبول نہیں۔ اس مسئلہ میں امام مالک و امام شافعی دونوں متفق الرائے ہیں ذمی کبھی حرم میں نہیں داخل ہو سکتا۔ اور نہ وہ مکہ اور مدینہ منورہ میں آباد ہو سکتا ہے امام شافعی کے نزدیک عام مسجدوں میں اجازت کے ساتھ داخل ہو سکتا ہے۔ لیکن امام مالک اور امام حنبل کے نزدیک عام مسجدوں میں اجازت نہیں ملسکتی۔ ذمی۔ اسلامی حدود حکومت میں کہیں اپنی عبادت گاہ نہیں بنا سکتا ہے۔ ذمیوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ اسلامی فوج میں شریک نہیں ہو سکتے۔ ذمی اگر کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے۔ یا کسی مسلمان عورت کے ساتھ زنا کا مرتکب ہو تو اُسیوقت اُس کے تمام حقوق باطل ہو جاوینگے اور وہ کافر حربی سمجھا جائیگا۔ یہ احکام بھی عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ خاص ہیں۔ ورنہ امام شافعی کے نزدیک بت پرستوں کو جزیہ ادا کرنے پر بھی اسلامی حدوں میں رہنے کی اجازت نہیں۔

یہ تمام احکام ایسے سخت ہیں جنکا تحمل ایک ضعیف سے ضعیف محکوم قوم بھی نہیں کر سکتی اور یہی وجہ ہے کہ امام شافعی وغیرہ کا مذہب سلطنت کے ساتھ نہ ہو سکا۔ مصر میں بے شبہہ ایک مدت تک گورنمنٹ کا مذہب شافعی تھا۔ لیکن اُسکا یہ نتیجہ تھا کہ عیسائی اور یہودی قومیں اکثر بغاوت کرتی رہتی تھیں۔

اس موقع پر یہ بتا دینا بھی ضرور ہے کہ فقہ حنفی کی کتابوں میں ذمیوں کے متعلق چند ایسے احکام بھی مذکور ہیں جو نہایت سختی اور تنگدلی پر مبنی ہیں۔ اور چونکہ وہ اس طریقہ سے ظاہر کئے گئے ہیں۔ کہ گویا وہ خاص امام ابوحنیفہ کے مسائل ہیں۔ اس لئے غیر قوموں کو مذہب حنفی پر بلکہ عموماً مذہب اسلام پر حملہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے۔ کہ "ذمیوں کو ضرور ہے کہ وہ وضع اور لباس میں مسلمانوں کی ہمسری نہ کریں۔ وہ گھوڑوں پر نہ سوار ہوں ہتھیار نہ لگائیں۔ زنار پہنیں۔ اُن کے گھروں پر علامت بنا دیجاوے۔ جس سے ظاہر ہو۔ کہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں" وغیرہ وغیرہ صاحب ہدایہ نے ان احکام کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ذمیوں کی تحقیر ضروری ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں اس سے بھی زیادہ سخت و بیرحمانہ احکام ہیں۔ لیکن یہ جو کچھ ہے متاخرین فقہا کی ایجاد ہے۔ ورنہ امام ابوحنیفہ کا دامن اس داغ سے پاک ہے۔

امام ابوحنیفہ سے جو کچھ اس باب میں مروی ہے وہ صرف اسقدر ہے کہ ذمی زنار باندھیں

اور ایسے زین پر سوار ہوں جن کی شکل ہتھیلی کی سی ہوتی ہے۔ البتہ قاضی ابو یوسفؒ صاحب[1] نے بعض اور احکام اس پر بڑھائے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ ذمی مسلمانوں کے ساتھ وضع قطع لباس سواری میں مشابہت نہ اختیار کریں۔ اور لمبی ٹوپیاں اوڑھیں۔ اور اُن کے زین کے آگے گول لکڑی ہو۔ اور اُن کی جوتیوں کے تسمے دوہرے ہوں۔ اور اُن کی عورتیں کجاووں پر نہ سوار ہوں۔ قاضی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ذمیوں کے بارہ میں یہی احکام صادر کئے تھے۔ اور اُس کی وجہ خود حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ ذمیوں کی وضع مسلمانوں کی وضع سے الگ رہے۔

بلاشبہ یہ حضرت عمرؓ کے احکام ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ احکام ذمیوں کی تحقیر کی وجہ سے صادر ہوئے تھے۔ سخت غلطی ہے۔ افسوس ہے کہ اس غلطی کا ارتکاب اکثر متاخرین فقہا نے کیا بے شبہہ حضرت عمرؓ کا ایک طبعی مذاق تھا کہ وہ قومی امتیاز کو پسند کرتے تھے۔ اُنہوں نے اہل فوج کو اکثر فرمانوں میں لکھا ہے۔ کہ "وہ جاڑوں میں دھوپ کھانا نہ چھوڑیں۔ گھوڑوں پر رکاب کے سہارے سے سوار نہ ہوں۔ موٹے کپڑے استعمال کریں"۔ جس سے مقصد یہ تھا۔ کہ اہل عرب اپنے ملک اور وطن کی خصوصیتوں کو محفوظ رکھیں۔ اسی بنا پر اُنہوں نے اہل عجم کو جنھوں نے اسلام نہیں قبول کیا تھا تاکید کی۔ کہ وہ اپنی قومی خصوصیتوں کو ضائع نہ ہونے دیں۔ اہل عجم زمانۂ اسلام سے پہلے زنار باندھتے تھے۔ لمبی لمبی ٹوپیاں اوڑھتے تھے۔ اُن کے زین آجکل کے انگریزی زین کے مشابہ ہوتے تھے اُنکی عورتیں اونٹوں پر نہیں سوار ہوتی تھیں۔ چنانچہ انہیں رسوم و عادات کی نسبت حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اہل ذمہ اُسکی پابندی کریں۔ یہی احکام ابو حنیفہؒ اور قاضی ابو یوسفؒ نے قائم رکھے جن کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ دونوں قومیں اپنی خصوصیات پر قائم ہیں۔

البتہ امام ابو حنیفہؒ نے یہ حکم دیا ہے۔ کہ اہل ذمہ اسلامی شہروں میں اپنی عبادت گاہیں نہ بنائیں۔ لیکن اُن کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ امن و امان میں خلل نہ ہو اور مسلمان رعایا جو اکثر عرب کی نسل سے تھے اور ناقوس کی صداؤں سے اُن کے کان آشنا نہ تھے فساد پر آمادہ ہوں۔ اس حکم نے ذمیوں کے حق میں چنداں دقت بھی نہیں پیدا کی۔ مسلمانوں نے جو شہر آباد کئے وہ دو چار شہر سے زیادہ نہ تھے۔ باقی تمام ملک انہیں شہروں سے معمور تھا۔ جو غیر قوموں کے آباد کئے ہوئے تھے اور جہاں ذمیوں کو عموماً عبادت گاہوں کے بنانے کی اجازت تھی اسلامی شہروں میں بھی یہ قید اُس وقت تک قائم رہی جب تک فتنہ کا

[1] قاضی ابو یوسف صاحب نے یہ احکام کتاب الخراج میں لکھے ہیں۔ ۱۲

احتمال رہا جب یہ خوف جاتا رہا تو ذمیوں کو عام اجازت ملگئی - چنانچہ بغداد میں جو خاص اسلامی شہر تھا - سیکڑوں ہزاروں چرچ اور گرجے تعمیر ہوئے -

(۵) ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو احکام نصوص سے ماخوذ ہیں - اور جن میں ائمہ کا اختلاف ہے اُن میں امام ابوحنیفہ جو پہلو اختیار کرتے ہیں - وہ عموماً نہایت قوی اور مدلّل ہوتا ہے - نص کا لفظ قرآن و حدیث دونوں پر اطلاق کیا جاتا ہے - اور اس لحاظ سے وہ احکام بھی نصی کہے جاتے ہیں جو قرآن سے نہیں بلکہ صرف حدیث سے ثابت ہیں - لیکن اس موقع پر ہم اُن سے بحث نہیں کر سکتے - اور اس کی مختلف وجوہیں اول تو یہ کہ اس قسم کے مسائل نہایت کثرت سے ہیں جن کا مختصر سے مختصر حصّہ بھی اس کتاب میں آ نہیں سکتا - اگر چند مسائل نمونہ کے طور پر بیان کئے جائیں تو بدگمانوں کو اس سوءظن کا موقع باقی رہتا ہے کہ چند قوی مسائل لے لئے اور ضعیف چھوڑ دیئے - دوسری بڑی وجہ یہ ہے - کہ آج ان مسائل کا فیصلہ مجتہدانہ نہیں ہو سکتا - حدیث کے متعلق بہت بڑی بحث صحت و عدم صحت کی پیدا ہوتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے مسائل فقہ میں ائمہ کو مختلف آلارا کر دیا ہے - ایک امام کے نزدیک ایک حدیث قابل حجت ہے دوسرے کے نزدیک نہیں اس بحث کے تصفیہ کے لئے جو سامان ہمارے ملک میں موجود ہے وہ بالکل ناکافی ہے اور اُس سے کسی حدیث کی نسبت مجتہدانہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا - بڑے اجلہ اسماء الرجال کا جنے اس فن کی جو کتابیں ہمارے ملک میں موجود ہیں مثلاً تہذیب الکمال فی تہذیب التہذیب - میزان الاعتدال طبقات الحفاظ - تہذیب الاسماء - واللغات وغیرہ ان میں جرح و تعدیل کے متعلق ائمہ کے جو اقوال مذکور ہیں اکثر اُنکا سلسلہ سند مذکور نہیں اس لئے محدثانہ حیثیت سے اُس کے ثبوت و عدم ثبوت کا تصفیہ نہیں ہو سکتا اسکے علاوہ اکثر جروح مبہم ہیں - اور جن جرحوں کو مفسر قرار دیا ہے - وہ بھی ابہام سے خالی نہیں - قدما نے اس فن میں جو تصنیفات لکھیں اُن سے بے شبہ یہ مباحث طے ہو سکتے ہیں - لیکن وہ یہاں میسّر نہیں آتیں علمائے حنفیہ نے خاص اس بحث پر کہ حنفی فقہ کے مسائل احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں - بہت سی کتابیں لکھی ہیں جسکو زیادہ شوق ہو اُن تصنیفات کیطرف رجوع کر سکتا ہے -

لیکن قرآن مجید میں اس بحث کا بڑا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے - کیونکہ قرآن کے ثبوت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا - اس لئے نزع کا مدار صرف اسپر رہجاتا ہے کہ جو مسئلہ اُس سے مستنبط کیا گیا - صحیح طور پر کیا گیا - یا نہیں اس حالت میں بحث مختصر رہجاتی ہے اور نہائت آسانی سے اُسکا تصفیہ ہو جاتا ہے - قرآن مجید سے جو احکام ثابت ہیں اُن کی تعداد بھی کچھ

کم نہیں ہے اور وہ فقہ کے مہمات مسائل ہیں اس لئے اگر یہ ثابت ہو کہ حنفی فقہ کے مسائل نصوص قرآن سے زیادہ مطابق ہیں تو مہمات مسائل میں فقہ حنفی کی ترجیح بآسانی ثابت ہو جائیگی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو جائیگا۔ کہ امام ابوحنیفہ کو حیثیت اجتہاد میں تمام ائمہ پر ترجیح ہے کیونکہ اجتہاد کا مدار زیادہ تر استنباط اور استخراج ہی پر ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر۔ اگرچہ ہم صرف اُن مسائل پر اکتفا کرتے ہیں۔ جو قرآن سے ثابت ہیں تاہم حدیث کے متعلق ایک اجمالی بحث ضرور ہے۔ جس سے بدگمانوں کو سوءظن کا موقع نہ ہو بعض لوگوں کو خیال ہے کہ امام صاحب کے بہت سے مسائل احادیث صحیحہ کے مخالف کی بعض انصاف پسند وجہ یہ بتاتے ہیں کہ امام صاحب کے زمانہ تک احادیث کا استقصاء نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے بہت سی حدیثیں اُن کو نہیں پہنچیں لیکن یہ خیال محض لغو اور بے سروپا ہے امام صاحب کے زمانہ تک تو حدیثیں جمع نہیں ہوئی تھیں لیکن جب جمع ہوچکیں اُس وقت بڑے بڑے محدثین اُن کے مسائل کو کیوں تسلیم کرتے رہے۔ وکیع بن الجراح جن کی روایتیں صحیح بخاری میں بکثرت موجود ہیں اور جنکی نسبت امام بن احمدؒ حنبل کہا کرتے تھے کہ میں نے اُن سے بڑھکر کسی کو حافظ العلم نہیں دیکھا وہ امام ابوحنیفہ کے مسائل کی تقلید کرتے تھے۔ خطیب بغدادی[۵] نے اُن کے حال میں لکھا ہے۔ کان یفتی بقول ابی حنیفہ یحیےٰ ابن سعید بن القطان جو فن جرح وتعدیل کے موجد ہیں اکثر مسائل میں امام ابوحنیفہ کے پیرو تھے خود انکا قول ہے قد اخذ نا باکثر اقوالہ[۶] امام طحاوی جو حافظ الحدیث تھے اور مجتہد فی المذہب کا درجہ رکھتے تھے۔ پہلے شافعی تھے۔ پھر امام ابوحنیفہ کے مسائل اختیار کئے اور کہا کرتے تھے کہ میں ابوحنیفہ کا مقلد نہیں ہوں بلکہ مجھ کو اُن سے توارد ہے طحاوی امام بخاری ومسلم کے ہمزمان ہیں اور وہ یہ زمانہ ہے۔ جب حدیث کا دفتر کامل طور سے مرتب ہو گیا تھا۔ متاخرین میں علامہ ماردینی۔ حافظ زیلعی۔ ابن الہمام۔ قاسم بن قطلوبغا وغیرہم کی نسبت قلت نظر کا کون گمان کرسکتا ہے؟ یہ لوگ عموماً حنفی مسائل کے حامی ہیں۔

اسکے علاوہ جو لوگ عموماً حافظ الحدیث تسلیم کئے گئے ہیں اُن کے مسائل امام ابوحنیفہ سے کیوں موافق ہیں؟ طبقہ اولےٰ میں سب سے بڑے محدث امام احمدؒ حنبل ہیں۔ جن کی شاگردی پر بخاری ومسلم کو ناز تھا۔ اور جن کی نسبت محدثین کا عام قول ہے کہ جس حدیث

[۵] مختصر تاریخ بغداد لابن جوزی ترجمہ وکیع بن الجراح ۱۲-

[۶] تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر ترجمہ امام ابوحنیفہ ۱۲-

کو احمد جنبل نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں" امام احمد جنبل بہت سے مسائل میں امام شافعی کے مخالف اور امام ابوحنیفہ کے موافق ہیں۔ خوارزمی نے لکھا ہے کہ فروع و جزئیات چھوڑ کر امہات فقہ کے متعلق ایک سو پچیس مسئلوں میں اُن کو امام ابوحنیفہ کے ساتھ اتفاق ہے اور امام شافعی سے اختلاف ہم نے خود بہت سے مسائل میں تطبیق کی ہے جس سے خوارزمی کے دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ سفیان ثوری امام احمد جنبل کو محدثین نے امام الحدیث تسلیم کیا ہے اُن کے مسائل امام ابوحنیفہ کے مسائل کے موافق ہیں۔ قاضی ابو یوسف کہا کرتے تھے کہ واللہ سفیان اکثر متابعة منی لابی حنیفة یعنی "خدا کی قسم سفیان مجھ سے زیادہ ابوحنیفہ کی پیروی کرتے ہیں" صحیح ترمذی میں سفیان ثوری کے جو مسائل مذکور ہیں۔ جو زیادہ تر شافعی کے مخالف اور ابوحنیفہ کے موافق ہیں۔

اس خیال کے پیدا ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بعض محدثین مثلاً امام بخاری ابن ابی شیبہ نے امام ابوحنیفہ کے متعدد مسائل کی نسبت تصریح کی ہے کہ حدیث کے خلاف ہیں ابن ابی شیبہ نے امام ابوحنیفہ کے رد میں ایک مستقل باب لکھا ہے۔ لیکن یہ خیال کرنے والوں کی کوتاہ نظری ہے۔ اکثر ائمہ نے ایک دوسرے پر جرح و اعتراض کیا ہے امام شافعی امام مالک کے با اخلاص شاگرد تھے اور کہا کرتے تھے کہ "آسمان کے نیچے موطا ی امام مالک سے زیادہ صحیح کوئی کتاب نہیں" باوجود اس کے اُنہوں نے امام مالک کی رد میں ایک مستقل رسالہ لکھا جس میں دعوے کیا ہے کہ امام مالک کے بہت سے مسائل احادیث صحیحہ کے خلاف ہیں۔ امام رازی نے مناقب الشافعی میں اس رسالہ کا دیباجہ نقل کیا ہے۔ اور خود ہماری نظر سے گزرا ہے لیث بن سعد جو مشہور محدث ہیں۔ کہا کرتے تھے کہ امام مالک نے ستر مسئلوں میں حدیث کی مخالفت کی۔ چنانچہ میرا ارادہ ہے۔ کہ میں اُن کو اس امر کی نسبت خط لکھوں" امام شافعی بھی اس اعتراض سے نہیں بچے اور کہ نہیں بچ سکتے تھے جہر بسم اللہ و قنوت فی الفجر و ترک توریث ذوی الارحام وغیرہ مسائل میں اُن کا مذہب صریح حدیثوں کے مخالف معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اجتہادی امور ہیں۔ اور اُن کی بناء پر ہم کسی کو مخالف حدیث نہیں کہہ سکتے۔ جس حدیث کو ایک مجتہد صحیح سمجھتا ہے ضرور نہیں کہ وہ دوسرے مجتہد کے نزدیک بھی صحیح ہو۔ پھر اس مرحلہ کے طے ہونے کے بعد استنباط و استدلال کی بحث باقی رہتی ہے۔ جس میں مجتہدین بہت کم متفق الرائے ہو سکتے ہیں کیونکہ استنباط و استدلال کے اصول جداگانہ ہیں۔ امام بخاری کا جزء القرءة ہمنے دیکھا ہے۔ جامع صحیح میں۔ جہاں وہ امام ابوحنیفہ کی طرف

اشارہ کرتے ہیں اُس سے بھی ہم واقف ہیں۔ بے شبہ ان مسئلوں میں امام بخاری کا دعوے ہے کہ امام ابو حنیفہ کا مذہب حدیث کے مخالف ہے لیکن امام بخاری کی تحریر اور امام ابو حنیفہ کا فتوے دونوں ہمارے سامنے ہیں اور ہم خود سمجھ سکتے ہیں کہ اُن مسائل میں امام صاحب کا مذہب حدیث کے مخالف ہے۔ یا امام بخاری کی فہم واجتہاد کے مخالف ہے۔

قراءت فاتحہ کے مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کا استدلال اس آیت پر ہے واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا امام بخاری جزءالقراۃ میں فرماتے ہیں کہ یہ آیت خطبہ کے بارہ میں اُتری ہے یعنی نماز سے اسکو تعلق نہیں۔ امام بخاری کا یہ جواب کس قدر حیرت انگیز ہے۔ اگر رسالہ جزءالقراۃ خود ہماری نظر سے نہ گزرا ہوتا تو ہمکو مشکل سے یقین آتا کہ واقعی یہ امام بخاری کا قول ہے اول تو بیسوں روایتوں سے ثابت ہے کہ یہ آیت نماز میں اُتری ہے لیکن اگر ہم اُنہی کے قول کو تسلیم کریں تو یہ کون نہیں جانتا کہ موقع ورود کے خاص ہونیسے آیت کا حکم جو صریحی عام ہے۔ خاص نہیں ہو سکتا۔

امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ امام ومقتدی کو آمین آہستہ کہنی چاہیے۔ امام بخاری برخلاف اُسکے جہر کے قائل ہیں۔ اور دلیل یہ لاتے ہیں۔ کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ جب امام ولا الضالین کہے۔ تو تم آمین کہو۔ لیکن اس حدیث میں جہر کا کہاں ذکر ہے۔ اور مطلق آمین کہنے سے تو امام ابوحنیفہ کو بھی انکار نہیں۔ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔ نبیذ تمر سے بشرطیکہ مسکر نہ ہو وضو جائز ہے۔ امام بخاری اس کے خلاف ترجمۃ الباب باندھتے ہیں۔ اور حدیث نقل کرتے ہیں کہ کل ما اسکر حرام۔

امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ مقتدی کے لیئے قراءۃ فاتحہ ضروری نہیں۔ امام بخاری وجوب کے مدعی ہیں اور جامع صحیح میں باب باندھا ہے کہ "امام ومقتدی پر ہر نماز میں خواہ سفر میں ہو یا حضر میں۔ نماز خواہ جہری ہو یا سری قراءت واجب ہے۔ اس دعوے پر دو حدیثیں پیش کی ہیں ایک یہ کہ "کوفہ والوں نے حضرت عمر کے پاس سعد بن ابی وقاص کی شکایت کی حضرت عمر نے اُن کو معزول کر دیا۔ اور بجائے اُنکے عمار کو مقرر کیا۔ کوفہ والے عمار کے بھی شاکی ہوئے کہ اُنکو تو نماز پڑھنی بھی نہیں آتی۔ حضرت عمر نے عمار کو بُلا بھیجا۔ اور اُن سے کہا کہ ان لوگوں کا یہ گمان ہے۔ عمار نے کہا واللہ میں اُن کے ساتھ رسول اللہ کی سی نماز پڑھتا تھا اور اُس سے کچھ کم نہیں کرتا تھا میں عشاء کی نماز پڑھتا تھا۔ تو پہلی دو رکعتوں میں دیر تک قیام کرتا تھا۔ اور وہ اخیر کی رکعتوں میں تخفیف کرتا تھا۔

اس حدیث سے قراءت فاتحہ کا وجوب کیونکر ثابت ہوا حافظ ابن حجر وغیرہ نے جو تاویلیں

کی ہیں۔ اُن سے اگر بہزار وقت وجوب پر استدلال بھی ہو تو کیا اُسکی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے حدیث کی مخالفت کی۔!!

حقیقت یہ ہے کہ کسی مجتہد کی نسبت یہ خیال کرنا کہ اُس کو احکام کے متعلق حدیثیں نہیں پہنچیں سخت غلطی ہے لیکن چونکہ حدیثوں کا معیار صحت وجوہ استنباط۔ طرق استدلال تمام مجتہدین کے نزدیک متحد نہیں ہے اس لئے مسائل میں اختلاف کا پیدا ہونا ضرور تھا

اب ہم اس ضمنی بحث کو چھوڑ کر اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ہمارا دعوے ہے۔ کہ قرآن مجید کی تمام آیتیں جنسے کوئی مسئلہ فقہی مستنبط کیا گیا ہے۔ اُنکے وہی معنی صحیح اور واجب العمل ہیں۔ جو امام ابوحنیفہ نے قرار دئے ہیں۔ قرآن مجید میں احکام کی آیتیں سو سے متجاوز ہیں اسلئے ہم اُن کا استقصا تو نہیں کر سکتے۔ البتہ مثال کے طور پر متعدد مسائل کا ذکر کرتے ہیں جن سے ایک عام اجمالی خیال قائم ہو سکتا ہے۔

امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ وضو میں چار فرض ہیں۔ امام شافعی دو فرض اور اضافہ کرتے ہیں یعنی نیت اور ترتیب امام مالک بجائے انکے موالات کو فرض کہتے ہیں۔ امام احمد حنبل کا مذہب ہے۔ کہ وضو کے وقت بسم اللہ کہنا ضرور ہے۔ اور اگر قصداً نہ کہا۔ تو وضو باطل ہے امام صاحب کا استدلال ہے کہ آیت میں صرف چار حکم مذکور ہیں۔ اسلئے جو چیز ان احکام کے علاوہ ہے۔ وہ فرض نہیں ہو سکتی۔ نیت وموالاۃ وتسمیہ کا تو آیت میں کہیں وجود نہیں ترتیب کا گمان البتہ واو کے ہونے سے پیدا ہوتا ہے لیکن علمائے عربیت متفق ہیں کہ واو کے مفہوم میں ترتیب داخل نہیں ہے فرض وضو

امام رازی نے تفسیر کبیر میں ترتیب کی فرضیت کے لئے متعدد دلیلیں پیش کی ہیں۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ اُن کا رتبہ تاویل سے بڑھ کر نہیں، بڑا استدلال یہ ہے کہ

میں حرف فا تعقیب کیلئے ہے جس سے اسقدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ منہ کا پہلے دھونا فرض ہے اور جب ایک رکن میں ترتیب ثابت ہوئی تو باقی ارکان میں بھی ہونی چاہیئے دوسری دلیل یہ لکھی ہے کہ وضو کا حکم خلاف عقل حکم ہے اس لئے اسکی تعمیل بھی اُسی ترتیب سے فرض ہونا چاہیئے۔ جس طرح آیت میں مذکور ہے کیونکہ وضو کا حکم جس طرح خلاف عقل ہے ترتیب بھی خلاف عقل ہے۔ امام رازی کی یہ دلیلیں جس رتبہ کے ہیں خود ظاہر ہیں اُس پر رد وقدح کی ضرورت نہیں۔

امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ عورت کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ امام شافعی اس کے مخالف ہیں۔ اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں۔ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا یعنی اگر تم بیمار ہو عورت کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا

یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص غایط[1] سے آئے یا تم نے عورت کو چھوا ہو۔ اور تم کو پانی نہ ملے۔ تو تم تیمم کرو۔

امام صاحب فرماتے ہیں کہ عورت کے چھونے سے جماع و مقاربت مراد ہے۔ اور یہ قرآن مجید کا عام طرز ہے کہ ایسے امور کو صریحاً تعبیر نہیں کرتا۔ لطف یہ ہے کہ اسی لفظ کا ہم معنے لفظ "مس" جس کے معنے چھونے کے ہیں۔ خدا نے اس آیت میں جماع کے معنی ہیں۔ استعمال کیا ہے۔ اور خود امام شافعی تسلیم کرتے ہیں۔ کہ وہاں جماع ہی مقصود ہے حقیقت یہ ہے۔ کہ اس آیت میں ملامستہ کے ظاہری معنی لینے ایسی غلطی ہے جو ہرگز اہل زبان سے نہیں ہو سکتی۔ اس آیت میں غایط کا لفظ بھی تو ہے اسکو تمام مجتہدین کنایہ قرار دیتے ہیں ورنہ ظاہری معنی لئے جائیں۔ تو لازم آئیگا۔ کہ جو شخص ہموار زمین سے ہو کر آئے۔ اُس پر وضو کرنا واجب ہو۔

میری رائے میں امام شافعی کا اگرچہ یہ مذہب ہے کہ عورت کے چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن اُن کا استدلال اس آیت پر نہیں ہے۔ وہ حدیث سے استناد کرتے ہونگے غالباً اُنکے بعد اُنکے مقلدوں نے حنفیہ کے مقابلہ کے لئے آیت سے استدلال کیا اور اُسکو امام شافعی کی طرف منسوب کر دیا۔

امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے کہ ایک تیمم سے کئی فرض ادا ہو سکتے ہیں۔ امام مالک و شافعی کی رائے ہے کہ ہر فرض کے لئے نیا تیمم کرنا چاہئے۔ امام صاحب کا استدلال ہے کہ جو حیثیت وضو کے حکم کی ہے وہی تیمم کی ہے اور جب ہر نماز کے لئے نئے وضو کی ضرورت نہیں۔ تو تیمم کی تجدید کی بھی ضرورت نہیں۔ البتہ جن لوگوں کا مذہب ہے کہ ایک وضو سے کئی نمازیں نہیں ادا ہو سکتیں۔ وہ تیمم کی نسبت بھی یہ حکم لگا سکتے ہیں۔ لیکن وضو و تیمم میں تفریق کرنی جیسا کہ امام شافعی وغیرہ نے کی محض بے وجہ ہے۔

امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے کہ اثنائے نماز میں تیمم کو اگرچہ پانی ملجائے تو تیمم جاتا رہیگا امام مالک و احمد حنبل اس کے مخالف ہیں امام صاحب کا استدلال یہ ہے کہ قرآن میں تیمم کا جواز اس قید کے ساتھ مشروط ہے کہ لَمْ تَجِدُوا مَاءً یعنی جب پانی نہ ملے۔ صورت مذکورہ میں جب شرط باقی نہیں رہی۔ تو مشروط بھی باقی نہیں رہا

امام صاحب کا قول ہے کہ تکبیر تحریمہ جزو نماز نہیں اور فارسی زبان میں تکبیر کہنا درست ہے امام شافعی وغیرہ مخالف ہیں۔ امام صاحب کا استدلال ہے کہ جس آیت سے تکبیر کی فرضیت

[1] غایط کے معنی ہموار زمین کے ہیں لیکن اس سے جائے ضرور یعنی پاخانہ مراد ہے ۱۲

ثابت کیگئی ہے یعنی وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلّٰى ۔ اُسمیں زبان کی کوئی خصوصیت نہیں اور چونکہ پر فا تعقیب داخل ہے اسلیے نماز کا وجود تکبیر سے موخر ہونا ضرور ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ تکبیر گو فرض ہے لیکن نماز میں داخل نہیں ۔ اور جزو نماز نہیں۔

امام صاحب کا مذہب ہے کہ مقتدی کو قراءت فاتحہ ضروری نہیں ۔ امام شافعی و امام بخاری وجوب کے قائل ہیں ۔ امام صاحب اس آیت سے استدلال کرتے ہیں وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا ۔ یعنی جب قرآن پڑھا جاوے تو سنو اور چپکے رہو"۔ اگرچہ اس آیت سے سری نمازوں میں بھی ترک قراءۃ کا حکم ثابت ہوتا ہے۔ لیکن خاص کر جہری نماز کے لیے تو وہ نص قاطع ہے۔ جس کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی۔ تعجب ہے کہ شافعیہ نے ایسے صاف اور صریح آیت کے مقابلہ میں حدیثوں سے استدلال کیا ہے حالانکہ حدیثیں جو اس باب میں وارد ہیں۔ خود متعارض ہیں جس درجہ کی وجوب قراءت کی حدیثیں موجود ہیں۔ اُسی درجہ کی ترک قراءت کی بھی ہیں۔

امام بخاری نے اس بحث میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ آیت کے استدلال کا جواب دیں ۔ لیکن جواب ایسا دیا ہے جس کو دیکھکر تعجب ہوتا ہے۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ترجمہ یعنی سوائے اسکے نہیں ہے۔ کہ حرام کیا خدا نے تم پر مردہ کو اور خون کو اور سور کے گوشت کو اور اُس چیز کو جس پر خدا کے سوا اور کسی کام کا نام لیا جاوے لیکن جو شخص مجبور ہو بشرطیکہ نافرمان اور حد سے گذر جانے والا نہ ہو تو اُس پر گناہ نہیں ہے"۔

اس آیت سے بہت سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں جن میں مجتہدین کو باہم اختلاف ہے ان تمام مختلف فیہ مسائل میں امام ابوحنیفہ نے آیت کا جو مطلب قرار دیا ہے وہی صحیح ہے پہلی بحث یہ ہے کہ مُردہ کے کیا معنے ہیں۔ امام ابوحنیفہ وہی عام معنی لیتے ہیں جو عام طلاق میں شائع ہے امام شافعی نے اس کو بہت وسعت دی ہے یہاں تک کہ وہ مردہ جانوروں کے بالوں اور ہڈیوں کو بھی مردہ کہتے ہیں۔ اس بنا پر اُن کی رائے ہے کہ ان چیزوں سے کسی قسم کا تمتع مثلاً پوستین وغیرہ کا استعمال جائز نہیں۔ امام مالک بال اور کھال کا کام میں لانا جائز قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہڈی کا استعمال اُن کے نزدیک بھی حرام ہے۔

امام شافعی نے اور امام مالک نے مردہ کے جو معنے لئے۔ چونکہ صاف غلط معلوم ہوتے ہیں۔ اسلیے اُنکے مقلدوں نے تاویلیں کیں۔ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں کہ ہڈی کو مردہ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ خدا نے قرآن میں کہا ہے مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ ۔ یعنی ہڈی کو کون زندہ

کرے گا" اور زندہ وہی چیز ہو سکتی ہے جو پہلے مر چکی ہو اسی طرح خدا نے زمین کو مردہ کہا ہے" امام رازی کی یہ تاویل نہایت تعجب خیز ہے اس قسم کے اطلاقات مجازی اطلاق ہیں جن پر احکام کی تفریع نہیں ہو سکتی۔ امام رازی نے زمین کا مُردہ ہونا قرآن مجید سے ثابت کیا ہے۔ تو زمین اور خاک کے استعمال کو بھی ناجائز قرار دینا چاہیے۔

دوسری بحث یہ ہے۔ کہ خون جس کو اس آیت میں حرام کہا ہے اُس سے کیا مُراد ہے امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہ دم مسفوح ہے یعنی جس خون میں روانی ہو۔ اس بنا پر وہ مچھلی کے خون کو حرام نہیں کہتے۔ امام شافعی کے نزدیک اسمیں کوئی تخصیص نہیں اور ہر قسم کا خون حرام ہے۔ امام صاحب کا استدلال یہ ہے کہ یہ تخصیص خود خدا نے کی ہے چنانچہ دوسرے موقع پر فرمایا ہے۔ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْمَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اس آیت میں خون کی تحریم کو مسفوح کے ساتھ مقید کر دیا ہے

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ بَاغٍ وَّعَادٍ سے کیا مراد ہے۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں۔ کہ کھانے میں بغاوت و عدوان نہ ہو یعنی جو شخص مجبور ہو اور جان بلب ہو اُسکو مردہ و سور کا گوشت کھانا جائز ہے لیکن اس شرط پر کہ سد رمق سے زیادہ نہ کھائے اور کسی دوسرے مضطر سے چھین کر نہ کھائے۔ امام شافعی بغاوت و عدوان کے یہ معنے لیتے ہیں کہ اس شخص نے سلطان وقت سے بغاوت نہ کی ہو اور گنہگار نہ ہو اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان شخص جو سلطان وقت سے باغی ہو کسی موقع پر فاقہ سے جاں بلب ہو جائے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک اُس کو مُردہ یا سُور کا گوشت بقدر سد رمق کے کھانا جائز ہے۔ بخلاف اس کے امام شافعی کا قول ہے۔ کہ وہ اگر باغی نہ ہوتا تو کھانا جائز تھا۔ لیکن بغاوت کی حالت میں اُسکو یہ اجازت نہیں ملسکتی۔

امام شافعی نے ان الفاظ کے جو معنے لیے اولاً تو سیاق عبارت سے بالکل بیگانہ ہیں دوسرے اصول شرع اُسکی مساعدت نہیں کرتے۔ شریعت نے ضرورت کے وقت جن چیزوں کی رخصت یا اجازت دی ہے وہ کسی جرم و عصیان سے بالکل نہیں ہوتی۔ جھوٹ بولنا گناہ ہے اور بعض حالتوں میں مثلاً جب جان کا خوف ہو اُسکی اجازت دی گئی ہے کیا ایک گناہگار شخص اس اجازت سے متمتع نہیں ہو سکتا صورت متنازعہ میں اگر اس شخص کو اس لیئے کھانے کی اجازت نہیں دیگئی کہ اُسکا ہلاک ہونا ہی بہتر ہے تو حرام کی کیا تخصیص ہے اُسکے لیئے تو حلال غذا کی بھی اجازت نہ ہونی چاہیے۔

یہ مسائل تو نصّی تھے امام ابوحنیفہ نے اس آیت سے ایک قیاسی مسئلہ قائم کیا ہے اور

امام شافعی نے اُس سے مخالفت کی ہے یعنی ایک شخص پیاس سے جاں بلب ہو اور بجز شراب کے اور کوئی چیز مل نہ سکے۔ تو اُسکو شراب پینے کی اجازت ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک ہے اور امام شافعی کے نزدیک نہیں۔ امام شافعی اگر ظاہریوں کی طرح قیاس کے منکر ہوتے۔ تو اس جواب سے کچھ تعجب نہ ہوتا۔ لیکن قیاس کے قائل ہو کر یہ مخالفت محل تعجب ہے کیونکہ یہ حالت اور جس حالت کا ذکر قرآن میں صریحاً ہے دونوں کی علت مشترک ہے یعنی حفاظت نفس۔ پھر حکم کے نہ مشترک ہونیکی کوئی وجہ نہیں۔

جنایات کے باب میں جو احکام قرآن مجید میں وارد ہیں۔ اُن کی تعبیر جس صحت کے ساتھ امام ابو حنیفہ نے کی کسی دوسرے مجتہد نے نہیں کی۔ زمانۂ جاہلیت میں قصاص کے جو قاعدے رائج تھے نہایت ناانصافی اور جہالت پر مبنی تھے۔ اسلام نے نہایت خوبی سے اُسکی اصلاح کی۔ اور ایسے احکام مقرر کئے جن سے بڑھ کر نہ کبھی ہوئے نہ ہو سکتے۔ جاہلیت میں قصاص کا اعتبار مقتول و قاتل کی حیثیت سے کیا جاتا تھا۔ جو معزز قبیلے تھے۔ وہ دوسرے قبیلوں سے اس طرح قصاص لیتے تھے کہ اپنے غلام کے بدلے دوسرے قبیلہ کے دو مردوں کو قتل کرتے تھے۔ خدا نے قصاص کا عام حکم صادر فرمایا جسکا یہ مطلب ہے۔ کہ قصاص کا حکم کسی قید کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ قاتل ہر حالت میں مقتول کے بدلے مارا جائیگا۔ خواہ شریف ہو یا رذیل۔ مرد ہو۔ یا عورت۔ غلام ہو یا آزاد۔ مسلم ہو یا ذمی۔ زیادہ توضیح کے لئے اُن صورتوں کی خاص طرح پر بھی نفی کی۔ جو عرب میں اسلام سے پہلے جاری تھیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى۔ ترجمہ۔ یعنی "تم پر مقتول کے بارہ میں قصاص فرض کیا گیا آزاد۔ آزاد کے بدلے غلام غلام کے بدلے عورت عورت کے بدلے"

زمانہ جاہلیت میں یہ بھی دستور تھا کہ قتل عمد کے بارہ میں مالی معاوضہ دیدینا کافی سمجھا جاتا تھا۔ اور اُس کو دیت کہتے تھے۔ اسلام نے اُس کو باطل کیا اور دیت کو جو ایک قسم کا جرمانہ ہے صرف شبہ عمد اور قتل خطاء کی حالت میں جائز رکھا۔ اور اُسکی مقدار مسلمان و ذمی کیلئے یکساں مقرر کی۔ چنانچہ خدا نے ارشاد فرمایا کہ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ۔ ترجمہ۔ یعنی "مسلمان کی شان نہیں ہے کہ کسی مسلمان کو قتل کرے۔ مگر غلطی سے اور جو شخص کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کرے۔ تو اُس کو ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہوگا

اور مقتول کی اہل کو دیت دینی ہوگی۔ اور اگر مقتول اُس قوم سے ہو کہ تمہارے اور اُن کے درمیان میثاق ہے تو دیت دینی ہوگی۔ اور ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہوگا

یہ احکام نہایت صاف اور صریح طور پر قرآن سے ثابت ہوتے ہیں اور امام ابوحنیفہ انہیں احکام کے قائل ہیں۔ لیکن امام شافعی وغیرہ نے بعض مسائل میں اختلاف کیا ہے جس کی نسبت ہم افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ یقیناً اُنکی غلطی ہے۔

پہلا اختلاف یہ ہے۔ کہ امام شافعی و امام مالک و احمد حنبل قائل ہیں کہ غلام کے بدلے آزاد قتل نہیں کیا جا سکتا۔ غلام اور آزاد میں ایسا بیرحمانہ تفرقہ کرنا ہرگز قرآن سے ثابت نہیں ہوتا۔ اگر الحُرُّ بالحُرّ کی تخصیص سے استدلال ہے تو الانثیٰ بالانثیٰ کی تخصیص سے کہ عورت کے بدلے مرد نہ قتل کیا جاوے۔ حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں۔

دوسرا اختلاف یہ ہے کہ امام شافعی ذمی کی دیت مسلمان کی دیت سے کم قرار دیتے ہیں حالانکہ دیت کے جو الفاظ خدا نے مومن کے حق میں استعمال کئے۔ وہی اُن لوگوں کے حق میں بھی ارشاد کئے جو مسلمانوں سے میثاق و معاہدہ رکھتے ہیں۔ بے شبہ یہ اسلام کی نہایت فیاض دلی ہے کہ اُس نے مسلمان و ذمی کا حق برابر رکھا۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسے فیاضانہ حکم کی لوگوں نے غلط تاویل کی۔

تیسرا اختلاف یہ ہے۔ کہ امام شافعی قتل عمد کی حالت میں بھی مالی معاوضہ ادا کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید میں قتل عمد کی حالت میں قصاص کا حکم ہے۔ دیت کی کہیں اجازت نہیں۔ اور یہی اقتضائے عقل ہے۔ جاہلیت میں قتل۔ مقدمات دیوانی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس وجہ سے مالی معاوضہ اُن کا بدل ہو سکتا تھا۔ لیکن اسلام ایسے غلطی کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا

چوتھا اختلاف یہ ہے۔ کہ امام شافعی کیفیت قتل میں مساوات کو لازمی قرار دیتے ہیں یعنی اگر قاتل نے پتھر سے سر پھوڑ کر کسی کو مارا تو وہ بھی پتھر سے سر توڑ کر مارا جائے۔ یا کسی نے آگ سے جلا کر مارا ہو تو وہ بھی آگ سے جلا کر مارا جائے۔ لیکن اس قسم کی مساوات پر قرآن کا کوئی لفظ دلالت نہیں کرتا۔

پانچواں اختلاف یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک قتل عمد کی حالت میں کفارہ لازم نہیں آتا امام شافعی قصاص و کفارہ دونوں لازمی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید میں کفارہ کا حکم قتل خطا کے ساتھ مخصوص ہے۔ قتل عمد میں کفارہ کا کچھ ذکر نہیں۔ وراثت کے بعض

احکام ہیں جو نہایت مہتم بالشان ہیں امام ابوحنیفہ اور امام شافعی ہیں اختلاف ہے۔ ان مسائل میں امام ابوحنیفہ نے جو پہلو اختیار کیا وہ نہایت صریح طور سے قرآن سے ثابت ہے وراثت کے قاعدے جو اسلام نے مقرر کئے۔ وہ تمام دنیا کے قواعد وراثت سے الگ ہیں اور ایسے دقیق اور نازک اصول پر مبنی ہیں جو علانیہ اسبات کی دلیل ہیں کہ خدا کے سوا اور کوئی اُن احکام کا واضع نہیں ہوسکتا۔ وراثت کا اصلی اصول یہ ہے کہ متوفی اگر اپنی جائداد کسی خاص شخص کو دے جاتا۔ تو اُسی کو ملتی۔ لیکن جب اُس نے کوئی ہدایت نہیں کی تو اُس پر لحاظ ہوگا کہ اس کے فطری تعلقات کن کن لوگوں کے ساتھ کس کس تفاوت کے ساتھ تھے جو لوگ یہ تعلقات رکھتے ہیں۔ وہ اُسی تفاوت درجات کے ساتھ اُس کی جائداد کے مالک ہونگے۔ گویا متوفی کی یہ معنوی ہدایت ہے۔ کہ لوگوں کو اسی مناسبت سے دیا جائے جس نسبت سے میرے تعلقات اُن کے ساتھ تھے۔ دوسرا اصول جو پولٹیکل اکانمی کا عام اصول ہے یہ ہے کہ دولت کا بہت سے اشخاص میں تقسیم ہونا اس سے اچھا ہے۔ کہ (د) ایک شخص تک محدود رہے۔ یہ عمدہ اصول تمام اور قوموں کی نگاہ سے رہ گئے۔ اور اسوجہ سے اُن کا قانون وراثت بھی ناتمام اور محدود رہ گیا۔ عیسائیوں کے قانون میں بڑے بیٹے کو جائداد پہنچتی ہے۔ دوسرے بھائیوں کو کچھ دست برداشتہ ملتا ہے ہندوں کے ہاں صرف اولاد مذکور جائداد کی مالک ہے۔ باپ بھائی وغیرہ محروم مطلق ہیں۔ لیکن اسلام نے نہایت دقت نظر سے اُن نازک تعلقات پر نگاہ کی جو ورثہ کو متوفی کے ساتھ ہیں اور اُسی نسبت سے تین درجہ قرار دیئے۔ ذوی الفروض۔ عصبات ذوی الارحام۔ ان تینوں درجوں کی تصریح قرآن مجید میں موجود ہے اور خاصکر ذوی الارحام کا ذکر ان آیتوں میں ہے۔ للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون ولکل جعلنا موالی مما ترک الوالدان والاقربون واولی الارحام بعضہم الی بعض امام ابوحنیفہ نے توریث کے احکام میں یہ تینوں مراتب قائم رکھے۔ لیکن امام شافعی و امام مالک نے ذوی الارحام کو سرے سے خارج کردیا۔ چنانچہ اُن کے نزدیک نانا۔ بھتیجیاں۔ بھانجے وغیرہ کسی حال میں ورثہ نہیں پاسکتے ان بزرگوں نے ذوی الارحام کو عام سمجھا ہے اور ذوی الفروض وعصبات اُسکے افراد دئے ہیں۔ جیساکہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں ذکر کیا ہے لیکن یہ ایک صریح غلطی ہے۔

نکاح وطلاق کے متعلق قرآن میں بہت سے احکام مذکور ہیں۔ جنمیں سے بعض بعض میں مجتہدین مختلف الارا ہیں ان اختلافی مسائل میں دو مسئلے نہایت مہتم بالشان ہیں۔ اور ہم اس موقع پر اُنہیں کا ذکر کرتے ہیں۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ امام شافعی کے نزدیک گو عورت بالغہ اور عاقلہ ہو تاہم کسی حالت میں بغیر ولی کی ولایت کے نکاح نہیں کر سکتی امام ابوحنیفہ کے نزدیک بالغہ عاقلہ اپنے نکاح کی آپ مختار ہے اس دعوے پر دونوں طرف سے قرآن کی آیتیں اور حدیثیں پیش کی گئی ہیں۔ احادیث کی بحث کا تو یہ محل نہیں۔ قرآن مجید سے امام شافعی کا جو استدلال ہے اور جسکو خود اُنھوں نے کتاب الاُم میں بڑے شد و مد سے لکھا ہے وہ اس آیت پر مبنی ہے۔ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ۔ ترجمہ "اور جب تم طلاق دو عورتوں کو اور وہ اپنی مدت کو پہنچیں۔ تو اُن کو اس بات سے نہ روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے نکاح کریں"۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ "تَعْضُلُوْهُنَّ میں اولیاے نکاح سے خطاب ہے، اور اُن کو حکم دیا گیا ہے۔ کہ عورتوں کو نکاح سے نہ روکیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اولیاے نکاح کو روکنے کا حق حاصل ہے۔ ورنہ نہی کی کیا ضرورت ہے"۔ امام شافعی نے اس مطلب کی تائید میں آیت کی شان نزول کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ "معقل بن یسار نے اپنی بہن کی شادی اپنے چچیرے بھائی سے کر دی تھی۔ شوہر نے چند روز کے بعد طلاق دیدی۔ لیکن گذر جانے کے بعد اُسکو ندامت ہوئی اور اُس نے دوبارہ نکاح کرنا چاہا عورت بھی راضی ہو گئی معقل نے سنا تو بہن کے پاس گئے اور کہا کہ میں نے نکاح کر دیا تھا۔ اُس نے طلاق دیدی۔ اب میں کبھی اُس سے نکاح نہ ہونے دونگا۔ اُس پر یہ آیت اُتری"۔ امام شافعی نے آیت کے جو معنے لیئے اگر ہم نے خود اُن کی کتاب میں اُسکو تصریحاً نہ دیکھا ہوتا تو ہم کو مشکل سے یقین آتا کہ یہ اُنہیں کا قول ہے۔

اول ہم کو اسپر غور کرنا چاہیئے کہ آیت کے یہ معنے ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ اس قدر تو سب کے نزدیک مسلم ہے کہ طَلَّقْتُمُ میں شوہروں کی طرف خطاب ہے۔ اور جب یہ مسلم ہے تو ضرور ہے کہ تَعْضُلُوْهُنَّ میں بھی انہیں کیطرف خطاب ہو ورنہ عبارت بالکل بے ربط ہو گی۔ کیونکہ اس تقدیر پر آیت کا ترجمہ یہ ہو گا کہ "اے شوہرو! جب تم عورتوں کو طلاق دو اور اپنی مدت کو پہنچ چکیں تو اے نکاح کے اولیاء! تم اُن عورتوں کو نکاح سے نہ روکو" اس عبارت کی بے ربطی میں کون شبہہ کر سکتا ہے؟ شرط میں تو شوہروں سے خطاب ہو اور جزا میں اُن سے کچھ واسطہ نہ ہو اور اولیاے نکاح سے تخاطب کیا جائے۔ یہ کونسا طریقۂ کلام ہے؟ امام رازی باوجودیکہ شافعی ہیں۔ تاہم اُنھوں نے تفسیر کبیر میں صاف تصریح کی ہے کہ "یہ معنی بالکل غلط ہیں۔ اور خدا ایسی بے ربط عبارت بول نہیں سکتا"۔ اگر ہم یہ معنی تسلیم بھی کر لیں۔ تو بھی امام شافعی کا استدلال تمام نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ جو شخص ایک کام سے روکا جائے وہ اُس کام کا حق بھی رکھتا۔

اب ہم اس آیت کا صحیح محمل بیان کرتے ہیں۔ جاہلیت میں اکثر دستور تھا کہ لوگ اپنی بیویوں کو طلاق دیتے تھے اور اس غیرت سے کہ جو عورت اُن کے ہم بستر رہ چکی ہے دوسرے کے آغوش میں نہ جانے پائے۔ اُس عورت کو دوسرا نکاح بھی نہیں کرنے دیتے تھے۔ اس بُری رسم کو خدا نے مٹایا اور یہ آیت نازل کی جسکا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "اے شوہرو۔ جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ چکیں۔ تو اُن کو اس بات سے نہ روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے (یعنی جنکو اب وہ شوہر بنانا چاہتی ہیں) نکاح کریں" امام ابوحنیفہ نے اس آیت کے یہی معنی لئے ہیں اور اس سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ عورتیں نکاح کے معاملہ میں خود مختار ہیں اس استدلال کی زیادہ تائید ینکحن کے لفظ سے ہوتی ہے۔ کیونکہ اس لفظ میں نکاح کے فعل کو عورتوں کیطرف منسوب کیا ہے نہ اولیائے نکاح کیطرف۔

دوسرا مسئلہ تین طلاقوں کا ہے۔ اسقدر تو چاروں ائمہ مجتہدین کے نزدیک مسلم ہے۔ کہ اگر کوئی شخص ایکبار تین طلاق دے تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ اور پھر رجعت نہ ہو سکے گی۔ لیکن اسمیں اختلاف ہے کہ اس طرح طلاق دینا جائز اور مشروع ہے یا نہیں۔ امام شافعی کے نزدیک مشروع ہے اور خدا نے اُسکی اجازت دی ہے امام ابوحنیفہ کے نزدیک۔ حرام اور ممنوع ہے اور طلاق دینے والا گنہگار ہے۔ امام ابوحنیفہ کا استدلال یہ ہے کہ خدا نے طلاق کا جو طریقہ بتلایا ہے وہ اس آیت پر محدود ہے۔ الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان "یعنی طلاق دو بار کرکے ہے پھر یا تو بھلائی کے ساتھ روک لینا ہے یعنی رجعت کر لینا ہے۔ یا احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے" پس اس آیت میں طلاق کا جو طریقہ بتایا گیا صرف وہی شرعی طلاق ہو سکتا ہے۔ بعض لوگوں نے امام ابوحنیفہ کے قول پر یہ اعتراض کیا ہے۔ کہ "اگر ایکبار تین طلاق دینا شرعاً جائز نہیں تو اسکے نفاذ کے کیا معنے۔ حالانکہ نفاذ سے امام ابوحنیفہ کو بھی انکار نہیں"۔ اسکا جواب ایک بڑی نازک بحث پر مبنی ہے جسکا یہ موقع نہیں مگر اجمالاً یہ سمجھ لینا چاہئے کہ کسی کام کا ممنوع ہونا دوسری چیز ہے اور نافذ ہونا دوسری چیز ہے۔ با کا اولاد کو کم و بیش حصوں میں جائداد ہبہ کرنا۔ شرعاً ممنوع ہے۔ لیکن اگر کوئی ناد باپ ایسا کرے تو اُسکا نفاذ ضرور ہوگا۔

اب ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہم امام ابوحنیفہ کی د دعوے کرتے ہیں کہ اُن کے مسائل صحیح اور یقینی ہیں۔ امام ابوحنیفہ مجتہد تھے پیغ اسی لئے اُن کے مسائل میں غلطی کا ہونا ممکن ہے نہ صرف امکان بلکہ ہم د کر سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ خود اُن کے خاص شاگردوں نے بہت سے م

مخالفت کی۔ مدت رضاعت۔ قضا، قاضی کا ظاہراً و باطناً نافذ ہونا۔ قتل بالمثقل۔ نکاح محرمات میں حد کا نہ لازم آنا۔ ان تمام مسائل میں ہمارے نزدیک امام ابو حنیفہ کے مذہب کی کوئی صحیح تاویل نہیں ہوسکتی ایسے اور بھی مسائل ہیں۔ لیکن ہمارا مقصد اس موقع پر صرف یہ ہے کہ ایک مجتہد کا جس حد تک صائب الرائے ہونا ممکن ہے امام صاحب اُس حد تک صائب الرائے تھے۔

خاتمہ

امام صاحب کے تلامذہ

ایشائی ملکوں میں اگرچہ شاگردی اور اُستادی کا تعلق عموماً نہایت قوی تعلق ہوتا ہے لیکن بعض شاگردوں کو مختلف وجوہ سے کچھ ایسی خصوصیت ہو جاتی ہے کہ جہاں اُستاد کا نام آتا ہے ممکن نہیں کہ اُنکا نام نہ آئے جیساکہ ہم اس کتاب کے پہلے حصہ میں لکھ آئے ہیں امام ابو حنیفہ کی درس تدریس کا دائرہ اسقدر وسیع تھا کہ خلیفہ وقت کی حدود حکومت اس سے زیادہ وسیع نہ تھیں۔ حافظ ابوالمحاسن شافعی نے نوسو اٹھارہ شخصوں کے نام بقید نام و نسب لکھے ہیں جو امام صاحب کے حلقہ درس سے مستفید ہوئے تھے۔ اس گروہ میں
[...]ے چند بزرگ ایسے ہیں جنکی بیوگرفی کے بغیر امام صاحب کی علمی تاریخ ناتمام رہتی ہے چالیس
[...]ں جو امام صاحب کے ساتھ فقہ کی ترتیب و تدوین میں شریک تھے۔ اُن کے شاگرد
[...]دتمند خاص تھے۔ امام صاحب کی زندگی کا بڑا کارنامہ فقہ ہے۔ اسی لئے یہ
[...]ہے کہ امام صاحب کی تاریخ میں انہی لوگوں کا ذکر چھوڑ دیا جائے جو ایسے بڑے
[...]کے شریک اور مددگار تھے۔ ان لوگوں کے حالات صرف امام ابوحنیفہ کی
[...]نہیں ہیں، بلکہ اُس سے عام طور پر حنفی فقہ کے متعلق ایک اجمالی خیال قائم ہوتا
[...]ظمت وشان سے فقہ حنفی کی خوبی اور عمدگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

ساتھ ہی امام صاحب کا بلند رتبہ ہونا ثابت ہوتا ہے کہ جس شخص کے شاگرد اس رتبہ کے ہونگے وہ خود کس پایہ کا ہوگا۔ خطیب بغدادی نے وکیع بن الجراح کے حال میں جو ایک مشہور محدّث[1] تھے لکھا ہے کہ ایک موقع پر وکیع کے پاس چند اہل علم جمع تھے۔ کسی نے کہا۔ کہ اس مسئلہ میں ابوحنیفہ نے غلطی کی۔ وکیع بولے کہ "ابوحنیفہ کیونکر غلطی کرسکتے ہیں بلا ابویوسف و زفر قیاس میں۔ یحییٰ بن زایدہ حفص بن غیاث حبان۔ مندل۔ حدیث میں قاسم بن معن لغت و عربیت میں۔ داؤد الطائی و فضیل بن عیاض زہد و تقویٰ میں۔ اس رتبہ کے لوگ جس شخص کے ساتھ ہوں وہ کہیں غلطی کرسکتا ہے اور کرتا بھی تو یہ لوگ اُسکو کب غلطی پر رہنے دیتے۔"

شاگرد کا رتبہ و اعزاز اُستاذ کے لئے باعث فخر خیال کیا جاتا ہے۔ اگر یہ فخر صحیح ہے۔ تو اسلام کی تمام تاریخ میں کوئی شخص امام ابوحنیفہ سے بڑھ کر اس فخر کا مستحق نہیں ہے امام صاحب اگر یہ دعویٰ کرتے تو بالکل بجا تھا کہ جو لوگ امام صاحب کے شاگرد تھے وہ بڑے بڑے ائمہ مجتہدین کے شیخ اور اوستاد تھے امام شافعی ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ میں نے امام محمد سے ایک بار شتر علم حاصل کیا ہے[2]۔ یہ وہی امام محمد ہیں جو امام ابوحنیفہ کے مشہور شاگرد ہیں اور جنکی تمام عمر۔ امام صاحب کی حمایت میں صرف ہوئی۔ انصاف یہ ہے کہ امام صاحب کے بعض شاگرد خصوصاً قاضی ابویوسف۔ و امام محمد۔ اس رتبہ کے عالم تھے کہ اگر امام ابوحنیفہ کی تبعیت سے الگ ہوکر مستقل اجتہاد کا دعویٰ کرتے تو اُن کا جدا طریقہ قائم ہوجاتا۔ اور امام مالک و شافعی کی طرح اُن کے بھی ہزاروں لاکھوں مقلد بن جاتے۔

امام صاحب کے زمانہ میں جو مذہبی علوم نہایت اوج و ترقی پر تھے وہ فقہ۔ حدیث اسماء الرجال تھے۔ یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ جو لوگ ان علوم کے ارکان تھے اکثر امام صاحب ہی کے شاگرد تھے اور شاگرد بھی برائے نام شاگرد نہ تھے بلکہ مدتوں امام صاحب کی صحبت میں رہے اور اُنکی فیض صحبت کا ہمیشہ اعتراف کرتے رہے۔ فقہ کے متعلق تو غالباً کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ لیکن حدیث کی نسبت اس دعویٰ پر لوگوں کو تعجب ہوگا۔ اور یہ تعجب بجا ہے کیونکہ امام صاحب کی شاگردی کے تعلق سے جو لوگ مشہور ہوئے وہ اکثر فقیہ ہی تھے محدثین میں سے جو امام صاحب کے شاگرد ہیں اگرچہ بجائے خود شہرت عام رکھتے ہیں

[1] وکیع کا مستقل ترجمہ اس کتاب کے آیندہ صفحوں میں دیکھو ۱۲ [2] ہمارے زمانہ کے کم نظروں کو اس روایت سے تعجب ہوگا اور وہ اسکو حنفیوں کی گڑھت سمجھیں گے مگر اُن کو معلوم ہونا چاہئے کہ علامہ نودی نے جو مشہور محدث ہیں۔ اس روایت کی تصدیق کی ہے۔ دیکھو تہذیب الاسما و اللغات نودی۔ ترجمہ امام محمد ۱۲

لیکن اُن کی شاگردی کا تعلق چنداں مشہور نہیں۔ پس اِس موقع پر جن لوگوں کے نام لکھونگا اِس تعلق کا ذکر بھی خصوصیت کے ساتھ کرونگا اور رجال کی نہایت معتبر کتابوں کا حوالہ دوں گا۔

امام صاحب کے بیشمار شاگردوں میں سے ہم اُن چالیس شخصوں کا مختصر تذکرہ لکھنا چاہتے تھے جو امام صاحب کے ساتھ تدوین فقہ میں شریک تھے لیکن افسوس ہے کہ ہم اُن میں سے صرف چند شخصوں کا نام معلوم کر سکے یعنی قاضی[1] ابو یوسف۔ زفر۔ اسد بن عمر۔ عافیہ الازدی۔ داؤد الطائی۔ قاسم بن معن۔ علی بن مسہر۔ یحیٰی بن زکریا۔ حبان۔ مندل[2] چنانچہ ان لوگوں کے مختصر حالات ہم ذیل میں لکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اُن شاگردوں کا ذکر بھی ضرور ہے جو حدیث و رجال کے فن میں امام وقت تھے چنانچہ پہلے ہم اُنہی سے شروع کرتے ہیں۔

یحیٰی بن سعید القطان

فن رجال کا سلسلہ انہی سے شروع ہوا علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ فن رجال میں اول جس شخص نے لکھا وہ یحیٰی بن سعید القطان ہیں پھر ان کے بعد اُن کے شاگردوں میں یحیٰی بن معین۔ علی بن المدینی۔ امام احمد حنبل۔ عمرو بن علی الفلاس ابو خیثمہ نے اس فن میں گفتگو کی۔ اور اُنکے بعد اُن کے شاگردوں یعنی امام بخاری و مسلم وغیرہ نے حدیث میں اُن کا یہ پایا تھا کہ جب حلقہ درس میں بیٹھتے تو امام احمد بن حنبل علی بن المدینی وغیرہ مودب کھڑے ہو کر ان سے حدیث کی تحقیق کرتے اور نماز عصر سے جو اُن کے درس کا وقت تھا مغرب تک برابر کھڑے رہتے[2]۔ راویوں کی تحقیق و تنقید میں یہ کمال پیدا کیا تھا کہ ائمہ حدیث عموماً کہا کرتے تھے کہ یحیٰی جس کو چھوڑ دینگے ہم بھی چھوڑ دینگے[3] امام احمد بن حنبل کا مشہور قول ہے کہ ما رایت بعینی مثل یحیی بن سعید القطان[4] یعنی میں نے اپنی آنکھوں سے یحیٰی کا مثل نہیں دیکھا" اس فضل و کمال کے ساتھ امام ابو حنیفہ کے حلقہ درس میں اکثر شریک ہوتے اور اُن کی شاگردی پر فخر کرتے۔ اُس زمانہ تک تقلید معین کا

[1] ان لوگوں کا ذکر اس حیثیت سے مورخ خطیب نے قاضی ابو یوسف کے ترجمہ میں لکھا ہے دیکھو مختصر تاریخ بغداد ترجمہ ابو یوسف ۱۲
[1] فتح المغیث وجواہر المضیئہ ۱۲ [2] تہذیب التہذیب حافظ بن حجر ترجمہ یحیٰی القطان ۱۲ [3] میزان الاعتدال علامہ ذہبی دیباچہ ۱۲

رواج نہیں ہوا تھا تاہم اکثر مسائل میں وہ امام صاحب ہی کی تقلید کرتے تھے خود اُن کا قول ہے نتقلد لخذنا باقواله یعنے ہم نے امام ابو حنیفہ کے اکثر اقوال اخذ کیئے علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں جہاں وکیع بن الجراح کا ذکر کیا ہے لکھا ہے ۔ یفتی بقول ابی حنیفة وکان یحیٰی القطان یفتی بقوله ایضاً یعنی وکیع امام ابو حنیفہ کے قول پر فتوے دیتے تھے اور یحییٰ قطان بھی انہیں کے قول پر فتوے دیتے تھے ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸ھ میں بمقام بصرہ وفات پائی

عبداللہ بن المبارک

محدث نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں اُن کا ذکر ان لفظوں سے کیا ہے" وہ امام جس کی امامت وجلالت پر ہر باب میں عموماً اجماع کیا گیا ہے جسکے ذکر سے خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے جسکی محبت سے مغفرت کی امید کیجا سکتی ہے"

حدیث میں جو ان کا پایہ تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ محدثین ان کو امیر المومنین فی الحدیث کے لقب سے پکارتے تھے ایک موقع پر انکے شاگردوں میں سے ایک شخص نے انسے خطاب کیا کہ یا عالم المشرق ۔ امام سفیان ثوری جو مشہور محدث ہیں اس موقع پر موجود تھے بولے کہ تم کیا غضب ہے عالم مشرق کہتے ہو وہ عالم الشرق والمغرب ہیں" امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ عبداللہ بن المبارک کے زمانہ میں اُن سے بڑھ کر کسی نے حدیث کی تحصیل میں کوشش نہیں کی" خود عبداللہ بن المبارک کا بیان ہے کہ" میں نے چار ہزار شیوخ سے حدیث سیکھی جن میں سے ہزار سے روایت کی" صحیح بخاری و مسلم میں ان کی روایت سے سینکڑوں حدیثیں مروی ہیں ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ فن روایت کے بڑے ارکان میں سے ہیں ۔ حدیث وفقہ میں ان کی بہت سی تصنیفات ہیں لیکن افسوس کہ آج ان کا پتہ نہیں ۔ ان کے فضل وکمال زہد وتقوے نے ان تدر لوگوں کو مسخر کر لیا تھا کہ بڑے بڑے اُمرا و سلاطین کو وہ رتبہ حاصل نہ تھا ایکدفعہ خلیفہ ہارون الرشید رقہ گیا اسی زمانہ میں عبداللہ بن المبارک بھی رقہ پہنچے ۔ ان کے آنے کی خبر مشہور ہوئی تو ہر طرف سے لوگ دوڑے اور اس قدر کشمکش ہوئی کہ لوگوں کی جوتیاں ٹوٹ گئیں ۔ ہزاروں آدمی ساتھ ہوئے اور ہر طرف گرد چھا گئی ۔

۱؎ تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر ترجمہ امام ابو حنیفہ ۱۲ ۲؎ تہذیب الاسماء واللغات علامہ نووی ۱۲

۳؎ خلاصہ تہذیب الکمال ترجمہ عبداللہ بن المبارک ۱۲

ہرون الرشید کی ایک حرم نے جو برج کے غرفہ سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی حیرت زدہ ہوکر پوچھا کہ یہ کیا حال ہے۔ لوگوں نے کہا "خراسان کا عالم آیا ہے جس کا نام عبداللہ بن المبارک ہے" بولی کہ حقیقت میں سلطنت اس کا نام ہے ہرون الرشید کی حکومت بھی کوئی حکومت ہے کہ پولیس اور سپاہیوں کے بغیر ایک آدمی بھی حاضر نہیں ہوسکتا۔[1]

یہ امام ابوحنیفہ کے مشہور شاگردوں میں اور امام صاحب کے ساتھ ان کو خاص خلوص تھا۔ ان کو اعتراف تھا کہ جو کچھ مجھ کو حاصل ہوا امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری کے فیض سے حاصل ہوا۔ اُن کا مشہور قول ہے کہ

"یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے ابوحنیفہ و سفیان کے ذریعہ سے میری دستگیری نہ کی ہوتی تو میں ایک عام آدمی سے بڑھ کر نہ ہوتا" امام ابوحنیفہ کی شان میں ان کے اشعار اکثر منقول ہیں خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں چند اشعار نقل کئے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ شعر ہے ؎

رایت اباحنیفۃ حین تولی ویطلب علمہ بحرا عزیز

مرو کے رہنے والے تھے ۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۱ھ میں مقام ہیت وفات پائی

یحییٰ بن زکریا بن ابی زایدۃ

مشہور محدث تھے۔ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں صرف اُن لوگوں کا تذکرہ لکھا ہے۔ جو حافظ الحدیث کہلاتے تھے۔ چنانچہ یحییٰ کو بھی انہیں لوگوں میں داخل کیا ہے۔ اور ان کے طبقہ میں سب سے پہلے انہیں کا نام لکھا ہے علی بن المدینی جو امام بخاری کے مشہور اُستاد ہیں کہا کرتے تھے کہ "یحییٰ کے زمانہ میں یحییٰ پر علم کا خاتمہ ہوگیا"[2] صحاح ستہ میں ان کی روایت سے بہت سی حدیثیں ہیں۔ وہ محدث اور فقیہ دونوں تھے اور ان دونوں فنوں میں بہت بڑا کمال رکھتے تھے چنانچہ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان کا ترجمہ ان لفظوں سے شروع کیا ہے۔ احد الفقہاء الکبار والمحدثین الاثبات۔

یہ امام ابوحنیفہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور مدت تک اُن کے ساتھ رہے تھے۔ یہانتک کہ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو صاحب ابی حنیفہ کا لقب دیا ہے یہ تدوین

---

[1] تاریخ ابن خلکان ترجمہ عبداللہ بن المبارک ۱۲ [2] تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر۔ ترجمہ امام ابوحنیفہ ۱۲

[3] میزان الاعتدال علامہ ذہبی ترجمہ یحییٰ ۱۲

فقہ میں امام صاحب کے شریک اعظم تھے۔ امام طحاوی نے لکھا ہے کہ تیس برس تک وہ شریک رہے۔ اگرچہ یہ مدت صحیح نہیں لیکن کچھ شبہ نہیں کہ وہ بہت دن تک امام صاحب کے ساتھ تدوین فقہ کا کام کرتے رہے اور خاص کر تصنیف و تحریر کی خدمت انہی سے متعلق تھی[1]۔ میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ "بعض لوگوں کا قول ہے کہ کوفہ میں اوّل جس شخص نے تصنیف کی وہ یحییٰ ہیں"۔ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ تحریر کا کام یحییٰ سے متعلق تھا۔ اس لئے بعض لوگوں نے انہی کو مستقل مصنف سمجھ لیا۔

مداین میں منصب قضا پر ممتاز تھے اور وہیں ۱۸۲ھ میں ۶۳ برس کی عمر میں وفات پائی۔

وکیع بن الجراح

فن حدیث کے ارکان میں شمار کئے جاتے ہیں۔ امام احمد حنبل کو ان کی شاگردی پر فخر تھا۔ چنانچہ جب وہ انکی روایت سے کوئی حدیث بیان کرتے تھے تو ان لفظوں سے شروع کرتے تھے "یہ حدیث مجھ سے اس شخص نے روایت کی کہ تیری آنکھوں نے اسکا مثل نہ دیکھا ہوگا[1]۔" یحییٰ بن معین جو فن رجال کے ایک رکن خیال کئے جاتے ہیں انکا قول تھا کہ "میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس کو وکیع پر ترجیح دوں[2]۔" اکثر ائمہ حدیث نے انکی شان میں اس قسم کے الفاظ لکھے ہیں۔ بخاری و مسلم میں اکثر انکی روایت سے حدیثیں مذکور ہیں فن حدیث و رجال کے متعلق ان کی روایتیں اور رائیں نہایت مستند خیال کیجاتی ہیں۔

یہ امام ابوحنیفہ کے شاگرد خاص تھے اور ان سے بہت سی حدیثیں سنی تھیں اکثر مسائل میں امام صاحب کی تقلید کرتے تھے اور انہی کے قول کے موافق فتوے دیتے تھے خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے۔ کان یفتی بقول ابی حنیفۃ وکان قد سمع منہ شیئاً کثیراً علامہ ذہبی نے بھی تذکرۃ الحفاظ میں اس کی تصدیق کی ہے ۱۹۷ھ میں وفات پائی۔

یزید بن ہرون

فن حدیث کے مشہور امام ہیں۔ بڑے بڑے ائمہ حدیث ان کے شاگرد تھے امام احمد حنبل علی بن المدینی یحییٰ بن معین۔ ابن ابی شیبہ وغیرہ نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی

[1] الجواہر المضیئۃ ترجمہ یحییٰ ۱۲ [2] تہذیب الاسماء واللغات علامہ نووی ترجمہ وکیع بن الجراح ۱۲ [3] تہذیب التہذیب ۱۲

[4] حافظ عبدالبر کے قول میں سمعت منہ شیئا کثیرا کے بجائے "حدیثا" کا لفظ ہے جو صاف اور صریح ہے ... دیکھو عقود الجمان خاتمہ فصل اوّل ۱۲

یہ کہا ہے۔ علامہ نووی نے ان کے تلامذہ کی نسبت لکھا ہے کہ انکا شمار نہیں ہو سکتا یحییٰ بن ابی طالب کا بیان ہے کہ ایک بار میں ان کی حلقۂ درس میں شریک تھا۔ لوگ تخمینہ کرتے تھے کہ حاضرین کی تعداد کم و بیش ستر ہزار تھی[1] کثرت حدیث میں لوگ ان کی مثال دیتے تھے خود ان کا بیان ہے کہ "مجھ کو بیس ہزار حدیثیں یاد ہیں[2] علی بن المدینی (امام بخاری کے استاد) کہا کرتے تھے کہ میں نے ان سے زیادہ کسی کو حافظ حدیث نہیں دیکھا۔

فن حدیث میں ان کو امام ابو حنیفہؓ سے تلمذ تھا۔ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں جہاں ان لوگوں کے نام لکھے ہیں جنہوں نے امام صاحب سے حدیثیں روایت کیں ان کا نام بھی لکھا ہے یہ ایک مدت تک امام صاحب کی صحبت میں رہے اور اسی وجہ سے انکو امام صاحب کے اخلاق و عادات پر رائے قائم کرنے کا کافی موقع ملا تھا۔ ان کا قول ہے کہ میں نے بہت سے لوگوں کی صحبت اوٹھائی لیکن ابو حنیفہ سے کسی کو بڑھ کر نہیں پایا[3] ۱۱۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۰۶ھ میں وفات پائی۔

حفص بن غیاث

بہت بڑے محدث تھے خطیب بغدادی نے انکو کثیر الحدیث لکھا ہے اور علامہ ذہبی نے انکو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے امام احمد حنبل۔ علی بن المدینی وغیرہ نے ان سے حدیثیں روایت کیں۔ یہ اس خصوصیت میں ممتاز تھے کہ جو کچھ روایت کرتے تھے زبانی کرتے تھے کاغذ یا کتاب پاس نہیں رکھتے تھے چنانچہ اسطرح جو حدیثیں روایت کیں۔ اس کی تعداد تین یا چار ہزار ہے[4] یہ امام صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں امام صاحب کے شاگردوں میں چند بزرگ نہایت مقرب اور با اخلاص تھے جنکی نسبت وہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ "تم میرے دل کی تسکین اور میرے غم کے مٹانے والے ہو" حفص کی نسبت بھی امام صاحب نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے ہیں[5] مختصر تاریخ بغداد میں ان کی نسبت لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے مشہور شاگردوں میں تھے۔

مدت تک دنیاوی تعلقات سے آزاد رہے لیکن آخر میں ضرورتوں نے بہت تنگ کیا اتفاق یہ کہ انہی دنوں میں یعنی ۱۷۷ھ میں ہرون الرشید نے اُن کا شہرہ سن کر انکو طلب کیا اور قضا کی خدمت سپرد کی۔ چونکہ قرض سے زیر بار تھے مجبوراً قبول کرنا پڑا۔ قاضی ابو یوسف قاضی القضاۃ

[1] تہذیب الاسماء واللغات نووی ترجمہ یزید بن ہرون ۱۲ [2] تہذیب الاسماء واللغات ۱۲ [3] تہذیب الکمال حافظ مزی ترجمہ امام ابو حنیفہ ۱۲ [4] میزان الاعتدال ترجمہ حفص ۱۲ [5] الجواہر المضیئۃ ترجمہ حفص بن غیاث ۱۲

تھے اور قضا کا تمام سررشتہ اُن کے اہتمام میں تھا۔ چونکہ ہرون الرشید نے قاضی صاحب کے بغیر اطلاع حفص کو مقرر کردیا اسی لئے اُن کو فی الجملہ خیال ہوا اور حسن بن زیاد سے کہا کہ حفص کے فیصلے ہمارے مرافعہ میں آئیں تو اُن کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے لیکن جب اُن کے فیصلے دیکھے تو اعتراف کیا کہ حفص کے ساتھ تائید الٰہی ہے[1]

سنہ ۱۱۷ھ میں پیدا ہوئے۔ تیرہ برس کوفہ میں اور دو برس بغداد میں قاضی رہے۔ سنہ ۱۹۶ھ میں وفات پائی۔

ابو عاصم النبیل

ان کا نام ضحاک بن مخلد ہے مشہور محدث ہیں۔ صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں انکی روایت سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں۔ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ "انکی توثیق پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے" نہایت پارسا اور متورع تھے۔ امام بخاری نے روایت کی ہے کہ ابو عاصم نے خود کہا کہ "جب سے مجھ کو معلوم ہوا کہ غیبت حرام ہے میں نے آج تک کسی کی غیبت نہیں کی"۔

ان کا لقب نبیل تھا جس کے معنی معزز کے ہیں۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ لقب کیوں ہوا؟ ایک روایت ہے کہ ایک دفعہ شعبہ نے کسی وجہ سے قسم کھائی کہ میں حدیث نہیں روایت کرونگا" چونکہ وہ بہت بڑے محدث تھے اور ان کے درس سے ہزاروں طلبا مستفید ہوتے تھے۔ لوگوں کو بہت تشویش ہوئی۔ ابو عاصم نے یہحال سنا تو اُسی وقت شعبہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ "میں اپنے غلام کو آپ کی قسم کے کفارہ میں آزاد کرتا ہوں۔ آپ قسم توڑ ڈالئے اور حدیث کا درس دیجئے"۔ شعبہ کو ان کے شوق اور ہمت پر تعجب ہوا اور فرمایا کہ انت نبیل اُس وقت سے یہ لقب مشہور ہو گیا[2]۔

یہ بھی امام صاحب کے مختص شاگردوں میں تھے[3]۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ کسی نے ان سے پوچھا کہ "سفیان ثوری زیادہ فقیہ ہیں۔ یا ابوحنیفہ" بولے کہ "معارضہ تو اُن چیزوں میں ہوتا ہے جو ایک دوسری سے ملتی جلتی ہوں۔ ابوحنیفہ نے فقہ کی بنیاد ڈالی ہے اور سفیان صرف فقیہ ہیں"۔

سنہ ۲۱۲ھ میں نوے برس کی عمر میں وفات پائی۔

---

[1] الجواہر المضیئہ۔ ترجمہ حفص بن غیاث ۱۲ [2] الجواہر المضیئہ۔ ترجمہ ابو عاصم ۱۲

[3] الجواہر المضیئہ ۱۲

عبدالرزاق بن ہمام

علامہ ذہبی نے ان کا ترجمہ ان لفظوں سے شروع کیا ہے

بہت بڑے نامور محدث تھے صحیح بخاری و مسلم وغیرہ ان کی روایتوں سے مالامال ہیں۔ امام احمد حنبل سے کسی نے پوچھا کہ حدیث کی روایت میں آپ نے عبد الرزاق سے بڑھکر کسی کو دیکھا؟ جواب دیا کہ "نہیں"۔ بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً امام سفیان بن عیینہ۔ یحییٰ بن معین۔ علی بن المدینی امام احمد حنبل۔ فن حدیث میں ان کے شاگرد تھے طالبان حدیث بہت دور سے قطع منازل کر کے انکی خدمت میں سیکھنے جاتے تھے۔ یہانتک کہ بعضوں کا قول ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کے پاس قدر دور دراز مسافتیں طے کر کے لوگ نہیں گئے۔

حدیث میں انکی ایک ضخیم تصنیف موجود ہے جو جامع عبد الرزاق کے نام سے مشہور ہے امام بخاری نے اعتراف کیا ہے کہ "میں اس کتاب سے مستفید ہوا ہوں"۔ علامہ ذہبی نے اس کتاب کی نسبت میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ "علم کا خزانہ ہے"۔

ان کو ابو حنیفہ سے فن حدیث میں تلمذ تھا۔ عقود الجمان کے مختلف مقامات سے ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب کی صحبت میں زیادہ رہے۔ چنانچہ اُنکے اخلاق و عادات کے متعلق اُن کے اکثر اقوال کتابوں میں مذکور ہیں۔ اُن کا قول تھا کہ "میں نے امام ابو حنیفہ سے بڑھ کر کسی کو حلیم نہیں دیکھا"۔

۱۲۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۱۱ھ میں انتقال کیا۔

داود الطائی

خدا نے عجب حسن قبول دیا تھا۔ صوفیہ ان کو بہت بڑا مرشد کامل مانتے ہیں تذکرۃ اولیا میں ان کے مقامات عالیہ مذکور ہیں۔ فقہا اور خصوصاً فقہائے حنفیہ ان کے تفقہ اور اجتہاد کے قائل ہیں محدثین کا قول ہے کہ ثقہ بلا نزاع اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ان تمام القاب کے مستحق تھے محارب بن دثار جو مشہور محدث تھے کہا کرتے تھے کہ "داود اگر اگلے زمانہ میں ہوتے تو خدا قرآن مجید میں اُن کا قصہ بیان کرتا"۔

ا؎ انساب سمعانی و تاریخ یافعی ترجمہ عبد الرزاق بن ہمام ۲؎ میزان الاعتدال ذہبی ۱۲

۳؎ تاریخ ابن خلکان ۱۲

ابتدا میں فقہ وحدیث کی تحصیل کی پھر علم کلام میں کمال پیدا کیا اور بحث و مناظرہ میں مشغول ہوئے۔ ایکدن کسی موقع پر ایک شخص سے گفتگو کرتے کرتے اُسپر کنکری پھینک ماری۔ اُس نے کہا "داؤد! تمہاری زبان اور ہاتھ دونوں دراز ہو چلے"۔ اُن پر عجیب اثر ہوا۔ بحث ومناظرہ بالکل چھوڑ دیا تاہم تحصیل علم کا مشغلہ جاری تھا۔ برس دن کے بعد کل کتابیں دریا میں ڈبو دیں اور تمام چیزوں سے قطع تعلق کر لیا۔ امام محمد کا بیان ہے کہ "میں داؤد سے اکثر مسئلہ پوچھنے جاتا۔ اگر کوئی ضروری اور عملی مسئلہ ہوتا تو بتا دیتے ورنہ کہتے کہ بھائی! مجھے اور ضروری کام ہیں"۔ یہ امام ابو حنیفہ کے مشہور شاگرد ہیں۔ خطیب بغدادی۔ ابن خلکان علامہ ذہبی اور دیگر مورخین نے جہاں اُن کے حالات لکھے ہیں امام صاحب کی شاگردی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ تدوین فقہ میں بھی امام صاحب کے شریک تھے اور اُس مجلس کے معزز ممبر تھے سنہ ۱۶۰ھ میں وفات پائی ان بزرگوں کے سوا اور بھی بہت سے نامور محدثین مثلاً فضل بن دکین۔ حمزہ بن حبیب الزیات۔ ابراہیم بن طہمان۔ سعید بن اوس۔ عمر بن میمون فضل بن موسیٰ۔ وغیرہ امام صاحب کے تلامذہ میں داخل ہیں۔ لیکن ہم نے صرف اُن لوگوں کا ذکر کیا ہے جو تلامذہ خاص کہے جا سکتے ہیں۔ اور جو مدتوں امام صاحب کی صحبت سے مستفید ہوئے ہیں۔

فقہاء

جو تدوین فقہ میں شریک تھے

قاضی ابو یوسف

ان کی منزلت اور عظمتِ شان اس قابل تھی کہ ان کا مستقل تذکرہ لکھا جاتا اور جب ہی ان کے علمی کمالات کا اندازہ بھی ہو سکتا۔ لیکن یہ فرصت کے کام ہیں خدا کسی کو توفیق دے تو یہ کام پورا ہو سکتا ہے۔ اس کتاب کے موضوع کے لحاظ سے میرا اسی قدر فرض ہے کہ اُن کی مختصر تاریخ لکھدوں جس سے اُن کی لائف اور علمی کمالات پر ایک اجمالی رائے قائم ہو سکے اُن کا نسب انصار سے ملتا ہے اُن کے مورث اعلیٰ سعد بن حبتہ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے تھے۔ ان کے باپ ایک غریب آدمی تھے۔ اور مزدوری محنت کر کے زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ سنہ ۱۱۳ھ یا سنہ ۱۱۷ھ میں بمقام کوفہ پیدا ہوئے۔ ان کو اگرچہ بچپن سے

لکھنے پڑھنے کا ذوق تھا۔ لیکن باپ کی مرضی نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی پیشہ سیکھیں۔ اور گھر میں چار پیسے کما کر لائیں۔ تاہم قاضی صاحب جب موقع اور فرصت پاتے علما کی صحبت میں جا بیٹھتے۔ ایک دن امام ابوحنیفہ کے حلقۂ درس میں حاضر تھے۔ کہ ان کے باپ پہنچے۔ اور وہاں سے زبردستی اُٹھا لائے۔ گھر پر آکر سمجھایا کہ بیٹا ابوحنیفہ کو خدا نے رزق کی طرف سے اطمینان دیا ہے۔ تم اُن کی ریس کیوں کرتے ہو؟ قاضی صاحب نے مجبوراً لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا اور باپ کے ساتھ رہنے لگے۔ امام ابوحنیفہ نے دو چار دن کے بعد لوگوں سے پوچھا کہ یعقوب اب نہیں آتے" اُن کو امام صاحب کی جستجو کا حال معلوم ہوا تو حاضر ہوئے۔ اور ساری کیفیت بیان کی امام صاحب نے چپکے سے ایک تھیلی حوالہ کی گھر پر آکر دیکھا۔ تو اس میں سو درہم تھے۔ امام صاحب نے ان سے یہ بھی کہہ دیا کہ جب خرچ ہو چکے تو مجھ سے کہنا۔ اسی طرح برابر ان کو مدد دیتے رہے۔ یہاں تک کہ قاضی صاحب نے تمام علوم میں کمال حاصل کیا۔ اور اُستادِ وقت بن گئے۔

تحصیل علوم کے سامان

قاضی صاحب نے امام ابوحنیفہ کے علاوہ اور بہت سے ائمہ وقت کی خدمت میں علم کی تحصیل کی۔ اعمش، ہشام بن عروہ، سلیمان تیمی، ابو اسحق شیبانی، یحیی بن سعید الانصاری وغیرہ سے حدیثیں روایت کیں۔ محمد بن اسحق سے مغازی و سیر پڑھی۔ محمد بن ابی لیلیٰ سے فقہ کے مسائل سیکھے۔ خدا نے ذہن و حافظ ایسا قوی دیا تھا کہ ایک ہی زمانہ میں ان تمام علوم کی تحصیل کرتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر نے جو ایک مشہور محدث ہیں لکھا ہے۔ کہ "ابو یوسف محدثین کے پاس حاضر ہوتے اور ایک جلسہ میں پچاس ساٹھ حدیثیں سن کر یاد کر لیتے"

عہد

امام ابوحنیفہ جب تک زندہ رہے۔ قاضی صاحب اُن کے حلقۂ درس میں ہمیشہ حاضر ہوتے رہے۔ اُنکی وفات کے بعد دربار سے تعلق پیدا کرنا چاہا۔ چنانچہ خلیفہ مہدی عباسی نے سنہ ۱۶۶ھ میں ان کو قاضی کی خدمت دی۔ مہدی کے بعد اُس کے جانشین ہادی نے بھی ان کو اُسی عہدہ پر بحال رکھا۔ لیکن ہرون الرشید نے ان کی لیاقتوں سے واقف ہو کر تمام ممالک اسلامیہ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا اور یہ وہ عہدہ تھا جو اُس وقت تک اسلام کی تاریخ میں کسی کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ بلکہ زمانۂ مابعد میں بھی بجز قاضی احمد بن ابی داؤد کے اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ قاضی صاحب نے سررشتۂ قضا میں جو ترقیاں کیں۔ اُن کی تفصیل خود اُن کی لائف لکھی جائے۔ تو لکھی جا سکتی ہے۔

جمعرات کے دن ظہر کے وقت ربیع الاول کی پانچویں تاریخ سنہ ۱۸۲ھ میں وفات پائی۔ محمد بن سماعہ کا بیان ہے کہ مرتے وقت یہ الفاظ اُن کی زبان پر تھے "اے خدا تو جانتا ہے کہ میں نے

کوئی فیصلہ عمداً خلاف واقع نہیں کیا۔ میری ہمیشہ کوشش رہی کہ جو فیصلہ ہو تیری کتاب اور تیرے پیغمبر کے طریقہ کے موافق ہو۔ جب کوئی مشکل مسئلہ آتا تھا تو میں امام ابو حنیفہ کو واسطہ بناتا تھا اور جہاں تک مجھ کو معلوم ہے ابو حنیفہ تیرے احکام کو خوب سمجھتے تھے۔ اور عمداً حق کے راستہ سے باہر نجاتے تھے۔" قاضی صاحب بہت بڑے دولتمند تھے۔ لیکن دولت کا استعمال اچھی طرح کیا۔ مرتے وقت وصیت کی کہ چار لاکھ روپیے مکہ معظمہ مدینہ منورہ کوفہ بغداد کے محتاجوں کو دئے جائیں۔

قاضی صاحب متعدد علوم میں کمال رکھتے تھے۔ اگرچہ اُن کی شہرت زیادہ تر فقہ میں ہوئی۔ لیکن اور علوم میں بھی وہ اپنے آپ ہی نظیر تھے۔ مورخ بن خلکان نے ہلال بن یحیٰی کا قول نقل کیا ہے کہ ابو یوسف تفسیر مغازی ایام العرب کے حافظ تھے اور فقہ اُن کا ادنی سا علم تھا"۔ حدیث میں اُن کا یہ پایا تھا کہ حفاظ حدیث میں شمار کئے جاتے تھے۔ چنانچہ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اُن کا ترجمہ لکھا ہے یحیٰی بن معین کہا کرتے تھے کہ "اہل الرائے میں ابو یوسف سے بڑھ کر کوئی شخص کثیر الحدیث نہیں"۔ امام احمد حنبل کا قول ہے کہ"

مزنی جو امام شافعی کے مشہور شاگرد ہیں کہا کرتے تھے

خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں امام احمد حنبل کا قول نقل کیا ہے کہ "اول جب مجھ کو علم حدیث کا شوق پیدا ہوا تو ابو یوسف کی خدمت میں حاضر ہوا" یحیٰی بن معین و امام احمد حنبل اور بہت سے ائمہ حدیث نے قاضی صاحب سے حدیثیں روایت کیں۔ اس سے زیادہ اُن کی عظمت شان کی کیا دلیل ہوگی[2]

فقہ میں جو اُن کا پایہ ہے اُس سے کون انکار کرسکتا ہے امام ابو حنیفہ کو خود اُن کے کمال کا اعتراف تھا۔ ایک دفعہ وہ بیمار ہوئے۔ امام صاحب عیادت کو گئے۔ واپس آئے۔ تو ساتھیوں سے کہا کہ "خدانخواستہ اگر یہ شخص ہلاک ہوا تو دنیا کا عالم ہلاک ہوا"۔ اور ائمہ بھی اُن کے حدت ذہن اور قوت فہم کے معترف تھے۔ امام اعمش اُس زمانہ کے ایک مشہور محدث تھے اُنہوں نے قاضی صاحب سے ایک مسئلہ پوچھا۔ اُنھوں نے جواب بتایا امام اعمش نے کہا۔ اس پر کوئی سند بھی ہے؟ قاضی صاحب نے فرمایا ہاں وہ حدیث جو فلاں موقع پر آپ نے مجھ سے بیان کی تھی۔ امام اعمش نے کہا "یعقوب یہ حدیث مجھ کو اُس وقت

[1] یہ اقوال علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کئے ہیں۔

[2] قاضی صاحب کی نسبت کتب رجال میں جرحیں بھی منقول ہیں مگر وہ عموماً ناقابل اعتبار ہیں کیونکہ یا تو وہ مبہم جرحیں ہیں یا اُنکا منشا اجتہادی مسائل کا اختلاف ہے ۱۲

سے یاد ہے جب تمہارے والدین کا عقد بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن اُس کا صحیح مطلب آج ہی سمجھ میں آیا۔[1]

قاضی صاحب پہلے شخص ہیں جس نے فقہ حنفی میں تصنیفیں کیں مختلف علوم میں اُن کی تصنیفات بہت ہیں اور ابن الندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں اُن کی مفصل فہرست بھی نقل کی ہے لیکن ہماری نگاہ سے صرف کتاب الخراج گذری ہے۔ اسی لئے ہم اُس کے متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ ہرون الرشید نے خراج وجزیہ وغیرہ کے متعلق قاضی صاحب سے یادداشتیں طلب کی تھیں۔ قاضی صاحب نے اُس کے جواب میں چند تحریریں بھیجیں۔ یہ کتاب اُنہیں تحریروں کا مجموعہ ہے[2] اگرچہ اس میں بہت سے مضامین ہیں لیکن زیادہ تر خراج کے مسائل ہیں۔ اور اسی لئے اُسکو اس زمانہ کا قانون مالگزاری کہہ سکتے ہیں۔ اس کتاب میں زمین کے اقسام بلحاظ حیثیت اور بلحاظ تنوع لگان کی مختلف شرحیں کاشتکاروں کی حیثیتوں کا اختلاف پیداوار کی قسمیں اس قسم کے اور مراتب کو اس خوبی اور دقت نظر کے ساتھ منضبط کیا ہے اور اُن کے متعلق قواعد قرار دئے ہیں کہ اُس زمانہ کے لحاظ سے تعجب ہوتا ہے طرز تحریر میں ایک یہ بڑی خوبی ہے کہ نہایت آزادانہ ہے۔ قواعد اور ہدایتوں کے ساتھ جابجا اُن ابتریوں کا ذکر ہے جو انتظامات سلطنت میں موجود تھیں اور اُن پر نہایت بیباکی کے ساتھ خلیفۂ وقت کو متوجہ کیا ہے۔

قاضی صاحب کی تاریخ زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ قابل قدر ہے وہ یہ ہے کہ ہرون الرشید جیسے جبار اور خودپرست بادشاہ کے دربار میں وہ اپنے فرائض اس جرأت اور آزادی سے ادا کرتے تھے جسکی مثال ایشیائی سلطنتوں میں بہت کم ملسکتی ہے کتاب الخراج میں ایک جگہ وہ ہرون الرشید کو لکھتے ہیں کہ "اے امیر المومنین اگر تو اپنی رعایا کے انصاف کے لئے مہینہ میں ایکبار بھی دربار کرتا اور مظلوموں کی فریاد سنتا تو میں اُمید کرتا ہوں کہ تیرا شمار اُن لوگوں میں نہ ہوتا جو رعیت سے پردہ کرتے ہیں۔ اور اگر تو ایک دربار بھی کرتا تو یہ خبر تمام اطراف میں پھیل جاتی اور ظالم اپنے ظلم سے باز آتے۔ بلکہ اگر عمال وصوبہ داروں کو یہ خبر پہنچے کہ تو برس دن میں ایک دفعہ انصاف کے لئے بیٹھتا ہے تو ظالموں کو کبھی ظلم پر جرأت نہ ہونے پائے!!"

قاضی صاحب کے سوا کس کی جرأت تھی کہ ہرون الرشید کو یہ الفاظ لکھتا!

تعجب یہ ہے کہ ایسا آزاد اور پاکیزہ نفس بھی دشمنوں کے حملہ سے نہیں بچا قاضی صاحب

[1] ابن خلکان ترجمہ قاضی ابویوسف ۱۲ [2] یہ کتاب مصر کے مطبع میریہ میں سنہ ۱۳۰۲ھ میں چھاپی گئی ہے ۱۲

مخالفین کی نہ معقول روایتیں۔

گئے مخالفین نے اُن کو خوشامدی اور زمانہ ساز کہا ہے اور اس مضمون کی چند روایتیں بھی گھڑ لی ہیں بعض مورخین جن کو رطب و یابس سے کچھ بحث نہیں ان بیہودہ روایتوں کو نقل بھی کر دیتے ہیں جو کوتاہ بینوں کے لئے "ہوئے بس است" کا کام دیتی ہے۔ اِس قسم کی بعض حکایتیں تاریخ الخلفاء میں منقول ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کتاب الخراج کے فقرے جو ہم نے نقل کئے ہیں۔ جس قطعیت کے ساتھ ثابت ہیں۔ اُن کے مقابلہ میں اِن روایتوں کا کس حد تک اعتبار ہو سکتا ہے۔

غالب اللیل مورخین ایک طرف بعض محدثین نے بھی مخالفت کے جوش میں تحقیق حق کی پروا نہ کی بیہقی نے امام شافعی کے حالات میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہے اُسمیں لکھا ہے کہ "امام شافعی جب ہرون الرشید کے دربار میں گرفتار ہو کر آئے تو قاضی ابویوسف اور امام محمد نے ہرون الرشید کو امام شافعی کے قتل کی رائے دی اور کہا کہ اگر جلد تدارک نہیں کیا جاتا تو یہ شخص سلطنت کو صدمہ پہنچائیگا"!! افسوس ہے امام بیہقی کو باایں‌ہمہ محدثیت یہ بھی خیال نہ آیا کہ قاضی ابویوسف اِس زمانہ سے بہت پہلے انتقال کر چکے تھے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ خود محدثین ہی نے اِس روایت کی تکذیب کی حافظ ابن حجر نے جن سے بڑھکر اُن کے بعد محدث نہیں ہوا امام شافعی کے حالات میں ایک کتاب لکھی ہے[1] جو آج کل مصر میں چھاپی گئی ہے۔ وہ اِس روایت کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔ فھی مکذوبۃ وغالب ما فیھا موضوع وبعضھا ملفق من روایات ملفقۃ واوضح ما فیھا من الکذب قولہ فیھا ان ابایوسف ومحمد بن الحسن حرضا الرشید علی قتل الشافعی یعنے یہ روایت جھوٹی ہے اور اُسکا اکثر حصہ موضوع ہے اور بعض حصے دوسری مختلط روایتوں سے ماخوذ ہیں اور جو صریح جھوٹ اُسمیں ہے وہ یہ ہے کہ ابویوسف و محمد بن الحسن نے ہرون الرشید کو امام شافعی کے قتل کی ترغیب دی۔

اولیت

قاضی صاحب کی طرف بعض اولیات بھی منسوب ہیں۔ مورخ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ "قاضی ابویوسف پہلے شخص ہیں جس نے علماء کے لئے ایک خاص لباس تجویز کیا کہ آج تک برتا جاتا ہے ورنہ اُن سے پہلے تمام لوگوں کا ایک لباس ہوتا تھا"

امام محمد بن الحسن الشیبانی

یہ فقہ حنفی کے دوسرے بازو ہیں۔ اُن کا اصلی وطن دمشق کے متصل ایک گاؤں تھا جسکو

[1] اس کتاب کا نام توالی التاسیس بمعالی ابن ادریس ہے اور ۱۳۰۱ھ میں مطبع میریہ مصر میں طبع ہوئی ہے ۱۲

حرستا کہتے ہیں۔ ان کے والد وطن چھوڑ کر واسط چلے آئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی امام محمد ۱۳۵ھ میں یہیں پیدا ہوئے۔ سن رشد کا آغاز تھا کہ کوفہ جانا ہوا۔ یہاں علوم کی تحصیل شروع کی اور بڑے بڑے فقہاء و محدثین کی صحبت اُٹھائی۔ مسعر بن کدام امام سفیان ثوری۔ مالک بن دینار۔ امام اوزاعی وغیرہ سے حدیثیں روایت کیں۔ کم و بیش دو برس تک امام ابوحنیفہ کی خدمت میں رہے۔ امام صاحب کی وفات کے بعد قاضی ابو یوسف سے بقیہ تحصیل کی۔ پھر مدینہ منورہ گئے۔ اور تین برس تک امام مالک سے حدیث پڑھتے رہے۔ آغاز شباب ہی میں ان کے فضل و کمال کے چرچے پھیل گئے تھے۔ بیس برس کے سن میں مسند درس پر بیٹھے۔ اور لوگوں نے ان سے استفادہ شروع کیا۔ ہرون الرشید نے ان کے فضل و کمال سے واقف ہو کر قضا کی خدمت دی۔ اور اکثر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ۱۸۹ھ میں رے گیا۔ تو ان کو بھی ساتھ لے گیا۔ رے کے قریب رنبویہ ایک گانوں ہے۔ وہاں پہنچ کر قضا کی۔ اتفاق یہ کہ کسائی جو مشہور نحوی گزرا ہے۔ وہ بھی اس سفر میں ساتھ تھا۔ اور اُس نے بھی یہیں انتقال کیا ہرون الرشید کو نہایت صدمہ ہوا۔ اور کہا کہ "آج فقہ اور نحو دونوں کو ہم دفن کر آئے"۔

علامہ یزیدی نے جو ایک مشہور ادیب اور ہرون الرشید کے درباریوں میں تھے نہایت جانگداز مرثیہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے

فقلت اذا ما اشکل الخطبُ مَن لنا ۔ بابصاحہ یوماً وانت فقیدُ

ترجمہ: یعنے ہم نے کہا کہ جب تو نہ رہا تو ہمارے لیے مشکلات کا حل کرنیوالا کہاں سے آئے گا۔

امام محمد نے اگرچہ زندگی کا بڑا حصہ دربار کے تعلق سے بسر کیا۔ لیکن آزادی اور حق گوئی کا سر رشتہ کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ ۱۷۵ھ میں یحیٰی علوی نے جب علم بغاوت بلند کیا تو ہرون الرشید اُن کا سروسامان دیکھکر حواس باختہ ہوگیا۔ اور بکر صلح اختیار کی معاہدہ صلح قلمبند ہوا۔ اور یحیٰی کے اطمینان کے لئے بڑے بڑے علماء فضلاء فقہاء اور محدثین نے اُس پر دستخط کئے۔ یحیٰی صلح پر راضی ہو کر بغداد میں آئے۔ تو چند روز کے بعد ہرون الرشید نے نقض عہد کرنا چاہا۔ تمام علماء نے ہرون الرشید کے خوف سے فتوے دے دیا کہ صورت موجودہ میں نقض عہد جائز ہے۔ لیکن امام محمدؒ نے علانیہ مخالفت کی اور اخیر تک اپنے اصرار پر قائم رہے۔

امام محمد جس رتبہ کے شخص تھے اُس کا اندازہ۔ ائمہ مجتہدین کے اقوال سے ہوسکتا ہے۔ امام شافعی کا قول ہے۔ کہ "امام محمد جب کوئی مسئلہ بیان کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وحی اُتر رہی ہے" انہیں کا قول ہے" کہ میں نے امام محمد سے ایک بار شتر کی برابر علم حاصل کیا" امام احمد حنبل سے کسی نے پوچھا کہ یہ دقیق مسائل کہاں سے حاصل ہوئے فرمایا محمد بن الحسن کی کتابوں سے۔[1]

امام محمد کی حلقۂ درس سے اگرچہ اور بہت سے نامور علماء تعلیم پاکر نکلے۔ لیکن اُن سب میں امام شافعی کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ ہمارے زمانہ کے کم نظروں کو اس سے تعجب ہوگا۔ اگلے زمانہ بھی ابن تیمیہ نے امام شافعی کی شاگردی سے انکار کیا تھا۔ لیکن حق کو کون دبا سکتا ہے۔ تاریخ و رجال کی آج سینکڑوں کتابیں موجود ہیں۔ وہ کیا شہادت دے رہی ہیں۔ بے شبہہ امام شافعی کو امام محمد کی فیض صحبت نے بڑے بڑے کمالات کے رتبے دکھائے اور اُس کا خود اُن کو اعتراف تھا۔ حافظ ابن حجر امام شافعی کا قول نقل کرتے ہیں۔ کان محمد بن الحسن جید المنزلة عند الخلیفة فاختلفت الیه وقلت هو اولی من جهة الفقه فلزمته وکتبت عنه[2] یعنی محمد بن الحسن خلیفہ کے ہاں بہت معزز تھے۔ اسی لئے میں اُن کے پاس آتا جاتا تھا۔ میں نے اپنے جی میں کہا کہ وہ فقہ کے لحاظ سے بھی عالی رتبہ ہیں۔ اسی لئے میں نے اُن کی صحبت لازم پکڑی اور اُن کا درس قلمبند کرتا تھا۔

امام محمد خود بھی امام شافعی کی نہایت عزت کرتے تھے۔ اور تمام شاگردوں کی نسبت اُن کے ساتھ خاص مراعات کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ایک دن ہرون الرشید کے دربار میں جا رہے تھے۔ راہ میں امام شافعی ملے۔ جو اُن کی ملاقات کو آرہے تھے۔ اسی وقت گھوڑے سے اُتر پڑے۔ اور نوکر سے کہا کہ خلیفہ کے پاس جا اور عذر بیان کر کہ میں اسی وقت حاضر نہیں ہوسکتا۔ امام شافعی نے کہا" میں اور کسی وقت حاضر ہونگا۔ آپ دربار میں تشریف لیجائیں امام محمد نے کہا" نہیں وہاں جانا کچھ ضرور نہیں تھا[3]" امام محمد و امام شافعی میں۔ اکثر مناظرات بھی رہتے تھے۔ اور اسی بنا پر بعضوں کو اُن کی شاگردی سے انکار ہے۔ لیکن اس زمانہ کی اُستادی و شاگردی میں۔ یہ امور معیوب نہ تھے اور در اصل آج بھی معیوب نہیں

۱؎ یہ تمام اقوال محدث نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں نقل کئے ہیں۔ ۱۲

۲؎ دیکھو توالی التاسیس مطبوعہ مصر صفحہ ۷۹۔ ۱۲

۳؎ توالی التاسیس صفحہ ۷۹۔ ۱۲

امام محمد کی شہرت اگرچہ زیادہ تر فقہ میں ہے۔ اور اُن کی تصنیفات عموماً اسی فن کے متعلق پائی جاتی ہیں۔ لیکن وہ تفسیر، حدیث، ادب میں بھی اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔ امام شافعی کا قول ہے کہ میں نے قرآن مجید کا عالم امام محمد سے بڑھکر نہیں دیکھا۔ ادب و عربیت میں اگرچہ اُن کی کوئی تصنیف موجود نہیں۔ لیکن فقہ کے جو مسائل نحو کے جزئیات پر مبنی ہیں۔ اکثر جامع کبیر میں مذکور ہیں۔ اور اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فن میں اُن کا کیا پایہ تھا۔ چنانچہ ابن خلکان وغیرہ نے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔

حدیث میں اُن کی کتاب موطا مشہور ہے۔ اس کے علاوہ کتاب الحجج جو امام مالک کی رد میں لکھی ہے۔ اس میں اکثر حدیثیں روایت کی ہیں۔ اور متعدد مسائل میں جوش ادعا کے ساتھ کہا ہے کہ مدینہ والوں کو دعوے ہے۔ کہ وہ حدیث کے پیرو ہیں۔ حالانکہ ان مسائل میں صریح اُنکے خلاف حدیث موجود ہے۔

امام محمد کی تصنیفات۔ تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور آج فقہ حنفی کا مدار انہی کتابوں پر ہے ہم ذیل میں اُن کتابوں کی فہرست لکھتے ہیں۔ جن میں امام ابو حنیفہ کے مسائل روایتاً مذکور ہیں۔ اور اسی لئے وہ فقہ حنفی کے اصلی اصول خیال کیئے جاتے ہیں۔

مبسوط۔ اصل میں یہ کتاب قاضی ابو یوسف کی تصنیف ہے۔ انہیں مسائل کو امام محمد نے زیادہ توضیح اور خوبی سے لکھا۔ یہ امام محمد کی پہلی تصنیف ہے۔

جامع صغیر۔ مبسوط کے بعد تصنیف ہوئی۔ اس کتاب میں امام محمد نے قاضی ابو یوسف کی روایت سے امام ابو حنیفہ کے تمام اقوال لکھے ہیں۔ کل ۱۵۳۲ مسئلے ہیں۔ جن میں سے ۱۷۰ مسئلوں میں اختلاف رائے بھی لکھا ہے۔ اس کتاب میں تین قسم کے مسائل ہیں

(۱) جن کا ذکر بجز اس کتاب کے اور کہیں نہیں پایا جاتا۔

(۲) اور کتابوں میں بھی مذکور ہیں۔ لیکن اُن کتابوں میں امام محمد نے تصریح نہیں کی تھی۔ کہ یہ خاص ابو حنیفہ کے مسائل ہیں۔ اس کتاب میں تصریح کردی ہے۔

(۳) اور کتابوں میں مذکور تھے۔ لیکن اس کتاب میں جن الفاظ سے لکھا ہے۔ اُن سے بعض نئے فائدے مستنبط ہوتے ہیں۔ اس کتاب کی تیس چالیس شرحیں لکھی گئیں جن کے نام اور مختصر حالات کشف الظنون وغیرہ پر موجود ہیں۔

جامع کبیر۔ جامع صغیر کے بعد لکھی ہوئی تمام کتاب ہے۔ اسمیں۔ امام ابو حنیفہ کے اقوال کے ساتھ۔ قاضی ابو یوسف اور امام زفر کے اقوال بھی لکھے ہیں۔ ہر مسئلہ کے ساتھ دلیل لکھی ہے

سلہ الجواہر المضیہ ترجمہ امام محمد ۱۲

متاخرین حنفیہ نے۔ اصول فقہ کے جو مسائل قائم کئے ہیں زیادہ تر اسی کتاب کی طرز استدلال وطریق استنباط سے کئے ہیں۔ بڑے بڑے نامور فقہا نے اس کی شرحیں لکھیں۔ جن میں سے ۲۷ شرحوں کا ذکر کشف الظنون میں ہے۔

زیادات۔ جامع کبیر کی تصنیف کے بعد جو فروع یاد آئے وہ اس میں درج کئے۔ اسی لئے زیادات نام رکھا۔

کتاب الحجج۔ امام محمد۔ امام ابو حنیفہ کی وفات کے بعد مدینہ منورہ گئے۔ اور تین برس وہاں رہکر۔ امام مالک سے موطا پڑھی۔ اہل مدینہ کا طریقہ فقہ جدا تھا۔ بہت سے مسائل میں وہ لوگ امام ابو حنیفہ سے اختلاف رکھتے تھے۔ امام محمد نے مدینہ سے آکر یہ کتاب لکھی۔ اس میں اول وہ ابو حنیفہ کا قول نقل کرتے ہیں پھر مدینہ والوں کا اختلاف بیان کرکے حدیث۔ آثر۔ قیاس سے ثابت کرتے ہیں۔ کہ امام ابو حنیفہ کا مذہب صحیح ہے اور دوسروں کا غلط۔ امام رازی نے مناقب الشافعی میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب چھپ گئی ہے۔ اور ہر جگہ ملتی ہے۔ میں نے اُسکا ایک قلمی نسخہ بھی دیکھا ہے۔

سیر صغیر و کبیر۔ یہ سب سے اخیر تصنیف ہے۔ اول سیر صغیر لکھی۔ اُسکا ایک نسخہ امام اوزاعی کی نظر سے گذرا۔ انہوں نے طعن سے کہا کہ اہل عراق کو فن سیر سے کیا نسبت! امام محمد نے سنا۔ تو سیر کبیر لکھنی شروع کی۔ طیار ہو چکی تو ساٹھ جزوں میں آئی۔ امام محمد اس ضخیم کتاب کو ایک خچر پر رکھوا کر ہرون الرشید کے پاس لے گئے۔ ہرون الرشید کو پہلے سے خبر ہو چکی تھی۔ اُس نے قدر دانی کے لحاظ سے شہزادوں کو بھیجا۔ کہ خود جا کر امام محمد سے اسکی سند لیں۔

ان کتابوں کے علاوہ۔ امام محمد کی اور تصنیفیں بھی فقہ میں موجود ہیں۔ مثلاً کیسانیات جرجانیات۔ رقیات۔ ہرونیات۔ لیکن یہ کتابیں فقہا کی اصلاح میں ظاہر الروایۃ میں داخل نہیں۔ بلکہ کتاب الحجج جس کا ذکر اوپر ہو چکا وہ بھی اس سلسلہ سے خارج ہے۔

امام زفرؒ

فقہ میں اگرچہ ان کا رتبہ امام محمد سے زیادہ مانا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ ان کی کوئی تصنیف موجود نہیں ہے۔ اور اُن کے حالات بھی بہت کم معلوم ہیں۔ اسی لئے صاحبین سے ان کو موخر رکھنا پڑا۔

یہ عربی النسل تھے۔ شروع زمانہ میں ان کو حدیث کا توغل رہا۔ اور اسی وجہ سے جیسا کہ علامہ انووی نے تہذیب اللغات میں تصریح کی ہے۔ صاحب الحدیث کہلاتے تھے۔ پھر فقہ کی طرف توجہ کی اور اخیر عمر تک یہی شغلہ رہا۔

یحیٰی بن معین جو فن جرح و تعدیل کے امام ہیں۔ اُن کا قول ہے کہ

[1] بعض لوگوں نے ان کی تصنیف بھی کی ہے۔ لیکن وہ مبہم ہے۔ اور قابل اعتنا نہیں ؂

ان کو خاص کر قیاسی احکام میں نہایت کمال تھا۔ امام ابوحنیفہ ان کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ اقیس اصحابی وکیع بن الجراح۔ جن کا ذکر اوپر گزر چکا ان سے استفادہ کرتے تھے قضا کا عہدہ بھی انکو ملا تھا۔ سنہ ۱۱۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اور سنہ ۱۵۸ھ میں وفات کی

قاسم بن معن

بہت بڑے نامور شخص تھے۔ صحاح ستہ کے مصنفین نے ان سے روایت کی ہے اگرچہ ان کو حدیث، فقہ میں بھی کمال تھا۔ لیکن عربیت و ادب میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے امام محمد ان کی خدمت میں استفادہ کی غرض سے حاضر ہوتے تھے۔ خلیفہ نے ان کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا۔ مجبوراً قبول کرنا پڑا۔ لیکن تنخواہ کبھی نہیں لی ؂

امام ابوحنیفہ کو ان سے خاص محبت تھی۔ یہ بھی منجملہ اُن لوگوں کے ہیں۔ جن کی نسبت امام صاحب فرمایا کرتے تھے کہ "تم لوگ میرے دل کی تسلی اور میرے غم کے مٹانے والے ہو" اُن کو بھی امام صاحب کے ساتھ نہایت خلوص تھا۔ ایک شخص نے پوچھا کہ آپ فقہ و عربیت دونوں کے امام ہیں۔ ان دونوں علموں میں سے وسیع کون علم ہے؟ فرمایا کہ "واللہ امام ابوحنیفہ کی ایک تحریر کل فن عربیت پر بھاری ہے" سنہ ۱۷۵ھ میں وفات کی۔

اسد بن عمرو

یہ پہلے شخص ہیں جن کو امام ابوحنیفہ کی مجلس تصنیف میں۔ تحریر کا کام سپرد ہوا۔ بہت بڑے رتبہ کے شخص تھے۔ امام احمد بن حنبل نے ان سے روایت کی ہے اور یحیٰی بن معین نے ان کو

[1] تہذیب اللغات والاسماء۔ علامہ نووی ۱۲

ثقہ کہا ہے ہلال رازی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ ہارون الرشید مکہ معظمہ گیا۔ طواف سے فارغ ہو کر کعبہ میں داخل ہوا اور ایک جگہ بیٹھ گیا۔ تمام اہل دربار اور اعیان ہاشم کھڑے تھے۔ مگر ایک شخص ہارون الرشید کی برابر بیٹھا۔ مجھ کو نہایت تعجب ہوا لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اسد بن عمرو ہیں۔[۱]

علی بن المسہر

فن حدیث امام اعمش و ہشام بن عروہ سے حاصل کیا تھا۔ امام بخاری و مسلم نے انکی روایت سے حدیثیں نقل کی ہیں۔ امام احمد بن حنبل انکے فضل و کمال کا اعتراف کرتے تھے امام سفیان ثوری نے امام ابوحنیفہ کی تصنیفات پر جو اطلاع حاصل کی انہیں کے ذریعہ سے کی۔ موصل کے قاضی تھے۔ ۱۸۹ھ میں انتقال کیا۔[۲]

عافیہ بن یزید

یہ وہی بزرگ ہیں جن کی نسبت امام ابوحنیفہ مجلس تصنیف میں فرمایا کرتے تھے کہ جب تک عافیہ نہ آ چکیں کسی مسئلہ کو قلمبند نہ کرو۔ علامہ ذہبی نے ان کی نسبت لکھا ہے۔ کہ کان من خیار القضاۃ۔

حبان

کثیر الروایۃ تھے۔ ابن ماجہ میں انکی روایت سے متعدد حدیثیں موجود ہیں۔ امام ابوحنیفہ انکی قوت حفظ کے بہت مداح تھے۔ ۱۷۲ھ میں وفات کی۔[۲]

مندل

حبان کے بھائی تھے۔ امام اعمش و ہشام بن عروہ و عبد الملک بن عمیر و عاصم

---

[۱] الجواہر المضیئہ [۲] یہ حالات مجھکو صرف الجواہر المضیئۃ سے معلوم ہوئے ۱۲

احوال و امام ابوحنیفہ سے حدیثیں روایت کیں۔ نہایت متورع اور پرہیزگار تھے
سنہ ۱۶۸ھ میں انتقال کیا۔ ان کے بھائی حبان نے نہایت باثر مرثیہ لکھا ہے۔ علامہ ذہبی
نے میزان الاعتدال میں اس کے چند اشعار نقل کئے ہیں۔ دو شعر یہ ہیں:

فإذا ذكرت فقدان أخي	انقلبت في فراشي أرقا
وأخٍ أيِّ أخٍ مثل أخي	قد جرى في كل خير سبقا

بالخیر

افسانۂ یاران کہن خواندم و بگذشتم	دریاب کہ لعل و گہر افشاندم و رفتم

۱۵ دسمبر ۱۸۹۳ء
مقام علی گڈھ
شبلی نعمانی

…زہ خواتین تیموریہ جنمین
…کے نامور و مشہور خاندان تیموریہ
…پاک دامن اور عفت مآب مستورات
…کے علاوہ بہت سی اُن
…کی درویشون اور شریف
…کے نادر دلچسپ و ندرت
…واقعات اور حیرت انگیز
…بسط و شرح کے ساتھ
…اور ترتیب حروف تہجی اُردو
…طرز اور مرغوب پیرایہ مین
…گئے ہین جو اس عظیم الشان
…اُن کے سلسلہ سے تعلق
…رکھتے ہین - عہ

دولت درانیہ

…احمد شاہ درانی والی افغانستان
…حالات زندگی - آغاز سلطنت
…ہندوستان پر متواتر حملے - سکھون
…کی مشہور معرکہ آرائیان
…ہندوستان کے فتوحالات وغیرہ وغیرہ
…بسط و توضیح کے ساتھ کر کے
…کے نامور فرزند تیمور شاہ اور زمان شاہ
…زمان شاہ کی عہد سلطنت کے
…واقعات نہایت دلچسپی او…گی

کے ساتھ بیان کیے گئے ہین اور
ساتھ ہی ان پرزور بغاوتون اور ہنگامی
خانہ جنگیون کا بھی ذکر ہے جو اُن
تینون نامور حکمرانون کے عہد حکومت
مین پھیلین اور فرو ہوئین -
غرضکہ ۱۱۶۰ھ ہجری سے ۱۲۱۳ھ
ہجری تک کے تمام واقعات درج ہین عہ

مثنوی نشتر غم

یعنے سید حسن شاہ اور خانم جان کا
وہ دردناک اور سچا اور تاریخی قصہ
جو نشتر ناول سے جسکو گلزار نسیم کی
بحر مین نہایت ہی معنی خیز اختصار
کے پیرایہ مین طرز جدید نظم کیا گیا
ہے - قیمت صرف ۸/

حیات ولی

حیات ولی ایک جدید اور قابل قدر
کتاب ہے جس مین عارف باللہ
حضرت شاہ ولی اللہ اور انکے
محترم خاندان کی سوانح عمری دلچسپ
اور مفصل حال اور بابرکت - اور
عالی خاندان کی سچی تاریخ ہے
جو نہایت مستند تذکرون اور معتبر
ذریعون سے منتخب کی گئی ہے -

شاہ ولی اللہ صاحب اور اُن کے
خاندان کے متعلق تقریباً دو سو
حضرات کے واقعات اور اُن کے
سچے اور تاریخی مستند اور دلچسپ
حالات اور اُن کے چارون
چمکتے ستارون یعنے مولانا شاہ
عبد العزیز صاحب - مولانا شاہ
رفیع الدین صاحب - مولانا شاہ
عبد القادر صاحب - مولانا شاہ
عبد الغنی صاحب مفصل و مکمل سوانحات
اس کتاب کا مطالعہ کچھ ایسا
پر وہ عظمت اور شان ہے گویا پڑھنے
والا خود ان بزرگون کے تبرک
حلقے مین داخل ہو جاتا ہے اسپر
مزید یہ کہ جابجا مفید نوٹ دیے
ہین اور بلحاظ ضخامت بالیقین ہے
بہت کم دام ہیں فی جلد قیمت
صرف دو روپیہ ۲/

قرآن شریف مترجم

متوسط درجہ کا یہ قرآن شریف
بہت خوشخط اور نہایت جانفشانی
اور محنت سے طیار کیا گیا ہے قیمت
صرف ۱۲/

اخبار قومی رفیق

ایک نہایت عجیب و غریب اور بے انتہا دلچسپ قابل قدر پندرہ روزہ اخبار
جسمین لایق فایق جادو نگارون اور معرکہ انشاپردازی کے شہسوارونکی پرجوش
اور پُر لطف اور قیمتی مورخانہ و اخلاقی مضامین ہمیشہ درج ہوا کرتی ہین ہر نمبر مین
شاہان اسلام کے کارنامے اور پُر فخر واقعات با معتبر طبقہ کے اکابر و اسلاف کے
معنی خیز حالات کے علاوہ تذکرہ خواتین ہند کے دو جزو ۲۰×۲۶ کاغذ کے پیمانے پر ہر نمبر کے
ساتھہ سلسلہ وار شایع ہوا کرتے ہین جو بالکل ایک نئی اور تازہ ترین تصنیف
کتاب ہے۔ اور جسمین اوّل تاجدار ہند بابر بادشاہ سے لیکر آخر فرمانروایان ہند
تک تمام مشہور اور نامور بیگمات کے تفصیلوار حالات۔ اُردو انشا پردازی کے
خاص شان اور نہایت دلگیر عبارت مین لکھے گئے ہین اور نیز اسمین پردہ کے
مخالفونکو دندان شکن جواب دیئے جاتے ہین ۲۰×۲۶ پورے تین جزو جنوری ۱۹۰۲ء
سے جاری ہے۔ ہمارے قدیم و جدید معاون اس کی سرپرستی فرماکر بہت جلد
درخواستین بھیجین اور وی۔ پی کی اجازت دین قیمت سالانہ پیشگی مع محصول ۱ روپیہ

المشتہر

سید ظہور الحسن موسوی مالک کارخانہ احسن التجارت دہلی کٹرہ نظام الملک زیر جامع مسجد